مضامینِ عابدؔ

کتابی دنیا لمیٹڈ دہلی

بار اوّل ۲۰۰۰ مئی سنہ ۱۹۴۷ء

قیمت للعہ ر

لطیفی پریس دہلی

فہرست

حِصّہ اوّل
(تذکرہ و تبصرہ)

حصّہ دوم

(طنز و مزاح)

حصہ اوّل

(تذکرہ و تبصرہ)

اقبال کا تصورِ خودی

اگر آپ کسی سے پوچھیں کہ اقبال کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت کیا ہے تو وہ یہی کہے گا کہ اُن کی شاعری فلسفیانہ شاعری ہے۔ یہ سن کر شاید آپ کے ذہن میں الجھن پیدا ہو کر بھلا فلسفہ شعر کیونکر ہو سکتا ہے، فلسفہ تو حقیقت کی خشک اور بے جان تعبیر ہے اور شعر اس کی زندگی سے چھلکتی ہوئی تفسیر۔ فلسفی صورتِ کائنات کا ذہنی ادراک کرتا ہے اور اپنے ادراکات کو مجرد تصورات میں بیان کرتا ہے جو ہماری لوحِ فکر پر درج ہو کر رہ جاتے ہیں۔ بہ خلاف اس کے شاعر نبضِ کائنات کی تڑپ، قلبِ حیات کی دھڑکن کو محسوس کرتا ہے اپنے احساسات کو متحرک نقش اور نغمے میں ادا کرتا ہے جو ہمارے دل میں اتر کر خون کے ساتھ گردش کرنے لگتا ہے۔

حق اگر سوزے نہ دارد حکمت است
شعر می گردد چو سوز از دل گرفت

کیا اقبال کے شعر کو فلسفیانہ شعر کہنے کے یہ معنی ہیں کہ وہ حکمت کے

نظریات کی طرح سوز و درد، زندگی اور حرکت سے خالی ہے؟

جسے اقبال کے کلام سے ذرا سا بھی مس ہے وہ جانتا ہے کہ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں۔ اقبال کی شاعری تو آبِ حیات کا خزانہ ہے۔ جس سے زندگی اور زندہ دلی کے چشمے ابلتے ہیں جن سے سیراب ہو کر مایوس دلوں کی خشک اور بنجر زمین میں جان پڑ جاتی ہے اور امید کی کھیتی لہلہانے لگتی ہے۔

بات یہ ہے کہ جب شعر کے لئے فلسفے کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو فلسفے کی صرف ایک ہی صنعت مدنظر ہوتی ہے یعنی موضوع کی کیفیت اور ہمہ گیری۔ اقبال کا کلام فلسفیانہ اسی معنی میں ہے کہ وہ ایک کلی تصورِ حیات پیش کرتا ہے اس کا موضوع فرد اور ملت کی زندگی کا ایک جامع نصب العین ہے جسے ہم فلسفۂ تمدن کہہ سکتے ہیں۔ ورنہ اگر طرزِ ادا کو دیکھئے تو وہ اسی سوز و گداز، رنگ و آہنگ سے لبریز ہے جو ایشیائی شاعری کی جان ہے۔

یہاں ایک غلط فہمی کو دور کرنا ضروری ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ اقبال کا خطاب انسانوں کی صرف ایک جماعت یعنی مسلمانوں سے ہے، کل نوعِ انسانی سے نہیں۔ ان کے پیشِ نظر ملت کا نصب العین ہے جو انسانیت کے مقابلے میں بہت تنگ اور محدود ہے۔ اس سے زیادہ وسیع مشرب تو ہندوستان اور ایران کے غزل گو شاعر کا ہے جو عام انسانی زندگی کے جذبات و کیفیات کے مصور ہیں۔ مگر ذرا غور سے دیکھئے تو محض جذبات کیفیات کی

منصوری اور چیز ہے اور زندگی کے ایک مکمل تصور کی تعبیر اور چیز ہے۔ جذبات کل انسانوں میں یکساں ہیں لیکن نصب العین حیات کی تشکیل میں اختلاف پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ ایک عالمگیر انسانی تمدن کا خیال ہر زمانے میں بعض لوگوں کے پیش نظر رہا ہے اور اب بھی ہے۔ لیکن محض مجرد تصور یعنی فلسفے کی شکل میں اس تصور کو کسی ایک شخص کے قلب سے بھی وہ زندہ تعلق پیدا نہیں ہوا جو اسے موضوع شعر بنانے کے لئے ضروری ہے۔ اب تک ہر شاعر اس پر مجبور ہے کہ انسانیت کا عکس کسی خاص ملّت یا قوم کے آئینے میں دیکھے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قوم اور ملّت کے تصورات میں کون زیادہ وسیع ہے۔ اگر آپ قوم سے اہل مغرب کی اصطلاح میں وہ جماعت مراد لیں جس میں قدر مشترک محض نسل اور وطن ہے اور ملّت اقبال کے محاورے میں اس گروہ کو کہیں جس کے لئے ایک روحانی اور اخلاقی نصب العین رشتۂ اتحاد کا کام دیتا ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ ملّت کے تصور کا وسیع تر اور انسانیت سے قریب تر ہونا ممکن ہے۔ اس لئے کہ نسل و وطن کا فرق دنیا میں ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اور اگر اس پر زیادہ زور دیا جائے تو نوعِ انسانی میں اتحاد پیدا ہونا محال ہے۔ لیکن ایک اخلاقی اور روحانی نصب العین کا کل انسانوں کو ایک مرکز پر جمع کر کے متحد کر دینا کم سے کم خیال میں آسکتا ہے۔ دیکھنا اصل میں یہ ہے کہ جو نصب العین اقبال کے ذہن میں ہے وہ کیا ہے اور کیسا ہے۔ محض یہ بات کہ وہ ملّت کے تصور

سے وابستہ ہے اُسے تنگ اور محدود کرنے کے لیئے کافی نہیں۔

اقبال کی شاعری اور ان کے نصب العین زندگی کو سمجھنے کے لیئے یہ ضروری ہے کہ ہم اس نقش کو اس کے تاریخی پس منظر کے ساتھ دیکھیں۔ جب افق ہند سے وہ ہلالِ نو نمودار ہوا جو ایک دن فلکِ شعر پر ماہِ کامل بن کر چمکنے والا تھا۔ اس وقت عموماً مشرق اور خصوصاً عالمِ اسلام پر حزن و یاس کی تاریکی چھائی ہوئی تھی سب سے بدتر حالت ہندوستان کے مسلمانوں کی تھی۔ جہل اور غلامی کی بدولت ان کے دلوں میں زندگی کی آگ سرد پڑ چکی تھی۔ اور جدھر آنکھ اٹھا کر دیکھیئے راکھ کے ڈھیروں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ مغربی فاتحوں کی ہیبت، مغربی تمدن کی صولت مسلمانانِ ہند کے قلب و دماغ پر مستولی تھی۔ وہ اس بے پناہ قوت سے ڈر کر بھاگنا چاہتے تھے۔ مگر یہ مقناطیس کی طرح انہیں اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ اس زمانے میں ایک باہمت، خوددار اور مدبّر مسلمان سید احمد خاں نے جسے یقین تھا کہ ملّت اسلامی کی سطحی کمزوری کی تہ میں فولاد کی قوت پنہاں ہے، مسلمانوں کو اس پر ابھارا کہ وہ بے تکلف اپنی زندگی کو مغربی تمدن سے رگڑ کھانے دیں۔ اس رگڑ سے ابتدا میں انھیں سخت صدمہ پہنچا، مگر اسی سے وہ چنگاریاں بھی نکلیں جنھوں نے ان کے دلوں میں غیرت و حمیت کی آگ بھڑکا دی۔

تدبیر و سیاست کو چھوڑ کر صرف شعر کے میدان کو دیکھیئے تو آپ کو دو ممتاز

صورتیں نظر آئیں گی۔ جنھوں نے مسلمانوں کے مرعوبی اور مایوسی کے طلسم کو توڑا اور ان میں خودداری اور خود اعتمادی پیدا کرنے کی کوشش کی، ایک 'حالی' جس نے سوز و درد کے لہجے میں ملتِ اسلامی کو اس کے عروج و زوال کی داستان سنا کر گذشتہ عظمت و اقبال کی یاد تازہ کر دی اور موجودہ پستی و نکبت پر غیرت دلائی۔ دوسرے 'اکبر' جس نے ظرافت کے پیرائے میں مسلمانوں کو غیروں کی ذہنی غلامی کی ذلت سے آگاہ کیا۔ اور ان کی نظر میں اپنے مذہب و تمدن کا احترام دوبارہ قائم کر دیا۔ 'حالی' جدت پسند تھے۔ قدیم تہذیب کی خرابیوں پر سختی سے نکتہ چینی کرتے تھے اور جدید تہذیب کی خوبیوں کو اختیار کرنے کی تعلیم دیتے تھے۔ 'اکبر' قدامت پسند تھے۔ نئی روشنی کی ہر چیز پر ہنستے تھے اور پرانی روشنی کی ہر چیز کو سراہتے تھے۔ مگر دونوں نے مسلمانوں میں عزتِ قومی کے جذبے کو ابھارا۔ اپنی مدد آپ کرنے کا حوصلہ دلایا اور یاس کی تاریکی میں امید کی ایک جھلک دکھائی۔

لیکن ان دونوں کی نظر بات کی تہ تک نہیں پہنچی۔ انھوں نے بیمار قوم کا مرض تو تشخیص کر لیا لیکن اس مرض کا سبب نہیں پہچان سکے۔ 'اکبر' نے مسلمانوں کے تنزل کا باعث یہ قرار دیا کہ وہ اپنے مرکز یعنی مذہب سے منحرف ہو گئے اور 'حالی' نے یہ کہا کہ وہ اجتہاد فکر اور وسعت نظر چھوڑ کر تقلید پرست اور تنگ خیال بن گئے۔ مگر دونوں میں سے کسی نے یہ نہ بتایا کہ آخر ان کے مرکز سے منحرف ہونے یا تقلید و تعصب اختیار کر لینے کی وجہ کیا تھی۔ اس وجہ کے معلوم کرنے کے لئے اقبال کی

فلسفیانہ نگاہ کی ضرورت تھی۔ شاید مورخ یہ کہے کہ دولت اور حکومت نے مسلمانوں کو کاہل اور عیش پرست بنا دیا اور اسی کاہلی اور عیش پرستی نے انہیں رفتہ رفتہ فعالیت اور حرکت سے محروم کر کے انفعالیت اور جمود میں مبتلا کر دیا لیکن اقبال جن کی نظر تاریخ کے ساتھ ساتھ فلسفۂ تمدن اور فلسفۂ نفس پر بھی عبور رکھتی تھی، اس توجیہ کو کافی نہیں سمجھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ایک اولوالعزم قوم میں، جس نے اپنی عظمت و سطوت کا سکہ دنیا پر بٹھا دیا ہو، جسمانی تعیش اور کاہلی کی لہر جب تک اس کے اندر روحانی تعیش اور کاہلی کا زہر نہ بھرا ہو، ہرگز اس حد تک نہیں پہنچ سکتی کہ اس کے قوائے ذہنی اور عملی کو ماؤف کر دے۔ یہ روحانی تعیش اور کاہلی اقبال کے نزدیک وحدت وجود کے عقیدے پر مبنی ہے جو مسلمانوں میں غیر اسلامی اثرات سے پیدا ہوا اور جس نے انفرادی نفس کے وجود کو باطل قرار دے کر ان کے دلوں سے فرد کی اخلاقی ذمہ داری کے احساس کو مٹا دیا اور اس طرح مذہب و اخلاق کی جڑ کو کھوکھلا کر دیا اور سعی و عمل کے ذوق کو فنا کر دیا۔ اس جمال کی تفصیل خود اقبال کی زبان سے سنئے:-

"مسئلۂ انا کی تحقیق و تدقیق میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی ذہنی تاریخ میں ایک عجیب مماثلت ہے۔ اور وہ یہ کہ جس نکتۂ خیال سے سری شنکر نے گیتا کی تفسیر کی، اسی نکتۂ خیال سے شیخ محی الدین عربی اندلسی نے قرآن شریف کی

تفسیر کی جس نے مسلمانوں کے دل و دماغ پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ شیخ اکبر کے علم و فضل اور ان کی زبردست شخصیت نے مسئلہ وحدت الوجود کو جس کے وہ ان تھک مفسر تھے اسلامی تخیل کا ایک لاینفک عنصر بنا دیا۔ اوحدالدین کرمانی اور فخرالدین عراقی ان کی تعلیم سے نہایت متاثر ہوئے۔ اور رفتہ رفتہ چودھویں صدی کے تمام عجمی شعراء اس رنگ میں رنگین ہو گئے۔ ایرانیوں کی نازک مزاج اور لطیف الطبع قوم اس طویل دماغی مشقت کی کہاں متحمل ہو سکتی تھی جو جزو سے کل تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے۔ انھوں نے جزو و کل کا دشوار گذار درمیانی فاصلہ تخیل کی مدد سے طے کر کے "رگِ چراغ" میں "خونِ آفتاب" اور "شرارِ سنگ" میں "جلوہ طور" کا مشاہدہ کیا۔"

"مختصر یہ کہ ہندو حکماء نے مسئلہ وحدت الوجود کے اثبات میں دماغ کو اپنا مخاطب کیا، مگر ایرانی شعراء نے اس مسئلے کی تفسیر میں زیادہ خطرناک طریق اختیار کیا یعنی انھوں نے دل کو اپنا آماجگاہ بنایا اور ان کی حسین و جمیل نکتہ آفرینیوں کا آخر کار یہ نتیجہ ہوا کہ اس مسئلے نے عوام تک پہنچ کر تمام اسلامی قوم کو ذوقِ عمل سے محروم کر دیا۔"

وحدت وجود کا مسئلہ جس کی طرف مندرجہ بالا عبارت میں اشارہ کیا گیا ہے، یہ ہے کہ وجود حقیقی صرف خالق کائنات کی ذات کا ہے۔ مخلوق جس میں عالمِ طبیعی

اور انسان سبھی داخل ہیں، محض اعتباری اور موہوم وجود رکھتے ہیں اور اسی ایک نورِ ایزدی کے پرتو ہیں۔ ہم نے اپنی کوتاہ بینی سے ان اصنامِ خیالی کو حقیقی سمجھ لیا ہے اور تعینات کے ان پردوں نے ہمیں معرفتِ ذات سے محروم کر دیا ہے۔

کثرت آرائی وحدت ہے پرستاری وہم
کر دیا کافر ان اصنامِ خیالی نے مجھے

اصل میں یہ احساسِ وحدت ایک کیفیت ہے جو قلب حال پر ایک خاص وقت میں آناً فاناً گذر جاتی ہے مگر جب زبان قال اسے تصورات کے جال میں پکڑ کر رکھنا چاہتی ہے تو الفاظ کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ انھیں الفاظ کو شاعر لے اڑتے ہیں اور نظم کا خوشنما لباس پہنا کر اس قدر دلکش اور دلفریب بنا دیتے ہیں کہ سننے والوں کا دل و دماغ مسحور ہو جاتا ہے۔ یہی وہ تصرف ہے جس کے متعلق شیخ علی حزیں نے کہا ہے کہ "برائے شعر گفتن خوب است" اگر یہ قیل و قال محض تفریح کے لئے ہو تو کوئی حرج نہیں مگر غضب تو یہ ہے کہ جو قوم عیش و عشرت میں پڑ کر زندگی کی کٹھن ذمہ داریوں سے گھبرانے لگتی ہے اور ان سے بچنے کا حیلہ ڈھونڈھتی ہے وہ اس متصوفانہ شاعری کو اپنا فلسفۂ حیات بنا لیتی ہے۔ کائنات کا موہوم ہونا، نفس انسانی کا بے حقیقت اور زندگی کا بے ثبات ہونا، سعی و عمل

کا لاحاصل ہونا وہ خیالات ہیں جو شعر کے میٹھے سروں میں تھکی ہوئی قوم کو لوریاں دے کر سلا دیتے ہیں۔ پھر جب اپنی غفلت کی بدولت وہ دولت و حکومت، قوت و اقتدار کھو بیٹھتی ہے تو یہی دلفریب نغمے، جو پہلے صبر و سکون اور کیف و سرور کا سبب ہوتے تھے، اب قنوط و یاس اور حزن و ملال کا باعث بن جاتے ہیں۔ اور اسے ایک بار گرنے کے بعد پھر اُٹھنے نہیں دیتے۔ یہی ماجرا تھا جو مسلمانوں پر گذرا اور جس نے ان میں بے مرکزی، بے اصولی اور بے عملی پیدا کر دی۔ مسلمانوں کے انفرادی اور اجتماعی امراض کا یہی سب سے بڑا سبب تھا جسے حکیم ملت اقبال نے پہچانا اور جس کے ازالے کی کوشش میں انھوں نے اپنی مسیحائی کی خداداد قوت صرف کی۔

اس عقیدے کو جو اقبال کے نزدیک ملت اسلامی کے زوال کی حقیقی وجہ ہے وہ "نفی خودی" کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور "اثبات خودی" کے نظریے سے رد کرنا چاہتے ہیں۔ خودی یا انانیت کا لفظ اردو میں کبر و غرور کے معنوں میں آیا کرتا ہے مگر اقبال نے اسے ایک فلسفیانہ اصطلاح کے طور پر اس احساس اور عقیدے کے لئے استعمال کیا ہے کہ فرد کا نفس یا انا، گو ایک مخلوق اور فانی ہستی ہے، لیکن یہ ہستی اپنا ایک علیحدہ وجود رکھتی ہے جو عمل سے پائیدار اور لازوال ہو جاتا ہے۔ اسرارِ خودی کے دیباچہ میں فرماتے

ہیں، "یہ لفظ اس نظم میں بہ معنی غرور استعمال نہیں کیا گیا جیسا کہ عام طور پر اُردو میں مستعمل ہے۔ اس کا مفہوم محض احساسِ نفس یا تعینِ ذات ہے۔"

یہی خودی کا تصور اقبال کے فلسفۂ حیات و کائنات کی بنیاد ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ فلسفے کا آغاز ایک حیرت اور الجھن سے ہوتا ہے۔ وہ سوال جس نے اقبال کو الجھن میں ڈالا یہ ہے، "یہ وحدت وجدانی یا شعور کا روشن نقطہ جس سے تمام انسانی جذبات و تخیلات مُستنیر ہوتے ہیں، یہ پُراسرار شے جو فطرتِ انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے، یہ 'خودی' یا 'انا' یا 'میں' جو اپنے عمل کی رُو سے ظاہر اور اپنی حقیقت کی رو سے مضمر ہے، جو تمام مشاہدات کی خالق ہے مگر جس کی لطافت نگاہوں کے گرم مشاہدے کی تاب نہیں لا سکتی۔ کیا چیز ہے؟ کیا یہ ایک لازوال حقیقت ہے یا زندگی نے محض عارضی طور پر اپنے فوری عملی اغراض کے حصول کی خاطر اپنے آپ کو اس فریبِ تخیل یا دروغ مصلحت آمیز میں نمایاں کیا ہے؟ اخلاقی اعتبار سے افراد اور اقوام کا طرزِ عمل اس نہایت ضروری سوال کے جواب پر منحصر ہے اور یہی وجہ ہے کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہ ہوگی جس کے علماء اور حکماء نے کسی نہ کسی صورت میں اس سوال کا جواب پیدا کرنے کے لئے دماغ سوزی نہ کی ہو۔ مگر اس سوال کا جواب افراد و اقوام کی دماغی قابلیت پر اس قدر انحصار نہیں رکھتا جس قدر کہ ان کی افتادِ طبیعت پر۔ مشرق کی فلسفی مزاج قومیں زیادہ تر اسی نتیجے کی طرف مائل ہوئیں کہ انسانی 'انا'

محض ایک فریب تخیل ہے اور اس پھندے کو گلے سے اتارنے کا نام نجات ہے مغربی اقوام کا عملی مذاق ان کو ایسے نتائج کی طرف لے گیا جن کے لئے ان کی فطرت متقاضی تھی ..... مغربی ایشیا میں اسلامی تحریک ایک نہایت زبردست پیغام عمل تھی۔ گو اس تحریک کے نزدیک 'انا' ایک مخلوق ہستی ہے جو عمل سے لازوال ہوسکتی ہے ...... میں نے اس دقیق مسئلے کو فلسفیانہ دلائل کی پیچیدگیوں سے آزاد کر کے تخیل کے رنگ میں رنگین کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ اس حقیقت کو سمجھنے اور غور کرنے میں آسانی پیدا ہو۔"

آیئے اب یہ دیکھیں کہ جس خیال کو اقبال نے یہاں مجمل طور پر نثر میں بیان کیا ہے اس کی تفصیلات اس باکمال سخنور کے فیض طبع سے شعر کا جامہ پہن کر کس قدر دلنشین اور دل آویز، روح پرور اور روح افزا، جاں نواز اور جاں بخش بن جاتی ہیں۔

اقبال کے نزدیک کائنات کی اصل ایک وجود بسیط ہے جس کے اندر شعور اور ارادے کی قوتیں مضمر ہیں۔ ان قوتوں کو فعل میں لانے کے لئے اس نے آپ کو خود اور غیر خود یا فلسفے کی اصطلاح میں موضوع اور معروض میں تقسیم کر دیا غیر خود کی علت غائی یہ ہے کہ وہ خودی کے مشاہدہ کے لئے آئینہ کا اور اس کے عمل ارتقا کے لئے معمول کا کام دے۔ خودی اپنی تکمیل اور استحکام کے لئے غیر خود

سے ٹکراتی ہے اور اسی تصادم کے ذریعہ سے اس کی اندرونی قوتیں نشو ونما پاتی ہیں۔ اور وہ بتدریج سلسلۂ ارتقا کو طے کرتی ہے۔ اس کی ہستی مسلسل حرکت اور عمل پیہم، کشمکش اور کارزار ہے۔ جس نسبت سے کوئی شے اپنی خودی میں مستحکم اور غیر خود پر غالب ہے اسی نسبت سے اس کا درجہ مدارجِ حیات میں متعین ہوتا ہے۔

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی است — ہر چہ می بینی ز اسرارِ خودی است
خویشتن را چوں خودی بیدار کرد — آشکارا عالمِ پندار کرد
صد جہاں پوشیدہ اندر ذاتِ او — غیر او پیداست از اثباتِ او
سازد از خود پیکرِ اغیار را — تا فزاید لذتِ پیکار را
چوں حیاتِ عالم از زورِ خودی است — پس بقدرِ استواری زندگی است
چوں زمیں بر ہستیِ خود محکم است — ماہ پابندِ طوافِ پیہم است
ہستیِ مہر از زمیں محکم تر است — پس زمیں مسحورِ چشمِ خاور است

اس سلسلۂ ارتقا کی آخری کڑی انسان ہے۔

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات — خودی کیا ہے بیداریِ کائنات
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے — نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے
زمانے کے دھارے میں بہتی ہوئی — ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی

ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر — ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر
خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے — فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

مخلوقات میں بہ اعتبار مدارج انسان اسی لئے سب سے برتر ہے کہ اس کی ذات میں خودی کو اپنا اور اپنے مقصد کا شعور حاصل ہو جاتا ہے اور یہی شعور اسے اور سب چیزوں سے ممتاز کرتا ہے۔ وہ بھی اور مخلوقات کی طرح ایک مخلوق ہے مگر اس کی ہستی محض اعتباری نہیں بلکہ حقیقی ہے۔ اس کے مقابلے میں عالمِ فطرت کا وجود محض اضافی اور انسانی ادراک و مشاہدے کا پابند ہے۔

این جہاں چیست صنم خانۂ پندارِ من است — جلوۂ او گروِ دیدۂ بیدارِ من است
ہمہ آفاق کہ گیرم بہ نگاہے اورا — حلقہ ہست کہ از گردشِ پرکارِ من است
ہستی و نیستی از دیدن و نادیدنِ من — چہ زمان و چہ مکاں شوخیٔ افکارِ من است

جہاں را فربہی از دیدنِ ما — نہانش رستہ از بالیدنِ ما
جہاں غیر از تجلی ہائے ما نیست — کہ بے ما جلوۂ نور و صدا نیست
جہانِ رنگ و بو گلدستۂ ما — نہ ما آزاد و ہم وابستۂ ما
خودی او را بیک تارِ نگہ بست — زمین و آسمان و مہر و مہ بست

بہ قول ڈیکارٹ کے انا یا خودی کی ہستی بدیہی ہے اس لئے کہ اسے بلا واسطہ اپنا شعور ہوتا ہے دراں حالیکہ غیر خود یعنی عالم فطرت کی ہستی دلیل کی محتاج ہے ۔ اگر انسان کو اپنے وجود میں شک ہو تو یہ شک خود اس بات کا ثبوت ہے کہ کوئی شک کرنے والا موجود ہے ۔

اگر گوئی کہ "من" وہم و گمان است — نمودش چوں نمود این و آن است
بگو با من کہ دارائے گماں کیست — یکے در خود نگر آں بے نشاں کیست
جہاں پیدا و محتاج دلیلے — نمی آید بہ فکر جبرئیلے
خودی پنہاں ز حجت بے نیاز است — یکے اندیش و دریاب ایں چہ راز است
خودی را حق بداں باطل مپندار — خودی را کشت بے حاصل مپندار

جس طرح انسانی زندگی کا نقطۂ آغاز اپنی خودی کا شعور ہے اسی طرح اس کی منزل مقصود یہ ہے کہ خودی کو روز بروز مضبوط اور مستحکم کرتا جائے ۔ جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں، خودی کے استحکام کی یہی صورت ہے کہ انسان غیر خود سے یعنی اپنے طبعی ماحول سے مسلسل جنگ کرتا رہے ۔ یہ اس طرح ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے لئے نئے نئے مقاصد متعین کرتا ہے اور انھیں حاصل کرنے کی سعی میں سرگرم رہتا ہے ۔ اس میں اسے اپنے ماحول میں تصرف کرنا اپنی راہ سے رکاوٹوں کو دور کرنا اور مشکلات کا مقابلہ کر کے ان پر غالب آنا

پڑتا ہے۔ اس طرح اس کی ذہنی اور عملی قوتیں برابر تیز ہوتی رہتی ہیں اور اس کے سینے میں خودی کی آگ روز بروز زیادہ مشتعل ہوتی جاتی ہے۔

زندگانی را بقا از مدعاست ۔ کاروانش را درا از مدعاست
زندگی در جستجو پوشیدہ است ۔ اصل او در آرزو پوشیدہ است
از تمنا رقص در دل سینہ ہا ۔ سینہ ہا از تاب او آئینہ ہا
ما ز تخلیق مقاصد زندہ ایم ۔ از شعاع آرزو تابندہ ایم

یہ سوزِ آرزو طالبِ خودی کو دم بھر چین نہیں لینے دیتا۔ ایک مقصد کے حاصل ہوتے ہی وہ ایک بلند تر مقصد کے حصول کی کوشش کرنے لگتا ہے اور اسی طرح راہِ طلب میں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اسی بے قراری اور بے چینی اسی سعئ پیہم اور جہدِ مسلسل کا نام زندگی ہے۔ سکون خواہ وہ بہشت کا سکون کیوں نہ ہو، روحِ انسانی کے لئے موت کا پیام ہے۔

چہ کنم کہ فطرتِ من بمقامِ در نہ سازد ۔ دلِ ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے
چو نظر قرار گیرد بہ نگارِ خوب روئے ۔ تپد آں زماں دلِ من پئے خوب تر نگارے
ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے ۔ سرِ منزلے نہ دارم کہ بمیرم از قرارے
چو ز بادۂ بہارے قدحے کشیدہ خیزم ۔ غزلے دگر سرایم بہ ہوائے نوبہارے
دلِ عاشقاں بمیرد بہ بہشتِ جاودانے ۔ نہ نوائے دردمندے نہ غمے نہ غمگسارے

خودی کے منازل ترقی اس عالمِ زمان و مکان کی تسخیر پر ختم نہیں ہوتے شاعر کی چشمِ تخیل انسان کے جہد و عمل کے لئے اس کے ماورا نئے نئے میدان دیکھتی ہے۔

خودی کی یہ ہے منزلِ اولیں ۔۔۔ مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں
تری آگ اس خاکداں سے نہیں ۔۔۔ جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں
بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر! ۔۔۔ طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود ۔۔۔ کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود
ہر اک منتظر تیری یلغار کا ۔۔۔ تری شوخیٔ فکر و کردار کا

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر ۔۔۔ چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا ۔۔۔ ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا ۔۔۔ کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

اس راہ میں ایک رہنما کی ضرورت ہے اور وہ رہنما عشق ہے۔ عشق اس مردِ کامل کی محبت کو کہتے ہیں جو معرفتِ نفس کے مدارج سے گذر کر خودی کی معراج پر پہنچ چکا ہے۔ محبت کا دوسرا نام تقلید ہے۔ لیکن یہاں عشق اور تقلید کے یہ معنی نہیں ہیں کہ عاشق اپنے آپ کو معشوق کی ذات میں

یا مقلد اپنے آپ کو مرشد کی ذات میں کھو دے یا اس سے روحانی قوت مستعار لے کر مصنوعی تقویت حاصل کر لے بلکہ یہ ہیں کہ وہ اس برتر شخصیت سے تکمیلِ خودی کا راز سیکھے اور خود اپنی قوتوں کو نشو و نما دے کر اپنی شخصیت یا خودی کو استوار کرے۔

نقطۂ نورے کہ نام او خودی است — زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی است
از محبت می شود پایندہ تر — زندہ تر، سوزندہ تر، تابندہ تر
کیمیا پیدا کن از مشتِ گلے — بوسہ زن بر آستانِ کاملے
کیفیت ہا خیزد از صہبائے عشق — ہست ہم تقلید از اسمائے عشق
عاشقی محکم شو از تقلیدِ یار — تا کمندِ تو شود یزداں شکار

خام کاروں کو عشق خود فراموشی اور از خود رفتگی سکھاتا ہے مگر پختہ کاروں کو خودشناسی اور خودداری کا سبق دیتا ہے۔

بہرِ دل عشق رنگِ تازہ برکرد — گہے با سنگ و گہہ با شیشہ سرکرد
ترا از خود ربود و چشم تر داد — مرا با خویشتن نزدیک تر کرد

ایک لافانی نصب العین کی محبت فانی انسان کی خودی کی تکمیل کر کے اسے بھی لازوال بنا دیتی ہے۔

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام

تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو
عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام

عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام

طلبِ ہدایت کے لئے کسی مردِ کامل کے آگے سرِ نیاز جھکانا تو خودی کو مستحکم کرتا ہے لیکن مال و دولت، جاہ و منصب کے لئے اربابِ اقتدار کا دستِ نگر ہونا اسے ضعیف کر دیتا ہے۔ فقر و استغنا خودی کی سب سے اہم شرط ہے۔

اے فراہم کردہ از شیراں خراج
گشتہ رو بہ مزاج از احتیاج

از سوال افلاس گردد خوار تر
از گدائی گدیہ گر نادار تر

از سوال آشفتہ اجزائے خودی
بے تجلی نخلِ سینائے خودی

وائے بر منت پذیرِ خوانِ غیر
گردنش خم گشتہ احسانِ غیر

اے خنک آں تشنہ کاندر آفتاب
می نخواہد از خضر یک جامِ آب

چوں حباب از غیرتِ مردانہ باش
ہم بہ بحر اندر نگوں پیمانہ باش

سوال اور گدائی صرف اسی کا نام نہیں کہ مفلس دولتمند کا طفیلی بن جائے بلکہ دولت جمع کرنے کا ہر طریقہ جس میں انسان خود محنت کر کے نہ کھائے، بلکہ

دوسروں کی محنت سے فائدہ اٹھائے، اقبال کے نزدیک گداگری میں داخل ہے، یہاں تک کہ وہ بادشاہ بھی جو غریبوں کی کمائی پر بسر کرتا ہے، سوال اور دریوزہ گری کا مجرم ہے۔

میکدے میں ایک دن اک مردِ زیرک نے کہا
ہے ہمارے شہر کا سلطاں گدائے بے نوا
تاج پہنایا ہے کس کی بے کلاہی نے اُسے
کس کی عریانی نے بخشی ہے اُسے زرّیں قبا
اُس کے آبِ لالہ گوں کی خونِ دہقاں سے کشید
تیرے میرے کھیت کی مٹی ہے اس کی کیمیا
اس کے نعمت خانے کی ہر چیز ہے مانگی ہوئی
دینے والا کون ہے، مردِ غریب و بے نوا
مانگنے والا گدا ہے صدقہ مانگے یا خراج!
کوئی مانے یا نہ مانے میر و سلطاں سب گدا

گدائی اور فقر میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ گدائی مالِ دنیا کی احتیاج اور دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانا ہے۔ فقر مادی لذتوں سے بے نیاز ہو کر کائنات کی قوتوں کو تسخیر کرنا۔ نوامیسِ فطرت پر حکمرانی کرنا۔

دنیا میں امن و انصاف کا ڈنکا بجانا، مظلوموں کو ظالموں کے پنجہ سے نجات دلانا ہے۔

چیست فقرا بندگانِ آب و گل
یک نگاہِ راہ بیں یک زندہ دل

فقر خیبر گیر با نانِ شعیر
بستۂ فتراک او سلطان و میر

فقر بر کرّ و بیاں شبخوں زند
بر نوامیسِ جہاں شبخوں زند

با سلاطیں بر فتد مردِ فقیر
از شکوہِ بوریا لرزد سریر

از جنوں می افگند ہوئے بہ شہر
وارہاند خلق را از جبر و قہر

بر نیفتد ملتے اندر نبرد
تا درو باقیست یک درویش مرد

آبروئے ما ز استغنائے اوست
سرزما از شوقِ بے پروائے اوست

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری
اک فقر سے کھلتے ہیں اسرارِ جہانگیری

اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری
اک فقر سے مٹی میں خاصیتِ اکسیری

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ
فقر ہے میروں کا میر فقر ہے شاہوں کا شاہ

چڑھتی ہے جب فقر کی سان پہ تیغِ خودی
ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کارِ سپاہ

کمالِ ترک نہیں آب و گِل سے مہجوری
کمالِ ترک ہے تسخیرِ خاکی و نوری

ہیں ایسے فقر سے اے اہلِ حلقہ باز آیا	تمھارا فقر ہے بے دولتی و رنجوری

جب خودی عشق و محبت اور فقر و استغنا سے مستحکم ہو جاتی ہے تو کائنات کی ساری قوتیں انسان کے قبضہ میں آجاتی ہیں۔

از محبت چوں خودی محکم شود	قوتش فرماں دہِ عالم شود
پنجۂ او پنجۂ حق می شود	ماہ از انگشتِ او شق می شود

قلندراں کہ بہ تسخیرِ آب و گِل کوشند	ز شاہ باج ستانند و خرقہ می پوشند
بہ جلوت اند و کمندے بہ مہر و مہ پیچند	بہ خلوت اند و زمان و مکاں در آغوشند

مگر خودی کی غیر محدود قوت تعمیر و تخریب دونوں کا کام کر سکتی ہے خودی سے تعمیر کا کام لینے کے لئے توسیع کے ساتھ ساتھ اس کی تادیب و تربیت بھی ضروری ہے (بے بند اور بے تربیت خودی کی مثال شیطان ہے جس کے متعلق اقبال کا نظریہ نہایت دلچسپ ہے۔ وہ بھی گوئٹے کی طرح اسے بدی کی قوت نہیں بلکہ خودی اور تخلیق کی عظیم الشان قوت سمجھتے ہیں جو محبت و اطاعت کی راہِ مستقیم سے بھٹک گئی ہے) خودی کی تادیب و تہذیب کا پہلا درجہ اطاعت ہے یعنی اس قانونِ حیات کی پابندی جو خالقِ عالم نے ہر مخلوق

کے لئے مقرر کیا ہے۔

هر که تسخیر مه و پروین کند
خویش را زنجیریِ آئین کند

باد را زندانِ گل خوشبو کند
قید بو را نافهٔ آهو کند

می زند اختر سوئے منزل قدم
پیشِ آئینے سرِ تسلیم خم

سبزه بر دینِ نمو روئیده است
پا تمال از ترکِ آں گردیده است

لاله پیهم سوختن قانونِ او
رقص پیرا در رگِ او خونِ او

قطره ها دریاست از آئینِ وصل
ذره ها صحراست از آئینِ وصل

باطنِ هر شئے ز آئینے قوی
تو چرا غافل ازیں ساماں روی

باز اے آزاد دستورِ قدیم
زینت پا کن هماں زنجیرِ سیم

شکوه سنجِ سختیِ آئیں مشو
از حدودِ زندگی بیروں مشو

دوسرا درجہ ضبطِ نفس ہے یعنی انسان اپنے نفس کی ادنیٰ قوتوں کو جن کی سرکشی کی کوئی حد نہیں ہے، قابو میں لائے خصوصاً نفسانی محبت اور خوف کے جذبات پر جو سب سے زیادہ قوی ہیں، غالب آئے۔

نفسِ تو مثلِ شتر خود پرور است
خود پرست و خود سوار و خود سر است

مرد شو آور زمامِ او بکف
تا شوی گوهر اگر باشی خزف

طرحِ تعمیرِ تو از گل ریختند
با محبت خوف را آمیختند

خوفِ دنیا، خوفِ عقبیٰ، خوفِ جاں　　خوفِ آلامِ زمین و آسماں
حبِّ مال و دولت و حبِّ وطن　　حبِّ خویش و اقربا و حبِّ زن
تا عصائے لا الٰہ داری بدست　　ہر طلسمِ خوف را خواہی شکست
ہر کہ در اقلیمِ لا آباد شد　　فارغ از بندِ زن و اولاد شد

ان دونوں مدارج سے گذرنے کے بعد انسان اس درجے پر فائز ہوگا جسے انسانیت کا اوجِ کمال سمجھنا چاہیئے۔ یہ نیابتِ الٰہی کا درجہ ہے اور اسے حاصل کرنا ارتقائے خودی کا بلند ترین نصب العین ہے۔ اسی کی تلاش میں نوعِ انسانی ہزارہا سال سے سرگرمِ سعی ہے اور اسی کے انتظار میں کائنات روزِ ازل سے بے قرار ہے۔

نائبِ حق در جہاں بودن خوش است　　بر عناصر حکمراں بودن خوش است
نائبِ حق ہمچو جانِ عالم است　　ہستیٔ او ظلِ اسمِ اعظم است
از رموزِ جزو و کل آگہ بود　　در جہاں قائم بامر اللہ بود

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا　　اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا
رونقِ ہنگامۂ ایجاد شو　　در سوادِ دیدہ ہا آباد شو
نوعِ انساں مزرع و تو حاصلی　　کاروانِ زندگی را منزلی

سجدہ ہائے طفلک و برنا و پیر   از جبینِ شرمسارِ ما بگیر

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات
ہر دو جہان سے غنی اس کا دلِ بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دل نواز
نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو!
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز
نقطۂ پرکارِ حق مردِ خدا کا یقیں
ورنہ یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز
عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمیٔ محفل ہے وہ

ہم نے اوپر اس مافوق انسانی قانون کا ذکر کیا ہے جس کی پابندی خودی

کی تکمیل کے لیئے لازمی ہے۔ یہ فرد اور ملت کے ربط کا قانون ہے، جسے اقبال "بے خودی" کہتے ہیں۔

ایران اور ہندوستان کے شعرا نفس انسانی کو قطرے سے اور ذات ایزدی کو دریا سے تشبیہ دیتے آئے ہیں۔ اقبال قطرہ و دریا کی تمثیل سے فرد و ملت کے تعلق کو ظاہر کرتے ہیں۔ لیکن ان کے نزدیک قطرے کے دریا میں مل جانے سے اس کی ہستی فنا نہیں ہو جاتی بلکہ اور استحکام حاصل کر لیتی ہے۔ وہ بلند اور دائمی مقاصد سے آشنا ہو جاتا ہے۔ اس کی قوتیں منظم اور منضبط ہو جاتی ہیں اور اس کی خودی پائیدار اور لازوال بن جاتی ہے۔

فرد تا اندر جماعت گم شود — قطرہ وسعت طلب قلزم شود
فرد تنہا از مقاصد غافل است — قوتش آشفتگی را مائل است
قوم با ضبط آشنا گرداندش — نرم رو مثل صبا گرداندش
چوں اسیر حلقۂ آئیں شود — آہوئے رم خوئے او مشکیں شود

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

اب تک ہم نے اقبال کے کلام سے تصور خودی کے وہ عناصر منتخب کر کے

آپ کے سامنے پیش کیئے ہیں جو عالمگیر ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اقبال کا سارا فلسفہ اسلامیت کی روح سے لبریز ہے اور ان کے صحیح مخاطب مسلمان ہیں۔ لیکن ایک سچے شاعر کی طرح ان کے دل میں سارے جہان کا درد ہے۔ ان کی محبت کل نوعِ بشر کو محیط ہے اور ان کا پیام ایک حد تک سب انسانوں کے لئے عام ہے۔ وہ ہر مذہب وملت کے لوگوں کو اپنی خودی کی تربیت اور اپنی مخصوص ملی روایات کی حفاظت کی تعلیم دیتے ہیں تاکہ وہ زندگی کے صحیح نصب العین سے قریب تر ہو جائیں۔

من نہ گویم از بتاں بیزار شو — کافری شائستۂ زنار شو
اے امانت دارِ تہذیبِ کہن — پشت پا بر ملتِ آبا مزن
گر ز جمعیت حیاتِ ملت است — کفر ہم سرمایۂ جمعیت است
تو کہ ہم در کافری کامل نۂ — لائقِ طوفِ حریمِ دل نۂ
ماندہ ایم از جادۂ تسلیم دور — تو ز آذر من ز ابراہیم دور
قیسِ ما سودائیِ محمل نہ شد — در جنونِ عاشقی کامل نہ شد

ان کے کلام سے بے شمار اشعار پیش کیئے جا سکتے ہیں جن میں انہوں نے بلا امتیاز مذہب وملت کل نوعِ انسانی سے خطاب کیا ہے۔ لیکن ہمارے اس دعوے کا کہ اقبال کے فلسفۂ خودی کا جان بخش پیام صرف مسلمانوں تک محدود

نہیں بلکہ مشرق و مغرب کے کل انسانوں کے لیے ہے، قطعی ثبوت "پیامِ مشرق" کے دیباچے سے ملتا ہے۔ جس کے چند جملے ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

"حقیقت یہ ہے کہ اقوامِ عالم کا باطنی اضطراب جس کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہم اس وقت اس وجہ سے نہیں لگا سکتے کہ خود اس اضطراب سے متاثر ہیں۔ ایک بہت بڑے روحانی اور تمدنی اضطراب کا پیش خیمہ ہے۔ یورپ کی جنگِ عظیم ایک قیامت تھی جس نے پرانی دنیا کے نظام کو تقریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے اور اب تہذیب و تمدن کی خاکستر سے فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لیے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے۔ مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے مگر اقوامِ مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہیے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب نہیں پیدا کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون جس کو قرآن نے ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے، زندگی کے فردی اور اجتماعی پہلو پر حاوی ہے اور میں نے اپنے فارسی کلام میں اسی صداقت کو مدِنظر رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس وقت دنیا میں اور بالخصوص ممالکِ مشرق میں ہر ایسی کوشش جس کا مقصد افراد و اقوام کی نگاہ کو جغرافی حدود سے بالاتر کر کے ان میں ایک صحیح اور قومی انسانی سیرت کی تجدید یا تولید ہو، قابلِ احترام ہے۔"

آپ نے دیکھا کہ اقبال کا نصب العین افراد اور اقوام کی نگاہ کو جغرافی حدود سے بالاتر کر کے ایک صحیح اور قوی انسانی سپرٹ کی تجدید و تولید ہے۔ اسی کو انہوں نے اپنی تصنیفات میں مدِ نظر رکھا ہے اور اسی کا پیام مشرق و مغرب کو دینا چاہتے ہیں۔

ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ خالص فلسفیانہ نظریے کی حیثیت سے انسانیت کا ایک عالمگیر تصور ممکن ہے، لیکن جب اس تصور کو ایک زندہ نصب العین کی صورت میں پیش کرنا ہو تو وسیع سے وسیع نظر رکھنے والا بھی اس پر مجبور ہے کہ انسانیت کی تصویر کسی خاص ملت کے آئینے میں دیکھے۔ اقبال کے لئے ملتِ بیضائے اسلام اس آئینے کا کام دیتی ہے۔ ان کے نزدیک انسان کی خودی کی حقیقی تکمیل اور فرد و ملت کا حقیقی ربط صرف اسلام ہی کے ذریعہ سے ممکن ہے اس لئے کہ اسلام میں فرد اور ملت کا رشتہ اتحادِ نسل یا وطن کا محدود تصور نہیں بلکہ توحید اور رسالت کا وسیع اور ہمہ گیر عقیدہ ہے؛

یا وطن وابستہ تقدیرِ امم | بر نسب بنیادِ تعمیرِ امم
اصلِ ملت در وطن دیدن کہ چہ | باد و آب و گل پرستیدن کہ چہ
ملتِ ما را اساسِ دیگر است | ایں اساس اندر دلِ ما مضمر است
مدعائے ما مآلِ ما یکیست | طرز و اندازِ خیالِ ما یکیست
لا الٰہ سرمایۂ اسرارِ ما | رشتہ اش شیرازۂ افکارِ ما
ملتِ بیضا تن و جاں لا الٰہ | سازِ ما را پردہ گرداں لا الٰہ

از رسالت در جہاں تکوینِ ما | از رسالت دینِ ما آئینِ ما
از رسالت صد ہزار ما یک است | جزو ما از جزو ما لاینفک است

از میانِ بحرِ او خیزیم ما — مثلِ موج از ہم نمی ریزیم ما
دینِ فطرت از نبی آموختیم — در رہِ حق مشعلے افروختیم
ایں گہر از بحرِ بے پایانِ اوست — ایں کہ یک جانیم از احسانِ اوست
قوم را سرمایۂ قوت ازو — حفظِ سرِّ وحدتِ ملّت ازو

فرد کو حقیقی آزادی ملّتِ اسلامی ہی کے اندر حاصل ہوئی کیونکہ اسی ملّت نے نوعِ انسانی کو حقیقی معنی میں حریت، مساوات اور اخوت کا نمونہ دکھایا۔ توحید کے عقیدے نے نسل و نسب کے امتیاز کو مٹا دیا، غریبوں کو امیروں کے اور زیردستوں کو زبردستوں کے تسلط سے آزاد کر کے عدل و انصاف کی حکومت قائم کی اور اسلام کے رشتے سے انسانوں کو ایک دوسرے کا بھائی بنا دیا۔

اُمتے از ما سوا بیگانۂ — بر چراغِ مصطفےٰ پروانۂ
ناشکیبِ امتیازات آمدہ — در نہادِ او مساوات آمدہ
پیشِ قرآں بندۂ و مولا یکیست — بوریا و مسندِ دیبا یکیست

عشق را آرامِ جاں حریت است — ناقہ اش را ساربان حریت است
موسیٰ و فرعون و شبیر و یزید — ایں دو قوت از حیات آمد پدید

زندہ حق از قوتِ شبیری است
باطل آخر داغ حسرت میری است

ماسوی اللہ را مسلماں بندہ نیست
پیشِ فرعونے سرش افگندہ نیست

کُلُّ مومن اِخوۃٌ اندر دلش
حریت سرمایۂ آب و گلش

تکمیلِ خودی کی ایک اہم شرط یہ بھی ہے کہ نفس زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہو جائے اور یہ بات بھی ملتِ اسلامی کے اندر حاصل ہو سکتی ہے جو خود حدودِ زمانی و مکانی سے بالاتر ہے اس لئے کہ اس کا اساس نسل و وطن کا مادی تخیل نہیں بلکہ توحید و رسالت کا روحانی عقیدہ ہے۔ نسل فنا ہو سکتی ہے وطن کا رشتہ ٹوٹ سکتا ہے مگر کلمۂ توحید کا رشتہ لافانی اور لازوال ہے۔

جوہرِ ما با مقامے بستہ نیست
بادۂ تندش بہ جامے بستہ نیست

عقدۂ قومیتِ مسلم کشود
از وطن آقائے ما ہجرت نمود

حکمتش یک ملتِ گیتی نورد
بر اساسِ کلمہ تعمیر کرد

ہر کہ از قیدِ جہات آزاد شد
چوں فلک در شش جہت آباد شد

امتِ مسلم ز آیاتِ خدا است
اصلش از ہنگامۂ قالوا بلیٰ است

تا خدا ان یطفئو فرمودہ است
از فسردن ایں چراغ افسردہ است

رومیاں را گرم بازاری نماند
آں جہانگیری جہانداری نماند

شیشۂ ساسانیاں درخوں نشست ‌ ‌ رونقِ خمخانۂ یوناں شکست
مصر ہم در امتحاں ناکام شد ‌ ‌ استخوانِ او تہِ اہرام شد
در جہاں بانگِ اذاں بود است و ہست ‌ ‌ ملتِ اسلامیاں بود است و ہست

ملتِ اسلامی کے لئے قرآن کریم آئینِ حیات کا اور اخلاق محمدی اسوۂ زندگی کا کام دیتا ہے۔ آئین الٰہی پر عمل کرنے سے اس کی سیرت میں پختگی اور آداب محمدی کی پیروی سے حسن اور دل کشی پیدا ہوتی ہے۔ اس کا مرکز محسوس کعبہ اور اس کا نصب العین حفظ و نشر توحید ہے۔

تو ہمی دانی کہ آئینِ تو چیست ‌ ‌ زیرِ گردوں سرِّ تمکینِ تو چیست
آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم! ‌ ‌ حکمتِ او لایزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات! ‌ ‌ بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
از یک آئینی مسلماں زندہ است! ‌ ‌ پیکرِ ملت ز قرآں زندہ است

ملت از آئینِ حق گیرد نظام ‌ ‌ از نظامے محکمے گیرد دوام
ہست دینِ مصطفےٰ دینِ حیات ‌ ‌ بے ثبات از قوتش گیرد ثبات

غنچہ از شاخسارِ مصطفےٰ! ‌ ‌ گل شو از بادِ بہارِ مصطفےٰ!

از بہارش رنگ و بو باید گرفت
بہرۂ از خلقِ او باید گرفت

فطرتِ مسلم سراپا شفقت است
در جہاں دست و زبانش رحمت است

قوم را ربط و نظام از مرکزے
روزگارش را دوام از مرکزے

راز دارِ رازِ ما بیت الحرام
سوزِ ما ہم سازِ ما بیت الحرام

تو ز پیوندِ حریمے زندہ!
تا طواف او کنی پایندہ

در جہاں جانِ امم جمعیت است
در نگر سرِّ حرم جمعیت است

زانکہ در تکبیر رازِ بودِ تست
حفظ و نشرِ لا الٰہ مقصودِ تست

تا نہ خیزد بانگِ حق از عالمے
گر مسلمانی نیاسائی دمے

آب و تابِ چہرۂ ایامِ تو
در جہاں شاہد علی الاقوام تو

نکتہ سنجاں را صلائے عام دہ
از علومِ امیئے پیغام دہ

تا بدست آوری نبضِ کائنات
واشگافی اسرارِ تقویمِ حیات

در جہاں وابستۂ دینش حیات
نیست ممکن جز بہ آئینش حیات

یہ یک آئینی اور یک جہتی، ہم مرکزی اور ہم مقصدی ملت کو متحد کر کے
ایک نفسِ واحد بنا دیتی ہے اور اس میں ایک اجتماعی خودی کا احساس پیدا ہو جاتا ہے

جس کی مجموعی قوت فرد کی خودی کو تقویت پہنچاتی ہے اور وسیع تر اور محکم تر بناتی ہے۔ یہ ملت کا احساسِ خودی بھی فرد کے احساسِ خودی کی طرح اسی سے توسیع اور استحکام حاصل کرتا ہے کہ کارزارِ حیات میں عالمِ خارجی کی قوتوں کا مقابلہ کرے۔ علم کے ذریعہ سے ان کی حقیقت کو پہچانے اور عمل کے ذریعہ انھیں تسخیر کرے۔ عالمِ اسباب کو حقیر جان کر ترک کر دینا غفلت کی انتہا ہے۔ یہ فرد اور ملت کا میدانِ عمل اور ان کی عقل اور ارادے کی تربیت گاہ ہے۔ اگر انسان علم کی مدد سے اپنے خارجی ماحول پر غالب نہ آئے تو اس سے مغلوب ہو کر ہلاک ہو جائیگا۔ اس لئے عالمِ اشیا بھی معرفتِ نفس کی طرح خودی کے نشو و نما کے لئے ناگزیر ہے

هر که محسوسات را تسخیر کرد — عالمے از ذرۂ تعمیر کرد

کوه و صحرا، دشت و دریا بحر و بر — تختۂ تعلیم اربابِ نظر

اے که از تاثیرِ افیوں خفتۂ — عالمِ اسباب را دوں گفتۂ

خیز و وا کن دیدۂ مخمور را — دوں مخواں ایں عالمِ مجبور را

غایتش توسیعِ ذاتِ مسلم است — امتحانِ ممکناتِ مسلم است

کاروانِ رہگذار ست ایں جہاں — نقدِ مومن را عیار است ایں جہاں

گیر او را تا نہ او گیرد ترا — ہمچو مے اندر سبو گیرد ترا

جستجو را محکم از تدبیر کن — انفس و آفاق را تسخیر کن

چشمِ خود بکشا دُور اشیا نگر — نشہ زیرِ پردۂ صہبا نگر
تاقوی از حکمتِ اشیا شود — ناتواں باج از توانایاں خورد
علمِ اشیا اعتبارِ آدم است — حکمتِ اشیا حصارِ آدم است

ملت کے احساسِ خودی کی توسیع کے لئے علمِ کائنات اور تسخیر کائنات کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی تاریخ اور اپنی روایات کی یاد کو دل میں تازہ رکھے۔ تاریخِ اقوام کی زندگی کے لئے قوتِ حافظہ کا حکم رکھتی ہے۔ حافظہ ہی وہ چیز ہے جس سے فرد کے مختلف ادراکات میں ربط اور تسلسل پیدا ہوتا ہے۔ جب خارجی حیات کے ہجوم میں ایسے "میں" یا "انا" کا مرکز ہاتھ آتا ہے تو یہی حافظہ اس احساسِ خودی کی حفاظت کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح تاریخ سے ملت کی زندگی کے مختلف ادوار میں ربط اور تسلسل پیدا ہوتا ہے اور یہی شیرازہ بندی اس کے شعورِ خودی کی کفیل اور اس کے بقائے دوام کی ضامن ہے۔ وہی قومیں دنیا میں زندہ رہتی ہیں جو اپنے حال کا رشتہ ایک طرف ماضی سے اور دوسری طرف مستقبل سے استوار کرتی ہیں۔ زندگی نام ہی اس احساسِ تسلسل کا ہے۔

کودکے را دیدی اے بالغ نظر — کو بود از معنیٔ خود بے خبر

نقش گیر این و آن اندیشه اش
غیر جوئی غیر بینی پیشه اش

تا ز آتش گیریِ افکارِ او
گل فشاند زرِ چکِ پندارِ او

چشم گیر ایش فتد بر خویشتن
دستکے بر سینه می کوبد که "من"

یادِ او با خود شناسائش کند
حفظِ ربطِ دوش و فردایش کند

این "مِن" نوزاده آغازِ حیات
نغمهٔ بیداریِ سازِ حیات

ملّتِ نوزاده مثلِ طفلک است
طفلکے کو در کنارِ مادر است

بسته با امروز او فردایش نیست
حلقه هائے روز و شب در پایش نیست

چشمِ هستی را مثالِ مردم است
سینه را بینندهٔ و از خود گم است

صد گره از رشتهٔ او وا کند
تا سرِ تارِ خودی پیدا کند

گرم چون افتد به کارِ روزگار
این شعورِ تازه گردد پایدار

نقشها بر دارد و اندازد او
سرگذشتِ خویش را می سازد او

قوم روشن از سوادِ سرگذشت
خود شناس آمد ز یادِ سرگذشت

نسخهٔ بودِ ترا اے هوشمند
ربطِ ایام آمده شیرازه بند

ضبط کن تاریخ را پاینده شو
از نفسهائے رمیده زنده شو

سر زند از ماضیِ تو حالِ تو
خیزد از حالِ تو استقبالِ تو

مشکن ار خواهی حیاتِ لا زوال
رشتهٔ ماضی ز استقبال و حال

موجِ ادراکِ تسلسل زندگی است　　　　مے کشاں را شورِ قلقل زندگی است

اوپر کے صفحات میں اقبال کے تصورِ خودی کے دو پہلو آپ کے سامنے آ گئے۔ ایک یہ کہ خودی کا غیر خود یعنی عالمِ خارجی سے۔ دوسرے یہ کہ اس کا نفسِ اجتماعی یعنی ملت سے کیا تعلق ہونا چاہیئے۔ ابھی ایک تیسرا پہلو باقی ہے جو ان دونوں سے زیادہ نازک اور لطیف ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ فرد کا بہ حیثیت مخلوق کے اپنے خالق سے صحیح علاقہ کیا ہے؟ آپ نے دیکھا کہ خودی غیر خود سے ٹکرا کر اور اس کی قوتوں کو تسخیر کر کے استحکام اور توسیع حاصل کرتی ہے، اپنی فطرت کے قانون کی پابندی سے یعنی توحید و رسالت کے روحانی عقیدے کی بنا پر ملت کے حبلِ متین میں مربوط ہو جانے سے پائیدار اور لازوال بن جاتی ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ یہ محدود و لازوال ہستی اس ذات لایزال سے جس نے اس کو اور کل کائنات کو پیدا کیا، کیا رشتہ رکھتی ہے۔

اب تک اقبال کے کلام کا موضوع فلسفۂ نفس اور فلسفۂ تمدن کے مسائل تھے جن میں جذبات کو بہت کم دخل ہے۔ جذبات شاعری کی جان ہیں اور خشک فلسفیانہ مسائل میں جو جذبات کے کیف اور رنگ سے خالی ہوں، شعریت پیدا کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ یہ اقبال کا کمال فن ہے کہ اصول

نے حکمت کو اپنے سوزِ دل کی حرارت سے شعر بنا دیا۔ یہ اُن کے حصے کی چیز ہے جس میں ایشیا کے قدیم و جدید شاعروں میں بہت کم ان کے ساتھ شریک ہیں لیکن اب وہ تصوف کے میدان میں قدم رکھتے ہیں جہاں واردات قلب کو نا تمام تصورات کا ایک ہلکا سا لباس پہنا کر الفاظ میں ادا کرنا ہے۔ ایک لحاظ سے یہ مرحلہ ایشیائی شاعر کے لئے سب سے زیادہ آسان ہے اس لئے کہ یہ احساسات اس کی طبیعت میں رچے ہوئے ہیں اور پھر ان میں کچھ اس درجہ شعریت ہے کہ خود بخود شعر کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں مگر دوسرے لحاظ سے دیکھئے تو یہ میدان اس قدر پامال ہو چکا ہے کہ اس میں کوئی نئی راہ نکالنا نہایت مشکل ہے۔ لیکن اقبال کا طرزِ خیال ہی سب سے جدا ہے اس لئے ان کے تصوف نے خود بخود اپنے لئے ایک نیا راستہ پیدا کر لیا ہے اور وہ اسی منزل کی طرف لے جاتا ہے جو ان کے فلسفہ حیات کی منزل ہے۔ یہی وہ نازک مقام ہے جس میں روحانیت کا ذوق رکھنے والی طبیعتیں آ کر کھو جاتی ہیں۔ بادۂ معرفت کے پہلے ہی جام میں علم کائنات اور احساس خودی کا رشتہ ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ یہ اقبال ہی کا ظرف ہے کہ عالمِ بے خودی میں بھی اتنا ہوش رہتا ہے کہ اس امانت کو نہیں بھولتے جو خدا نے انسان کے سپرد کی ہے۔

ہم نے اوپر کہا تھا کہ طالب خودی اس "مردِ خدا" کی محبت میں جو ماہیتِ خودی

میں اس سے برتر ہے. سرشار ہو جاتا ہے۔ پھر کیا ٹھکانا ہے اس کیفِ و مستی کا جو خودی کے مبدا و منتہا اور خالق و پروردگار یعنی خدائے تعالیٰ کی محبت اس کے دل میں پیدا کر دیتی ہے۔ انسان اپنے دائرۂ ارتقا میں خودی کے کل مراحل طے کرنے کے بعد بھی ناقص و ناتمام ہی رہتا ہے اور کمال و تمام کا وہ جلوہ جو اسے ذاتِ مطلق میں نظر آتا ہے اس کے دل کو بے ساختہ اپنی طرف کھینچتا ہے، اسی کشش کا عشقِ حقیقی ہے۔ عشق کی تین منزلیں ہوتی ہیں:- آرزو اور جستجو، دیدار وصل، قدیم صوفی شعراء کے یہاں اس تیسری منزل کا تصور یہ ہے کہ طالب مطلوب کے اندر اس طرح فنا ہو جائے جیسے قطرہ دریا میں محو ہو جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ محدود و ما محدود کے وصل کا اس کے سوا کوئی تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ مگر اقبال کے نزدیک اس عشق کی صرف دو ہی منزلیں ہیں۔ پہلی منزل سوز و گداز آرزو کی ہے۔ دوسری کیفِ دیدار کی جو راحت بخش بھی ہے اور اضطراب افزا بھی۔ تیسری کوئی منزل نہیں۔ لذتِ دیدار سے کامیاب ہونے کے بعد بھی نفسِ انسانی روحِ مطلق سے جدا رہتا ہے اور دردِ جدائی سے تڑپتا ہے۔ یہی اس کی فطرت ہے اور یہی اس کی تقدیر۔

اب اس اجمال کی تفصیل اقبال کے کلام میں ملاحظہ ہو۔ صوفی شعراء کے نزدیک عالمِ شہود کی تخلیق کی غایت یہ ہے کہ شاہدِ مطلق اس آئینے میں اپنے جمال کا نظارہ کرے

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں   ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں
(غالب)

اقبال کا بھی یہی خیال ہے:۔

صورت گرے کہ پیکر روز و شب آفرید   از نقش این و آں بہ تماشائے خود رسید

فرق یہ ہے کہ اوروں کے نزدیک ماسوا محض موہوم ہے اور اقبال کے نزدیک موجود۔ غالب کہتے ہیں:۔

شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے عالم   لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

مگر جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں اقبال کے خیال میں کائنات کے اندر حیات حقیقی یعنی خودی کی قوت مضمر ہے۔ اور اس اعتبار سے مظاہر کائنات محض وہم ہی وہم نہیں ہیں بلکہ کم سے کم بالقوہ وجود رکھتے ہیں۔ جب یہ قوت رفتہ رفتہ ارتقا پاکر انسان کی ذات میں شعور اور ارادہ حاصل کر لیتی ہے تو اس کا وجود نمایاں ہو جاتا ہے۔ میلاد آدم دنیا میں ایک نئے دور حیات کا آغاز ہے اس لئے کہ وہ اپنی ہستی کا شعور اور ہستی مطلق کی معرفت کا حوصلہ رکھتا ہے۔

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد   حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاک جہان مجبور   خودگرے، خود شکنے، خودنگرے پیدا شد
خبرے رفت زگردوں بہ شبستان ازل   حذر اے پردگیاں پردہ درے پیدا شد
آرزو بے خبر از خویش بہ آغوش حیات   چشم وا کرد و جہان دگرے پیدا شد

یہ نیا مخلوق سوز و ساز آرزو سے معمور ہے اس کے دل میں ابتدا سے نہ صرف اپنی محدود حقیقت بلکہ ذات ایزدی کی نامحدود حقیقت کا محرم بننے کی لگن ہے۔ وہ زبانِ حال سے کہتا ہے:-

چہ خوش است زندگی را ہمہ سوز و ساز کردن — دل و کوہ و دشت و صحرا بہ دمے گداز کردن
بہ گداز ہائے پنہاں بہ نیاز ہائے پیدا — نظرے ادا شناسے بہ حریم ناز کردن
گہے جز یکے نہ دیدن بہ ہجومِ لالہ زارے — گہے خارِ نیش زن را ز گل امتیاز کردن
ہمہ سوز ناتمامم ہمہ درد آرزویم!! — بہ گماں دہم یقیں را کہ شہید جستجویم

پہلے اس کی آرزو صرف یہیں تک محدود ہوتی ہے کہ ماسوا کے پردے سامنے سے ہٹ جائیں اور شاہد مطلق کا جمالِ بے حجاب نظر آئے۔

چند بروئے خود کشی جلوۂ صبح و شام را — چہرہ کشا تمام کن جلوۂ ناتمام را

بر سرِ کفر و دیں فشاں رحمت عام خویش را — بندِ نقاب بر کشا ماہ تمام خویش را

اگر وہ طاقت دیدار رکھتا ہے تو یہ آرزو پوری ہو سکتی ہے مگر صرف اس حد تک کہ کبھی کبھی حسنِ مطلق کی ایک جھلک نظر آتی ہے اور آناً فاناً چھپ جاتی ہے

نہ ایں عالم حجاب او را نہ آں عالم نقاب او را — اگر تاب نظر داری نگاہے می تواں کردن

افلاک سے آتے ہیں نالوں کے جواب آخر　　کرتے ہیں خطاب آخر اٹھتے ہیں حجاب آخر

بہ دیگراں چہ سخن گسترم ز جلوۂ دوست　　بہ یک نگاہ مثالِ شرارہ می گذرد

تو ز راہِ دیدۂ ما بہ ضمیرِ ما گذشتی　　مگر آنچناں گذشتی کہ نگہ خبر ندارد

مگر اس سے طالب دیدار کی تسکین نہیں ہوتی بلکہ اس کا اضطراب قلب اور بڑھ جاتا ہے اور اس کشمکش سے عاجز آ کر وہ چاہتا ہے کہ بحرِ وجود اپنی کشش کو اور بڑھا دے اور اس کے قطرۂ خودی کو اپنے آغوش میں لے کر سکونِ دائمی بخشے

فرصتِ کشمکش مدہ ایں دلِ بے قرار را　　یک دو شکن زیادہ کن گیسوئے تابدار را

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر　　ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر
عشق بھی ہو حجاب میں حسن بھی ہو حجاب میں　　یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر
تو ہے محیطِ بے کراں میں ہوں ذرا سی آبجو　　یا مجھے ہمکنار کر یا مجھے بے کنار کر

لیکن اس دیدار و وصل میں یہ اندیشہ ہے کہ کہیں قطرہ دریا میں مل کر اپنی خودی کو فنا نہ کر دے اور یہ بات اقبال کو کسی طرح گوارا نہیں۔

اگر نظارہ از خود رفتگی آرد حجاب اولیٰ　　نہ گیرد با من ایں سودا بہا از لبی گراں خواہی

اگر یک ذرہ کم گردد ز انگیزِ وجودِ من　　بہ ایں قیمت نمی گیرم حیاتِ جاودانی را

وہ ایسا وصل نہیں چاہتے جس میں قطرے کا انفرادی وجود مٹ جائے لیکن ان کے خیال میں یہ اندیشہ بے جا ہے۔ دیدار و معرفتِ الٰہی سے خودی کی آب و تاب کم نہیں ہوتی بلکہ اور بڑھ جاتی ہے۔

کمالِ زندگی دیدارِ ذات است　　طریقش رستن از بندِ جہات است

چناں باذاتِ حق خلوت گزینی　　ترا او بیند و او را تو بینی!!

منور شو ز نورِ من یرانی"!　　مژہ برہم مزن تو خود نہ مانی۔

بہ خود محکم گذر اندر حضورش　　مشو ناپید اندر بحرِ نورش

چناں در جلوہ گاہِ یار می سوز　　عیاں خود را نہاں او را بر افروز

اگر قطرے کے دل میں کبھی اپنی کم مائیگی کا خطرہ گذرتا ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ دریا کے آگے اس کی ہستی معدوم محض ہے تو خود بحرِ حقیقت اس کی خودی کی بقا کی ضمانت کرتا ہے۔

یکے قطرہ باراں ز ابرے چکید　　خجل شد چو پہنائے دریا بدید

کہ جائے کہ دریاست من کیستم　　گر او ہست حقا کہ من نیستم"

دلکین ز دریا بر آمد خروشش — زشرمِ تنک مایگی رو بپوشش
زموجِ سبک سیرِ من زادہ — زمن زادہ در من افتادہ
بیا سائے در خلوتِ سینہ ام — چو جوہر درخشش اندر آئینہ ام
گہر شو در آغوشِ قلزم بزی — فروزاں تو از ماہ و انجم بزی

اسی طرح قطرۂ ناچیز میں جوشِ عشق وہ ظرف پیدا کر دیتا ہے کہ وہ دریا کو اپنے آغوش میں لینے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔

در سینۂ من دمے بیاسائے — از زحمت و کلفتِ خدائی

حفظِ خودی کا خیال عشق کے منافی نہیں بلکہ عین عشق ہے حسن کا عیار عاشق کا دل ہے اور بزمِ حسن کا فروغ عاشق کے دم سے ہے۔ وہ اپنی خودی کی حفاظت اپنے لئے نہیں بلکہ معشوق کی خاطر کرتا ہے۔

خدائے زندہ بے ذوقِ سخن نیست — تجلی ہائے او بے انجمن نیست
کہ برقِ جلوۂ او بر جگر زد — کہ خود آں بادۂ و ساغر بسوزد
عیارِ حسن و خوبی از دلِ کیست — مہِ او در طوافِ منزلِ کیست
الست از خلوتِ ناز کہ برخاست؟ — بلیٰ از پردۂ سازِ کہ برخاست؟
اگر ما ئیم گرداں جامِ ساقی است — بہ بزمش گرمیِ ہنگامہ باقی است
مرا دل سوخت بر تنہائیِ او — کنم ساماں بہ بزم آرائیِ او

مثالِ دانہ می کارم خودی را — برائے او نگہ دارم خودی را

لیکن جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، محدود کا حقیقی وصل نامحدود سے یہی ہے کہ اس کے اندر محو ہو جائے۔ بندے اور خدا کا یہ وصل جو اقبال کے پیشِ نظر ہے، حقیقت میں وصل نہیں ہے۔ یہ ایک خاص حالت ہے جس میں سکون حاصل نہیں ہوتا بلکہ سوز و سازِ فراق اور بڑھ جاتا ہے۔

او درمن و من درو، ہے ہجراں کہ وصال است این — اے عقل چہ می گوئی اے عشق چہ فرمائی

از و خود را بریدن فطرتِ ماست — تپیدن نارسیدن فطرتِ ماست
نہ مارا در فراقِ او عیارے ! — نہ او را بے وصالِ ما قرارے
نہ او بے ما نہ ما بے او چہ حال است — فراقِ ما فراقِ اندر وصال است

کبھی دردِ فراق میں اقبال اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسکین دیتے ہیں کہ سوز و گداز کا یہ کیف انسان ہی کا حصہ ہے۔ خدا اس سے محروم ہے:-

سوز و گداز حالتیست بادہ ز من طلب کنی — پیشِ تو گر بیاں کنم مستیٔ این مقام را

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی — مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

کبھی شوخیٔ تخیل سے یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح بندہ خدا کے ہجر میں بیچین اسی طرح خدا بھی بندے کے فراق میں بے قرار ہے۔

ما از خدائے گم شدہ ایم او بہ جستجو است
چوں ما نیاز مند و گرفتارِ آرزو است

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

بہر حال یہ جدائی انسان کے لیے مبارک ہے کیونکہ یہی اس کی خودی کی وجہِ حیات ہے۔

جدائیٔ عشق را آئینہ دار است
جدائی عاشقاں را سازگار است
اگر ما زندہ ایم از دردمندی است
وگر پائندہ ایم از دردمندی است

عالمِ سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگِ آرزو، ہجر میں لذتِ طلب

گرمیٔ آرزو فراق، لذتِ ہائے و ہو فراق
موج کی جستجو فراق، قطرے کی آبرو فراق

یہ ہے ایک مختصر سا خاکہ اس نظریۂ حیات کا جو اقبال نے ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ یہ فلسفی شاعر دنیا میں ایک ایسا دل لے کر آیا جو سوزِ حیات اور

دردِ کائنات سے لبریز تھا اور ایک ایسا دماغ جو زندگی کے اسرار و معارف کا محرم تھا۔ اس نے دنیا کو ایسی حالت میں پایا کہ مشرق خصوصاً اسلامی مشرق جو اب تک خواب غفلت میں مدہوش تھا۔ کسمسا کر کروٹ بدلنا چاہتا ہے مگر غلامی کا کابوس جو اس کے دل و دماغ پر مسلط ہے اسے ہلنے نہیں دیتا، مغرب جس نے اپنی بیدار مغزی سے ربع مسکون پر اپنا سکہ بٹھا لیا ہے، طمع و نخوت کے نشے میں چور، انقلاب کی ان قوتوں سے جو خود اس کے اندر سے ابھر رہی ہیں ٹکرایا چاہتا ہے۔ اس کا دل کڑھا ایشیا کی بے حسی اور بے بسی پر جو قعر مذلت میں گرفتار ہے۔ اور کچھ نہیں کرتا اور یورپ کی نا عاقبت اندیشی پر جو قعر ہلاکت میں گرنے والا ہے اور کچھ نہیں دیکھتا، اس نے ایک کی بے عملی اور دوسرے کی بے بصری کے اسباب پر غور کیا اور اس کی حقیقت میں نظر سطحی چیزوں سے گذرتی ہوئی ان تصورات حیات پر جا کر پڑی جن پر ان دونوں تہذیبوں کی بنیادیں قائم ہیں۔ اس نے دیکھا کہ ایشیا کے قوائے ذہنی کو ماؤف اور اس کے دستِ عمل کو شل کرنے والا نفیِ خودی اور نفیِ کائنات کا فلسفہ ہے۔ اب رہا یورپ تو اس میں شک نہیں کہ اس نے اثبات خودی کی اہمیت کو سمجھ کر میدانِ عمل میں قدم بڑھایا۔ اور فرد و جماعت کے ربط سے اپنی زندگی کو استوار بنایا لیکن چونکہ اس ربط کی بنیاد کسی عالمگیر روحانی عقیدے پر نہیں بلکہ نسل و وطن کے تنگ مادی نظریے

پر کھی اس لئے بہت جلد اس کے اندر انتشار کی قوتیں نمودار ہو گئیں۔ صحیح
نصب العین اقبال کے نزدیک اسلام کا ہے جس نے ایشیا کی روحانیت
اور یورپ کی عملیت کو سمو کر دنیا کو دینِ فطرت کی راہ دکھائی مگر گردشِ
زمانہ سے اسلام کے پیرو بھی وحدت وجود کے عقیدے کی بدولت
جو نفی خودی اور نفی کائنات کی تعلیم دیتا ہے، اسی غفلت و جمود کا شکار
ہو گئے جو ایشیا کی اور قوموں پر طاری تھا، اس کی سزا انھیں یہ ملی کہ
یورپ کی ذہنی اور سیاسی غلامی کی زنجیروں میں گرفتار ہو کر ذلت کی
زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان حقائق کو سمجھنے اور سمجھانے کے بعد اقبال اپنے
جاں بخش اور جاں فزا نغمۂ امید سے ملت اسلامی کو غفلت سے جگاتا
ہے تاکہ وہ اس خدمت کو جو خدا نے اس کے سپرد کی ہے، پورا کرے اور
دنیا کو اس روحانی اور مادی ہلاکت سے جو آج چاروں طرف منڈلا رہی
ہے، نجات دے۔ اقبال کی نظر مشرق و مغرب میں ایک زبردست
سیاسی اور اقتصادی انقلاب کے آثار دیکھتی ہے اور اسے صحیح راہ
پر لگانے کے لئے وہ پہلے مسلمانوں کے اور پھر کل اقوام عالم کے قلوب
میں ایک روحانی انقلاب پیدا کرنا چاہتا ہے۔ وہ دنیا سے اٹھ گیا۔
مگر اس کا پیام فضائے عالم میں گونج رہا ہے اور گونجتا رہے گا۔

مسعود مرحوم کی زندہ دِلی

سرسید مرحوم کے خطوں اور مضمونوں میں خواجہ میر درؔد کا یہ شعر جابجا نظر آتا ہے۔

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مرجائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سیرتِ انسانی کا یہ عارف زندہ دلی کو اصلِ زندگی سمجھتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ سرسید اور ان کے ساتھیوں میں زندہ دلی کی صفت بدرجۂ کمال موجود تھی اور اسی کی بدولت وہ اس عام افسردگی اور مایوسی سے محفوظ رہے جو ان کے زمانے میں سارے ہندوستان پر چھائی ہوئی تھی۔ ہمارے قرن میں اس صفت کا جیتا جاگتا نمونہ مسعود مرحوم کی ذات تھی جسے تین مہینے ہوئے موت کے بے رحم ہاتھوں نے ہم سے چھین لیا۔
پستی کے دور کی یہ خصوصیت ہے کہ بلند الفاظ کا مفہوم بھی پست ہو جاتا ہے۔ چنانچہ زندہ دلی کا لفظ ہمارے یہاں بہت سطحی معنی میں استعمال ہونے

لگا ہے۔ آج کل عرفِ عام میں زندہ دل اس شخص کو کہتے ہیں جس کے دل میں عیش و عشرت کی نئی نئی لہریں اٹھتی ہیں۔ جس کے دماغ کو تفریح اور تفنن کی نئی نئی ترکیبیں سوجھتی ہیں۔ جس کی زندگی کا اصول یہ ہے کہ طرح طرح کی لذتوں کا لطف اٹھاتا رہے۔ یار دوستوں کی صحبتوں میں ہنستا ہنساتا رہے۔ اور فکر و تردد کو پاس نہ پھٹکنے دے۔ گویا زندہ دلی لاابالی پن، تفریح پسندی یا رہباشی اور بے فکری کا نام ہے۔

مگر حقیقت میں زندہ دلی کا مفہوم جس کی طرف خواجہ میر دردؔ کے شعر میں اشارہ ہے اس سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ سچ پوچھیئے تو یہ لفظ تہذیب و شائستگی کی بنیادی صفات پر حاوی ہے۔ ذکاوتِ حس، وسعتِ ذوق، احساسِ تناسب یا ظرافت، انس و ہمدردی، اثر آفرینی اور رجائیت وہ اخلاقی اور ذہنی عناصر ہیں جن کی ترکیب سے حقیقی زندہ دلی وجود میں آتی ہے۔

مسعود مرحوم میں زندہ دلی کی یہ صفات کس حد تک موجود تھیں یہی اس مختصر مضمون میں دکھانا مقصود ہے۔

مجھے مرحوم کی زندگی کا صرف آخری دور دیکھنے کا موقع ملا۔ جو علی گڈھ اور بھوپال میں گذرا۔ پہلی ملاقات ان سے ۲۰ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو دہلی کے اسٹیشن پر ہوئی جب وہ مولوی عبدالحق صاحب اور مولوی محی الدین صاحب کی رفاقت میں حیدرآباد سے آئے تھے اور مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری کا جائزہ

لینے کے لئے علی گڈھ جا رہے تھے۔ مولوی عبدالحق صاحب کے اصرار سے میں بھی اس پارٹی کے ساتھ ہو لیا۔ راس مسعود کی کیفیت اس وقت اس مسافر کی سی تھی جو مدتوں عالمِ غربت میں زندگی بسر کرنے کے بعد وطن کو واپس جا رہا ہو۔ جذبۂ بے اختیار شوق نے ان پر وارفتگی کا عالم طاری کر دیا تھا۔ پچیس تیس سال پہلے کا علی گڈھ ان کی نظروں میں پھر رہا تھا۔ حافظہ اور تخیل محبت کے فیضان سے مصوری کا کمال دکھا رہا تھا۔ ایک ایک شخص، ایک ایک چیز کا ذکر اس وضاحت سے کر رہے تھے گویا زمانے کے پردے اُٹھ گئے ہیں اور ماضی حال بن کر آنکھوں کے سامنے آگیا ہے۔ پھر نہ معلوم کیونکر گفتگو کا رخ بدل گیا۔ بادۂ شبینہ کا نشہ کافور ہو گیا۔ صبحِ حقیقت کا خمار باقی رہ گیا۔ لیکن اس خمار میں بھی سرخوشی اور سرمستی کا زور شور تھا۔ ایک جوش و خروش کے عالم میں وہ اپنا اعلیٰ تعلیم کا نصب العین مسلم یونیورسٹی کی موجودہ مشکلات اور ان کے حل کرنے کی تدابیر بیان کر رہے تھے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ شاید اس شخص نے عمر بھر تعلیمی مسائل پر غور کیا ہے۔ یہی خیالات اس کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے ہیں۔ ان کے سوا کسی اور خیال کی گنجائش ہی نہیں ہے۔

مگر بعد کی ملاقاتوں نے اس پہلے تاثر کی اصلاح کر دی۔ معلوم ہوا کہ یہ ماہرِ تعلیم اور مدبرِ تعلیم ایک جید ادیب اور نکتہ سنج نقاد بھی ہے۔ شعر و سخن کا حسن شناس

آرٹ کا مبصر، جسمانی تربیت اور ورزشی کھیلوں کا شائق بھی، قدیم تمدن کے بہترین عناصر کا وکیل بھی ہے۔ اصلاحِ معاشرت اور تجدیدِ تہذیب کا حامی بھی۔

ادب اور شاعری میں مرحوم جو پاکیزہ ذوق اور وسیع نظر رکھتے تھے وہ میں نے بہت کم لوگوں میں پائی۔ اردو ادب میں اہلِ زبان کی شان سے، فارسی، انگریزی، فرانسیسی ادب میں زبان داں کی حیثیت سے اور دوسری زبانوں کے ادب میں ترجموں کے ذریعہ سے انھیں اتنا دخل تھا کہ اختلافاتِ صورت کے حجاب کو دور کر کے وہ اس روحِ معنی کا مشاہدہ کر سکتے تھے جو ادب عالم میں جلوہ گر ہے۔ ان کا معیارِ تنقید بہت بلند تھا اس لئے کہ ان کی نظر سطحی اور مقامی قدروں پر نہیں بلکہ بنیادی اور عالمگیر قدروں پر رہا کرتی تھی۔ مطالعے کا شوق اس قدر تھا کہ انتہائی مصروفیت کے زمانے میں بھی اس کے لئے وقت نکال لیتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس روحانی غذا کے بغیر ان کی زندگی محال ہے۔ ہندوستان اور یورپ کی تازہ ترین تصانیف برابر پہنچتی رہتی تھیں۔ احباب کو اچھی کتابیں تحفے کے طور پر دینا ان کا خاص معمول تھا شاید ہی ان کا کوئی دوست ہو جس کے پاس ان کی محبت کی یہ یادگاریں موجود نہ ہوں۔

اردو، فارسی، انگریزی کے چوٹی کے شعراء کا منتخب کلام مرحوم کو بکثرت یاد تھا۔ شعر پڑھتے وقت ان پر ایک وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی، روح کا اہتزاز

جھلکتا تھا۔ اثر میں ڈوبی ہوئی آواز سننے والوں کے دل میں اتر کر انہیں مسحور کر دیتی تھی۔ پھر جب شعر کی تفسیر و تنقید پر آتے تھے تو خوش بیانی کا دریا بہا دیتے تھے۔ نقادی کے باریک نکتے جو دوسروں کے بیان میں خشک علمی مسائل معلوم ہوتے ہیں، اُن کی زبان سے دلچسپ لطائف بن کر نکلتے تھے۔

آرٹ کے دوسرے شعبوں سے مرحوم کو جو لگاؤ تھا وہ میری دیکھی ہوئی نہیں بلکہ سنی ہوئی بات ہے۔ ان کا بھوپال اور علی گڈھ کا زمانہ جس سے مجھے واقفیت ہے ایسے ماحول میں بسر ہوا جہاں اس ذوق تسکین کا کوئی سامان اور اس کے اظہار کا کوئی موقع نہ تھا۔ مگر ان کے پرانے دوستوں سے سنا ہے کہ جیسا ستھرا اور پاکیزہ مذاق ان کا شعر و ادب میں تھا ویسا ہی اور فنون لطیفہ میں تھا۔ خصوصاً موسیقی ان کی دلچسپی کا خاص موضوع تھی۔ قیاس بھی کہتا ہے کہ مشرق و مغرب کے گلشنِ تہذیب کا یہ گلچیں اپنے دامن میں سبھی رنگ کے پھول رکھتا ہوگا۔

قدیم یونانیوں کے ہاں آرٹ اور ادب کے ساتھ جسمانی تربیت بھی تہذیب نفس کا ایک اہم جز سمجھی جاتی تھی اور یورپ میں آج بھی ایک حد تک سمجھی جاتی ہے۔ لیکن اس "جسمانیت" سے ہم ہندوستانیوں کی "روحانیت" ابھی تک مانوس نہیں ہوئی ہے۔ بچوں اور نوجوانوں کے لئے تو ورزشی کھیلوں کی ضرورت تھوڑی بہت تسلیم کی جاتی ہے مگر بزرگوں کی شان ان لغویات سے کہیں بالاتر ہے۔ راس مسعود ان بزرگوں میں سے نہ تھے۔ ان کو جو شغف ورزشی کھیلوں سے

طالب علمی میں تھا (آکسفورڈ کی تعلیم کے زمانے میں وہ چوٹی کے اسپورٹس مین" سمجھے جاتے تھے) وہ آخر تک باقی رہا۔ علی گڑھ آنے سے پہلے انہوں نے اپنی صحت کی خرابی کی وجہ سے خود کھیلنا چھوڑ دیا تھا۔ صرف کبھی کبھی شریک ہو جایا کرتے تھے۔ لیکن کھیلوں سے ان کی دلچسپی کا یہ حال تھا کہ جب کبھی یونیورسٹی میں کوئی بڑا میچ ہوتا تھا تو سو کام چھوڑ کر دیکھنے کے لئے پہنچ جاتے تھے اور اپنے جوش اور انہماک سے کھیل والوں کا دل بڑھاتے تھے۔ ان کی ہمت افزائی نے علی گڑھ کے کھلاڑیوں کی پرانی روایات کو جو برسوں سے مردہ ہو چکی تھیں دوبارہ زندہ کر دیا۔

راس مسعود کی تعلیم و تربیت زیادہ تر انگلستان میں ہوئی۔ اور ان کی عمر کا وہ حصہ جس میں ذہن اور سیرت کی تشکیل ہوتی ہے انگریزوں کی صحبت میں گذرا۔ لیکن ان کی طبع سلیم نے بیرونی تمدن کا اثر ایک مناسب حد سے زیادہ قبول نہیں کیا۔ ان کی شخصیت کی تصویر میں مشرق اور مغرب کے رنگ ایک دوسرے میں کھپ گئے تھے۔ مگر زمین خالص مشرقی تھی۔ مروت، صلہ رحم مہمان نوازی، سیر چشمی، وضع داری، رکھ رکھاؤ جو ہندوستان کے مسلمان شرفا کی قدیم صفات ہیں ان میں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ مغربی تہذیب کے اچھے اور کھرے عناصر کو انہوں نے غیر محسوس طور پر جذب کر لیا تھا لیکن اس کے سطحی پہلو کی تقلید سے جو تکلف اور تصنع ہمارے تعلیم یافتہ طبقے میں پیدا ہو جاتا ہے

اس سے ان کا دامن بالکل پاک تھا۔ انہیں اپنی ہندوستانیت پر فخر تھا اور ہر موقع پر اس کا اظہار کرتے تھے۔ انگریزوں اور انگریز نما ہندوستانیوں کی صحبت میں "اٹکیٹ" کے رسوم و قیود کو عمداً توڑنے میں انہیں خاص لطف آتا تھا۔ اور ایسے موقعوں پر ان حضرات کی برہمی اور بدحواسی اور مرحوم کا سکون و اطمینان اور اظہار معصومیت دیکھنے کے قابل ہوتا تھا۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ ہندوستانی تہذیب اور تمدن کی خرابیوں کو تسلیم نہیں کرتے تھے اپنی قوم کے تعصب، تنگ دلی اور تاریک خیالی کا نکتہ چیں ان سے بڑھکر کوئی نہ ہوگا۔ ہندوستانی خصوصاً مسلمان عورتوں کے حال زار، ان کی جہالت، بے مائگی اور بے بسی پر جس میں اسلام کو بدنام کرنے والے مردوں نے انہیں مبتلا کر رکھا ہے، ان کا دل ہمیشہ کڑھا کرتا تھا اور جب کبھی اس موضوع پر گفتگو کرتے تھے تو غم و غصہ سے بے تاب ہو جاتے تھے۔ لڑکیوں کی موجودہ تعلیم جو انہیں مغربی سوسائٹی کی رنگین "تتلیوں" کا سستا نمونہ بنا دیتی ہے۔ مرحوم کو بالکل پسند نہ تھی اور اس کی مذمت میں وہ ہندوستان کے قدامت پسندوں کے ہم زبان تھے مگر ان کی صحیح اور مکمل تعلیم و تربیت کی حمایت میں یورپ کے آزاد خیالوں سے بھی دو قدم آگے تھے۔

غرض ہنگامۂ زندگی کی کوئی تحریک، فضائے دہر کی کوئی ہوا ایسی نہ تھی جو ان کے ساز دل کے تاروں کو پوری قوت سے نہ چھیڑتی ہو۔ انسانی تمدن کا

کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جو ان کے ذہن کو شدت سے متاثر نہ کرتا ہو یہی کادت احساس اور وسعتِ ذوق سچی زندہ دلی کی بنیاد ہے۔

حساس طبیعت اور وسیع ذوق کو اگر بے روک ٹوک چھوڑ دیا جائے تو انسان کا ذہن ڈانواں ڈول ہو کر رہ جاتا ہے اور اس میں ضبط و توازن باقی نہیں رہتا۔ اس کی روک احساسِ تناسب سے ہوتی ہے۔ جسے ظرافت بھی کہتے ہیں۔ ظرافت اور مسخرے پن میں یہ فرق ہے کہ ظریف ہر غیر متناسب چیز سے، ہر قسم کے بے تکے پن اور بھونڈے پن سے فوراً کھٹک جاتا ہے اور اس کی ہنسی اڑاتا ہے اور مسخرا جان بوجھ کر بے تکی اور بھونڈی حرکتیں کرتا ہے اور دوسروں کو اپنے اوپر ہنسواتا ہے۔ ظرافت کے لئے علاوہ ذہانت کے ذہنی آزادی اور ہمت کی بھی ضرورت ہے۔ یہ ایک خدا داد نعمت ہے جو بہت کم لوگوں کے حصہ میں آتی ہے۔ مسعود مرحوم کو اس نعمت سے بہرۂ وافر عطا ہوا تھا۔ فضیلت مآبوں کا اظہارِ قابلیت، مدعیانِ زہد و اتقا کی ریاکاری، جاہ پرستوں کی خود نمائی اور ضمیر فروشی غرض سازِ زندگی کا ہر خارج از آہنگ نغمہ ان کی طبعِ سلیم پر گراں گذرتا تھا اور وہ اس کی پردہ دری کئے بغیر نہ رہتے تھے۔ بننے والوں کو بنانے میں انہیں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ اور اس کام کو اس نزاکت اور لطافت سے انجام دیتے تھے کہ اکثر اس غریب کو جو ان کی ستم ظریفی کا نشانہ ہوتا تھا، یہ پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ اس پر مشقِ ستم کی جا رہی ہے۔ البتہ کبھی کبھی دوسرے شریکِ بزم جن کا ظرف ظرافت

اس پیمانے پر نہ تھا، بھبک اٹھتے تھے اور ان کے قہقہے رازِ پنہاں کو آشکارا کر دیتے تھے۔ ظریفانہ مبالغے کو مرحوم نے آرٹ کی حد تک پہنچا دیا تھا۔ ایک معمولی سے واقعہ کو اس اہتمام سے بیان کرتے تھے اور شوخیٔ تخیل سے ایسے ایسے جوڑ لگاتے تھے کہ ان کی گفتگو میں مارک ٹوین کے ناولوں کا لطف آجاتا تھا۔ ان خوش وقتیوں کی یاد ان کے دوستوں اور قدردانوں کے دل پر تیر کی طرح لگتی ہے۔

مرحوم کا حلقۂ احباب بے حد وسیع تھا۔ اور اس میں ہر ملک و قوم اور ہر مذہب و ملت کے لوگ شامل تھے۔ ہندوستان کے علاوہ انگلستان، فرانس جرمنی، ترکی اور جاپان میں کثرت سے ایسے لوگ موجود ہیں جو ان کے سچے دوستوں میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔ جس سے جیسے تعلقات تھے انہیں وہ عمر بھر نبھاتے رہے اپنے بزرگوں کے دوستوں کو وہ اپنا بزرگ سمجھتے تھے۔ اور ان کا انتہائی ادب و احترام کرتے تھے۔ برابر والوں سے بے تکلفانہ خلوص اور چھوٹوں سے مربیانہ شفقت سے پیش آتے تھے۔ ان کی دوستی محض یارباشی نہ تھی کہ دو گھڑی مل بیٹھنے اور ہنسنے بولنے تک محدود ہوتی، اس کی بنیاد انس و ہمدردی کے گہرے جذبات پر قائم تھی۔ دوست کے رنج و راحت میں دل سے شریک ہوتے تھے، اس کی فلاح کو اپنی فلاح اور اس کے کام کو اپنا کام سمجھتے تھے۔ دوستوں ہی پر موقوف نہیں جو کوئی بھی ان کے پاس چلا آئے اس کی ہمدردی اور مدد میں دریغ نہیں کرتے تھے۔ غمزدوں کی داستانِ درد سن کر تڑپ اٹھتے تھے اور ان کے دکھ کے دور کرنے

ہیں جہاں تک ان کی طاقت میں تھا دامے، درمے، قدمے، قلمے، سخنے سعی کرتے تھے۔ خصوصاً طالبعلموں کے لئے تو ان کے گھر کا دروازہ اور ان کے دل کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ کوئی شمار نہیں ان لوگوں کا جن کی مرحوم نے درماندگی میں دستگیری کی، دردمندی میں چارہ سازی کی۔ جن کی بگڑی ہوئی زندگی کو اپنی توجہ سے بنا دیا۔ ظاہر ہے کہ ان کی فیض رسانی کے وسائل محدود تھے، ہر شخص کی حاجت روائی ان کے امکان میں نہ تھی۔ لیکن ان کی دلسوزی اور ہمت افزائی کی کوئی حد نہ تھی۔ اگر کوئی باوجود ان کی انتہائی کوشش کے، ان کی عملی امداد سے محروم بھی رہ جائے، تو بھی ان کے پاس سے خالی ہاتھ نہیں لوٹتا تھا۔ بلکہ امید عزم اور اعتمادِ نفس کی دولت سے مالا مال ہو کر۔

یہ تقویت اور ہمت افزائی اس اثر آفرینی کا ایک پہلو ہے جو ان کی زندہ دلی کا ایک اہم عنصر تھی۔ زندگی کی جو حرارت ان کے سینے میں تھی اس سے افسردہ دلوں کو گرما دیتے تھے۔ راکھ کے ڈھیروں میں آگ لگا دیتے تھے۔ جس وقت وہ علی گڑھ میں وائس چانسلر ہو کر آئے، مسلم یونیورسٹی ایک شہرِ خموشاں معلوم ہوتی تھی۔ ان کے آتے ہی درس و تدریس میں، علمی اور ادبی انجمنوں میں، معاشرتی صحبتوں میں، ورزشی کھیلوں میں، غرض طلبہ اور اساتذہ کی زندگی کے ہر شعبہ میں جان پڑ گئی اور ہر طرف ہنگامۂ حیات برپا ہو گیا۔ کمال یہ ہے کہ بھوپال جیسے اونگھتے ہوئے شہر میں جس کی نیم خوابی اگر

کبھی ٹوٹتی تھی تو اہل شہر کی سطحی اور کھوکھلی سیاسی تحریکوں سے، مرحوم کے دم سے ذہنی بیداری اور علمی اور ادبی سرگرمی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔

غرض زندہ دلی کی اکثر صفات جو ایک اثر پذیر اور اثر آفریں شخصیت کے بنانے میں اجزائے ترکیبی کا کام دیتی ہیں، ان کی ذات میں موجود تھیں مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ایک صفت جو اس شخصیت کی تکمیل کے لئے ناگزیر ہے، ان میں نہیں تھی یا یوں کہنا چاہیئے کہ باقی نہیں رہی تھی۔ وہ چیز جو فرد کی قوتوں کو ایک مرکز پر جمع کر کے ان کی کامل نشو ونما میں مدد دیتی ہے اور انہیں حیاتِ قومی کے لئے پوری طرح کار آمد بناتی ہے، 'رجائیت' ہے۔ اور یہ انسان میں اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اس کے سامنے نہ صرف اپنی انفرادی زندگی کا بلکہ اپنی قوم کی اجتماعی زندگی کا بھی، ایک مکمل نصب العین موجود ہو اور وہ اس پر دل سے عقیدہ رکھتا ہو۔ یہ ایک المناک حقیقت ہے کہ اس چیز سے واقعات وحالات نے راس مسعود کو محروم کر دیا تھا۔ جس زمانے میں مرحوم عملی زندگی میں داخل ہوئے مسلمان بے اصولی اور بے عملی کے بڑے خطرناک دور سے گذر رہے تھے جو اب تک ختم نہیں ہوا ہے۔ سرسید اور ان کے ساتھیوں نے اپنی قوم کے مستقبل کا جو نقشہ بنایا تھا اُسے زمانے کے انقلاب نے بگاڑ دیا تھا۔ ان بزرگوں کو امید تھی کہ مسلمانوں کا اعلیٰ اور متوسط طبقہ سلطنت برطانیہ کے سایۂ عاطفت میں مغربی تعلیم اور مغربی تہذیب کے بہترین عناصر سے فائدہ اٹھائے گا اور مذہب اسلام کی بنیاد پر ملّت اسلامی کی

نشاۃ ثانیہ کی عمارت کھڑی کر دے گا۔ مگر نصف صدی کے تجربے نے اس امید کو غلط ثابت کر دیا۔ برادرانِ وطن نے تو مغربی تہذیب کے گہرے اور حیات بخش اثرات کو جذب کر لیا اور ان سے متاثر ہو کر قومیت اور آزادی کی تحریک شروع کی جو اوپر سے نیچے تک ہر طبقے میں نفوذ کر گئی، مگر مسلمان مغربیت کے صرف ظاہری اور سطحی پہلو پر قانع رہے، اُن کا مغرب زدہ تعلیم یافتہ طبقہ جمہور مسلمین سے بے تعلق ہو گیا اور اس کی اجتماعی زندگی کا درخت جڑ سے الگ ہو کر خشک ہونے لگا۔ ادھر سلطنت برطانیہ کا سایۂ عاطفت جو نئی ایشیائی تحریک آزادی کی چڑھتی ہوئی دھوپ کی تاب نہیں لا سکتا تھا رفتہ رفتہ پیچھے ہٹنے لگا اور اس کا رخ ان کی طرف سے پلٹ گیا۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے مسعود مرحوم کے پیشِ نظر ابتدا میں وہی نصف صدی پہلے کا نصب العین تھا۔ ان کی زندگی کا جو حصہ سرکار برطانیہ اور دولت آصفیہ کی ملازمت میں گذرا اس میں وہ ہندوستان کی سیاست سے جو نیا چولا بدل رہی تھی، بالکل الگ رہے اور خالص علمی اور تعلیمی مشاغل میں زندگی بسر کرتے رہے۔ جب وہ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو کر علی گڈھ آئے تو انہیں پہلے پہل اس سیاسی طوفان سے جو بحر مواج کی طرح امڈ رہا تھا اور جس سے مسلمانوں کا یہ تعلیمی قلعہ بھی طرح طرح کی پشتہ بندیوں کے باوجود پوری طرح محفوظ نہ تھا، سابقہ پڑا۔ وہ اپنے ساتھ سرسید کی روایات لے کر

آئے تھے۔ جن کا اصل اصول یہ تھا کہ اپنی خودداری اور وقار کو قائم رکھتے ہوئے حکومت وقت سے اتحادِ عمل کیا جائے۔ لیکن یہاں پہنچ کر اس تلخ حقیقت کا انکشاف ہوا کہ یارانِ طریقت نے عجز و نیاز نہ بہ تملق کا طریقہ اختیار کر رکھا ہے۔ انہوں نے اس رنگ کو بدلنا چاہا لیکن اس میں انہیں ایک طرف سرکار اور دوسری طرف سرکار پرستوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ یہی وہ وقت تھا جب ان کی آنکھوں سے پردے ہٹ گئے اور وہ نصب العین جو اب تک ان کے سامنے تھا محض فریب نظر ثابت ہوا۔ ان کی رقابتوں، سازشوں اور ریشہ دوانیوں کو، جن میں وہ چاروں طرف سے گھرے ہوئے تھے۔ ان کی حساس طبیعت برداشت نہ کر سکی اور آخر تنگ آکر انہوں نے علی گڈھ کی ہنگامہ خیز زندگی کو خیرباد کہی اور بھوپال کے گوشۂ عافیت میں پناہ گزیں ہو گئے۔

قومی زندگی کے اس مختصر تجربے نے انہیں مسلمانوں کے مستقبل کی طرف سے مایوس کر دیا تھا۔ ان کی فطری رجائیت ماحول کی ناگوار حقیقتوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی تھی اور اس کی جگہ گہری قنوطیت نے لے لی تھی۔

لیکن ان کی سیرت کا ارتقا ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ لوگ انہیں برابر قومی زندگی کی طرف کھینچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ بظاہر انکار کرتے تھے لیکن ان کا دل ادھر کھنچ رہا تھا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اگر وہ ایک بار بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا کہہ کر اپنی کشتی اس دریائے بے پایاں، اس طوفانِ موج افزا میں

ڈال دیتے، ایک مدت تک موجوں کے جھکولے کھاتے، تند و تیز ہواؤں کے تھپیڑے سہتے تو ایک دن ساحلِ مراد تک نہ پہنچ جاتے۔

اک عمر چاہیئے کہ گوارا ہو نیشِ عشق

افسوس یہ عمر انہیں نصیب نہ ہوئی اور ان کا قطرۂ حیات گوہر یگانہ بننے سے پہلے نہنگِ اجل کا طعمہ بن گیا۔

کاش زندہ دلی کی یہ تصویر جو میں نے ان صفحات میں پیش کی ہے مکمل ہو جاتی، شاید اسی سے مسلمانوں کی قومی زندگی کا نقشہ بدل جاتا۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

حالیؔ

حالیؔ مرحوم کی زندگی کے حالات یا تو اس مختصر یادداشت میں ملتے ہیں جو انھوں نے خود مرتب کی تھی اور جو مکتوباتِ حالیؔ اور مقالاتِ حالیؔ کے ساتھ شائع ہوئی یا اس چھوٹے سے رسالہ میں جو محمد امین زبیری صاحب نے لکھا ہے۔ امید ہے کہ اس موقع پر جب حالی صدی کا جشن بڑی دھوم دھام سے منایا جارہا ہے ہمارے اہلِ قلم میں سے کوئی مولانا حالیؔ کی ایک مبسوط سیرت لکھنے کا ڈول ڈالے گا۔ ہماری آنکھیں مولوی عبدالحق صاحب کی طرف لگی ہوئی ہیں۔

ہم اس مضمون میں ایک سرسری خاکہ مولانا حالیؔ کی سیرت کا پیش کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ایک دھندلی سی ادھوری تصویر ہے جو مولانا کی نظم و نثر کو پڑھ کر اور ان کے حالات، اُن کے عزیزوں اور دوستوں سے سن کر ذہن میں قائم ہوگئی ہے۔

اس تصویر میں ایک معلم، ایک نقاد، ایک مصلح قوم کے خدوخال بھی موجود ہیں لیکن دل کی کیفیت جو آنکھوں سے جھلکتی ہے صاف کہہ رہی ہے کہ یہ ایک شاعر کا چہرہ ہے۔

شاعر کا مفہوم ہمارے ملک میں بہت محدود ہوگیا ہے، ہم ایک عرصہ سے

ایک خاص کینڈے کے شاعر دیکھتے آئے ہیں اور ہم نے سمجھ رکھا ہے کہ سب شاعر ایسے ہی ہوتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ شاعر کا ہیولا ایک ہے مگر تربیت کے فرق سے اس کی صورتیں دو ہو جاتی ہیں۔ وہ جوہر جو سب شاعروں میں عام ہیں یہ ہیں، تخیل کی تیزی، نظر کی باریکی، حسن اور تناسب کی پرکھ، احساس کی شدت خصوصاً محبت اور خودی کے جذبات کی فراوانی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ شاعر کس زمانے میں پیدا ہوتا ہے اور اسے ان جوہروں کی تربیت کے لئے کون سا میدان ملتا ہے۔

اگر زمانہ انتشار کا ہے، معاشرت کا شیرازہ بکھر چکا ہے۔ فرد کا رشتہ جماعت سے ٹوٹ گیا ہے، سب اپنے اپنے حال اور اپنی اپنی فکر میں ہیں تو شاعر بھی باہر کی دنیا سے آنکھ بند کر کے اندر کی دنیا میں ڈوب جاتا ہے۔ اس کا تخیل اور اس کا مشاہدہ نفس کے دائرے کو اپنی جولانی کے لئے تنگ پاتا ہے تو اس واردات کو جو اس کے قلب پر گذرتی ہے بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے اور اس میں نئی نئی باریکیاں پیدا کرتا ہے۔ یہاں تک کہ مشاہدے کی قید ہی ٹوٹ جاتی ہے۔ محض خیال کے جادو سے وہ ایک طلسمِ حیات باندھتا ہے۔ اور اسی میں مگن رہتا ہے۔ اس کی نظریں حسن اور تناسب کو ڈھونڈتی ہیں مگر وہ عالمِ فطرت اور عالمِ معاشرت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا بلکہ اپنے مذاق کے مطابق ایک خیال لے کر حسن تراشتا ہے۔ اور اس کی خفیف سی جھلک کسی انسان میں دیکھ کر اسے اپنا معشوق بنا لیتا ہے۔ محبت کا جذبہ جس کی وسعت نامحدود ہے سمٹ کر اسی ایک مرکز پر قائم ہو جاتا ہے

اور اس کی شدت بہت بڑھ جاتی ہے۔ وہ اور تمام جذبات کو اپنے رنگ میں رنگنا اور شاعر کی ساری زندگی پر چھا جانا چاہتا ہے۔ مگر خودی کا جذبہ جو اس انانیت کی فضا میں پھیل کر خود پرستی کی حد تک پہنچتا ہے۔ محبت یا عشق کا حریف مقابل بن جاتا ہے۔ عشق اور خودی کی اس کشمکش سے شاعر کی نفسی زندگی میں ایسے پیچ پڑ جاتے ہیں جو کھولے نہیں کھلتے۔ وہ وارفتہ مزاج، بے چین اور چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ وہ شدت سے محبت کرتا ہے اور اس سے زیادہ شدت سے شکایت کرتا ہے جب معشوق اس پیکرِ خیال سے مختلف ثابت ہوتا ہے جو اس کے ذہن میں ہے۔ جب اصلی زندگی طلسمی زندگی سے ٹکراتی ہے تو وہ کڑھتا ہے، مچلتا ہے۔ فریاد کرتا ہے۔ اس کی وضع نفسی کی پیچیدگی، اس کے جذبات کا انتشار اور شدت اس کے اسلوب بیان میں پیچیدگی، مبالغہ اور بے ربطی پیدا کر دیتی ہے۔ اردو شاعری نے اگر پہلے نہیں تو انیسویں صدی کے شروع سے یہی رنگ اختیار کر لیا تھا۔ جو لوگ اس صدی میں پیدا ہوئے انھوں نے آنکھ کھول کر دیکھا تو انھیں صرف اسی قسم کی شاعری اور اسی قسم کا شاعر نظر آیا۔ کسی اور طرز کے شاعر کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ اگر زمانہ موافق ہو، روحِ اجتماعی زندہ ہو۔ افراد کا رابطہ حیات و کائنات سے قائم ہو۔ شاعر کی خلقی صفات کو نشو و نما کا موقع ملے تو وہ کچھ اور ہی چیز ہو جاتا ہے۔ تخیل کی تیزی مشاہدے کی وسعت کے ساتھ مل کر اسے خدا کی دنیا اور انسان کی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر دکھاتی ہے۔ اس وسیع جلوہ گاہ

میں اسے حسن و تناسب کا حقیقی جلوہ، حسنِ صورت اور حسن معنی کا صحیح امتزاج نظر آتا ہے۔ وہ فطرت کی ہم آہنگی اور معاشرت کے توازن سے آشنا ہوتا ہے تو اس کے جذبات میں بھی ربط ضبط اور اعتدال پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کا جذبۂ محبت نوعی ہمدردی کے ساتھ مل کر اس قدر وسعت حاصل کرتا ہے کہ دوستی، اصلۂ رحم حب وطن حب انسان سب پر حاوی ہو جاتا ہے اور اگر وہ حبِ الٰہی کا حوصلہ کرے تو اسے زیب دیتا ہے۔ شاعر کی خودی کو یہ عالمگیر محبت کاٹ چھانٹ کر سنوارتی ہے۔ انانیت کے کانٹے نکل جاتے ہیں۔ خودداری، غیرت، اعتمادِ نفس کے پھول باقی رہ جاتے ہیں۔ زندگی اور خیالات کی حقیقت اور ہم آہنگی اسلوبِ بیان سے سادگی اور سچائی بن کر ٹپکتی ہے۔ یہ شاعر متین، خوش مزاج، منکسر اور بردبار ہوتا ہے۔ وہ نقشِ انسانی، عالمِ معاشرت، عالمِ فطرت کے حقائق کو ہمدردی کی نظر سے دیکھتا ہے اور دوسروں کو دکھاتا ہے۔ درد و سوز اسی کا حصہ ہے اس لئے کہ اسے صرف اپنا ہی غم نہیں سارے جہان کا غم ہوتا ہے۔ عاشقی کا دعویٰ اسی کو پھبتا ہے اس لئے کہ وہ اپنی خودی کا عکس معشوق کی ذات میں نہیں ڈھونڈتا بلکہ معشوق کی حقیقی صفات کو دیکھ کر بے ساختہ اس کی طرف کھنچتا ہے۔

زندگی کی تلخیاں اسے بھی چکھنی پڑتی ہیں، محبت کی کڑیاں اسے بھی جھیلنی پڑتی ہیں۔ مگر وہ ضبط اور متانت کو ہاتھ سے نہیں دیتا۔ فریاد بھی کرتا ہے تو سادگی اور سچائی سے۔

شاعر کے اس تصور کو ذہن میں رکھ کر حالی کی زندگی پر نظر ڈالیے۔ خواجہ الطاف حسین حالی ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ باپ کا سایہ چھٹپن ہی میں سر سے اُٹھ گیا۔ بھائی بہنوں کی سرپرستی میں اس درِ یتیم کی پرورش ہوئی۔ حالی کو شروع سے "خود بخود تعلیم کا شوق حد سے زیادہ تھا مگر باقاعدہ اور مسلسل تعلیم کا کبھی موقع نہیں ملا۔" پہلے پانی پت کے دستور کے مطابق کلام مجید حفظ کیا۔ اس کے بعد فارسی کی ابتدائی کتابیں اور عربی صرف و نحو پڑھی۔ ۱۷ برس کی عمر میں حالی کی شادی کردی گئی اور بظاہر ان کی تعلیم کا دروازہ بند ہو گیا۔

مگر علم کی لگن نے چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ حالی "گھر والوں سے روپوش ہو کر دلی چلے آئے اور ڈیڑھ برس وہاں رہ کر کچھ صرف و نحو اور کچھ ابتدائی کتابیں منطق کی پڑھیں۔ یہاں انھیں غالب کی صحبت میں بیٹھنے کا موقع ملا۔ مرزا کے فارسی اور اردو شعر جو سمجھ میں نہیں آتے تھے وہ ان سے حل کیا کرتے تھے اور ان کے چند فارسی قصیدے بھی ان سے پڑھے۔ شاعری کا جوہر جو فطرت نے حالی کی طبیعت میں ودیعت کیا تھا۔ غالب کے فیضِ تربیت سے ابھرنے لگا۔ ایک آدھ غزل اردو فارسی کی کہہ کر غالب کو دکھائی تو انھوں نے کہا "اگرچہ میں کسی کو فکرِ شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمھاری نسبت میرا خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے۔" سترہ اٹھارہ سال کی عمر کے لڑکے سے غالب جیسے جوہر شناس نے یہ بات کچھ دیکھ کر اور کچھ سمجھ کر کہی ہوگی۔

بزرگوں اور عزیزوں کے جبر سے حالی کو اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر پانی پت واپس جانا پڑا۔ حصار میں سرکاری ملازمت کے سلسلے میں داخل ہوئے۔ مگر ۱۸۵۷ء کی بدامنی میں گھر چلے آئے، کوئی چھ برس تک وہیں رہ کر "بغیر کسی ترتیب اور نظام کے کبھی منطق یا فلسفہ، کبھی حدیث، کبھی تفسیر" پڑھتے رہے۔

۱۸۶۳ء میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ رئیس جہانگیر آباد نے انھیں طلب کیا اور آٹھ برس تک نہایت شفقت اور محبت سے اپنے پاس رکھا۔ نواب صاحب اُردو اور فارسی کے خوش گو شاعر تھے۔ ستھرا اور پاکیزہ مذاقِ سخن رکھتے تھے۔ ہم مذاق مربی کی صحبت سے حالی کی شاعری چمک اٹھی۔ اس عرصہ میں وہ غالب سے اصلاح لیتے رہے مگر اس سے انھیں اتنا فائدہ نہیں ہوا جتنا نواب صاحب کی صحبت سے "وہ مبالغے کو ناپسند کرتے تھے اور سیدھی سچی باتوں کو محض حسنِ بیان سے دلفریب بنانا اسی کو منتہائے کمال شاعری سمجھتے تھے"۔

۱۸۶۹ء میں غالب نے وفات پائی۔ حالی نے اپنے شفیق استاد کا جو مرثیہ لکھا وہ ایک طرف ان کے کمال شاعری کا نمونہ ہے تو دوسری طرف ان کی احسان شناسی اور عقیدتمندی کو ظاہر کرتا ہے جو شاعروں کے ہاں بہت کمیاب جنس ہے۔ غالب کی سیرت کا وہ نقشہ کھینچا ہے کہ اس سے بہتر تصویر ہماری نظم و نثر میں نہیں ملتی۔ یونانیوں کے ذہن میں جو تصور "انسانیت" کا تھا اس کی جھلک غالب کی ذات میں نظر آئی۔ اور اسے انھوں نے شعر کا جامہ پہنا کر شہرت دوام

بخش دی۔

منظہرِ شانِ حسنِ فطرت تھا معنیٔ لفظِ آدمیت تھا

یہ ایک شعر قصیدے سے کم نہیں۔

تھوڑے دن کے بعد نواب شیفتہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ حالی کو پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں جگہ مل گئی۔ یہاں ان کے ذمہ یہ کام تھا کہ جو ترجمے انگریزی سے اردو میں ہوں ان کی عبارت درست کر دیا کریں۔ لاہور کے اس چار برس کے قیام نے حالی کے مذاقِ ادب اور مذاقِ شعر کو بہت کچھ بدلا۔ انگریزی کتابوں کے ترجموں پر نظر ڈالنے سے حالی کی طبعِ سلیم نے وہ باتیں اخذ کر لیں جو لوگوں کو انگریزی ادب کی تحصیل میں عمریں کھپانے سے بھی حاصل نہیں ہوتیں۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ "نا معلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی لٹریچر خاص کر عام فارسی لٹریچر کی وقعت دل سے کم ہونے لگی۔ ادھر مولوی محمد حسین آزاد نے ایک مشاعرے کی بنیاد ڈالی۔ جو ہندوستان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نیا تھا اور جس میں بجائے مصرع طرح کے کسی مضمون کا عنوان شاعروں کو دیا جاتا تھا کہ اس عنوان پر اپنے خیالات جس طرح چاہیں ظاہر کریں۔"

حالی نے اس مشاعرے کے لئے چار نظمیں "برکھا رت"، "نشاطِ امید"، "مناظرۂ رحم و انصاف" اور "حبِ وطن" لکھیں۔ ۱۸۷۵ء یا ۱۸۷۶ء میں وہ لاہور سے دہلی اینگلو عربک اسکول کی مدرسی پر بدل آئے۔

یہ حالی کی زندگی اور ان کی شاعری کا پہلا دور ہے۔ ان کے اس زمانہ کے حالات بہت کم معلوم ہیں۔ ان کے مکتوبات میں جو شائع ہوئے ہیں ۱۸۶۸ء سے پہلے کا کوئی خط نہیں۔ ان کی نظم و نثر سے سوائے اس کے کہ ان کے جذبات و خیالات کا اندازہ ہو زندگی کے واقعات کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اس لئے کہ خودنمائی اور خود فروشی ان کا شیوہ نہیں تھا۔ جو کوئی حالی کی سیرت لکھے گا اسے اس دور کے حالات معلوم کرنے میں بڑی کرید اور تلاش سے کام لینا پڑے گا۔

پھر بھی جو کچھ معلوم ہو سکا اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حالی کی آدھی سے زیادہ عمر عسرت اور گمنامی میں کٹی۔ ان کی شادی خوشحال گھرانے میں ہوئی تھی مگر ان کی غیرت نے یہ گوارا نہ کیا کہ گھر کی روٹیاں توڑیں۔ ان کے بزرگوں کو اپنے علم و فضل کی وجہ سے سلطنت مغلیہ سے مدد معاش ملتی تھی۔ سلطنت کے زوال کے بعد حالی کے والد کو اور خود ان کو انگریزی حکومت کی نوکری کرنی پڑی۔ مگر زمانے کا رنگ بدل چکا تھا۔ مشرقی علوم کی قدر نہیں رہی تھی نئے حکمرانوں کے ہاں رسوخ حاصل کرنے کے لئے جن صفات کی ضرورت تھی ان سے حالی محروم تھے۔ اس لئے چھوٹے عہدوں سے آگے نہیں بڑھ سکے۔ مگر اس کے باوجود ان کے احباب میں چھوٹے بڑے سب ان کا احترام کرتے تھے۔

ان کے پاکیزہ اخلاق اور سیدھی سادی خاموش طبیعت میں کس غضب کا وقار ہوگا کہ غالب جیسا شخص اپنے نوجوان شاگرد کے آگے جھکتا تھا۔ ایک بار

کا ذکر ہے کہ حالی نے واعظانہ جوش میں نماز پنجگانہ کی فرضیت پر ایک لمبا چوڑا لکچر لکھ کر ان کے سامنے پیش کیا جس میں ان سے اس بات کی درخواست کی تھی کہ آپ کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر یا اشارے سے غرض جس طرح ہو سکے نماز پنجگانہ کی پابندی اختیار کریں۔" غالب کے پاس اس زمانے میں گمنام خط بہت آیا کرتے تھے۔ اور کھلم کھلا گالیاں تک دیتے تھے۔" حالی کی تحریر پڑھ کر برس پڑے۔ اپنی گنہ گاری کا اعتراف ایسے دلخراش الفاظ میں کیا جس سے انتہائی رنج و غصہ ظاہر ہوتا تھا۔ دوسرے روز انہوں نے حالی کو ایک غزل لکھ کر بھیجی جس میں نصیحت گری کا شکوہ تھا۔ حالی نے معذرت کے طور پر ایک قطعہ ان کی خدمت میں روانہ کیا اس کو پڑھ کر غالب نے ایک قطعہ شیفتہ کو بھیجا جن کے ساتھ حالی دہلی میں مقیم تھے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ غالب اور شیفتہ دونوں حالی سے کس قدر محبت رکھتے تھے اور ان کی کتنی عزت کرتے تھے۔

قطعہ

تو اے کہ شیفتہ و حسرتی لقب داری — ہمی بلطف تو خود را امیدوار کنم
چو حالی از من آشفتہ بے سبب رنجید — تو گر شفیع نہ گردی بگو چہ کار کنم
دوبارہ عمر دہندم اگر بفرض محال — براں سرم کہ دراں عمر ایں دو کار کنم
یکے ادائے عبادات عمر پیشینہ — دگر بہ پیشگہ حالی اعتذار کنم

حالی نے پھر انتہائی ندامت کے ساتھ معذرت کا قطعہ لکھا۔ آخر غالب نے

یہ کہہ کر کہ "بیت بحثی موقوف" اس قصہ کو ختم کیا۔ اس واقعہ سے حالی کے مذہبی جوش کا بھی پتہ چلتا ہے جو وہ اس عمر میں رکھتے تھے۔ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نصیحت کی رَو میں ادب کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جانے کا انھیں کتنا رنج ہوا۔

مگر زمانے کا اثر کس غضب کا ہوتا ہے کہ حالی جیسا جوان صالح شاعری کی محفل میں قدم رکھ کر وہی رنگیلا راگ گانے لگا جو وہاں چھڑا ہوا تھا۔ یہ زمانہ وہ زمانہ تھا کہ ہندوستان میں تمدن و معاشرت کے انتہائی تنزل کے ساتھ شاعری بھی پستی کی حد کو پہنچ گئی تھی، انفرادیت اور داخلیت کا رنگ جس کا ذکر ہم نے اس مضمون کے ابتدا میں کیا ہے۔ چھایا ہوا تھا۔ اور وہ بھی ایسا بگڑا ہوا رنگ جس نے اخلاق کے ساتھ ادب کو بھی بگاڑ دیا۔ داخلیت اور جذبات پرستی اشخاص میں یا قوموں میں جوانی کے ساتھ کھپ جاتی ہے۔ مگر خزاں عمر میں کسی طرح نہیں نبھ سکتی ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا سوجھے تو ایک بات ہے مگر کاتک کا اندھا ہرا ہی ہرا دیکھنا چاہے تو سمجھنا چاہیئے کہ عقل کی آنکھ سے بھی معذور ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کا شباب مدت ہوئی رخصت ہو چکا تھا۔ گردش روزگار نے ان کی کمر توڑ دی تھی مگر وہ جوان بننے کے شوق میں اکڑتے پھرتے تھے۔ ان کے دلولے سرد ہو چکے تھے۔ مگر ٹھنڈی گرمیاں ابھی تک چلی جاتی تھیں۔ جوانی کے نشے میں انسان خود بخود اپنے نفس کی کیفیات میں ڈوب کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا ہے لیکن جوانی کے گذر جانے کے بعد وہ کوشش کر کے یہ بے خبری پیدا کرنی چاہے تو

اس کے دو ہی طریقے ہیں یا تو وہ عیش و عشرت کے گرداب میں چکر کھاتا ہے یا ترکِ تجرد کے سراب میں لوٹا کرتا ہے۔ خود پرستی کی یہ دونوں راہیں لوگ اپنے اپنے مذاق کے مطابق اختیار کر رہے تھے۔ اکثر شعراء خراباتِ مغاں میں "بگیر و بنوش" کا شور مچا رہے تھے۔ اور بعض گوشۂ خلوت میں "بگذار و بگذر" کا نعرہ لگا رہے تھے۔

حالؔی کی طبیعت بالقوۃ انفرادیت اور داخلیت سے کوسوں دور تھی۔ مگر زمانے کے طوفان اور جوانی کے ہیجان نے انھیں بھی اس چکر میں ڈال دیا بعنوانِ شباب میں انسان کو پہلے پہل خود ہی اپنی جھلک دکھا کر چھپ جایا کرتی ہے اور وہ اس کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ پھر جب زمانے کی ہوا بھی اُسی رخ پر چل رہی ہو تو اس کی سرگشتگی کا کیا ٹھکانا! تاہم حالؔی کی صلاحیتِ طبع نے اور غالبؔ و شیفتہ کے فیضِ تربیت نے انھیں بہت کچھ سنبھالے رکھا۔ غالبؔ سے انھوں نے حسنِ تخئیل، ندرتِ فکر، شوخیٔ گفتار سیکھی اور شیفتہؔ سے بیان کی سادگی اور سلاست کا ذوق حاصل کیا۔ اردو اور فارسی کے قدیم استادوں میں سے یوں تو سبھی کے کلام کا مطالعہ انھوں نے کیا ہوگا مگر میرؔ، دردؔ اور سب سے زیادہ سعدؔی کا اثر ان کے اشعار میں نظر آتا ہے۔ اسی کی برکت ہے کہ غزل کے اس رنگ میں بھی، جو حالؔی نے محض عارضی محرکات کی بنا پر اختیار کیا تھا اور جس سے انھیں خلقی مناسبت نہیں تھی، ایسے ایسے شعر مل جاتے ہیں:-

قلق اور دل کا سوا ہو گیا ۔۔۔ دلاسا تمھارا بلا ہو گیا
دکھانا پڑے گا ہمیں زخمِ دل ۔۔۔ اگر تیر اُن کا خطا ہو گیا

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں ۔۔۔ مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں
قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح ۔۔۔ لگا دو آگ کوئی آشیاں میں
نیا ہے لیجیے جب نام اس کا ۔۔۔ بہت وسعت ہے میری داستاں میں

جو دل پہ گذرتی ہے کیا تجھکو خبر ناصح ۔۔۔ کچھ ہم سے سنا ہوتا پھر تو نے کہا ہوتا

اس دور کا شاہکار غالب کا مرثیہ ہے۔ جس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں۔ اس کا مقابلہ حالی کی قدیم غزلوں سے کیجئے تو آپ دیکھیں گے کہ رسمی قافیہ پیمائی اور سچی شاعری میں کیا فرق ہے۔ جب شاعر کے دل پر چوٹ لگتی ہے اور اسے اپنے جذبات کے اظہار کے لئے میدان بھی وسیع ملتا ہے تو وہ کیا چیز کہہ جاتا ہے۔

اے سپہر بریں کے سیارو ۔۔۔ اے فضائے زمیں کے گلزارو
اے پہاڑوں کی دلفریب فضا ۔۔۔ اے لبِ جو کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا
اے عنادل کے نغمۂ سحری ۔۔۔ اے شبِ ماہتاب تاروں بھری
اے نسیم بہار کے جھوکو ۔۔۔ دہرِ ناپائیدار کے دھوکو

یوں تو ہر حال میں آمیں ہو عزیز — تھے وطن میں مگر کچھ اور ہی چیز

حبِ وطن کے آخری حصہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ حالیؔ کے دل میں دردِ ملت کا جذبہ بیدار ہو چکا ہے۔ ان کا دل اپنے تمدن اور معاشرت کی بربادی پر کڑھتا ہے اور اس کی ترقی کی آرزو رکھتا ہے لیکن ابھی تک اس میں مصلحانہ جوشش پیدا نہیں ہوا اور جوش پیدا ہوتا تو کیونکر؛ ملک کی جو حالت وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے وہ انتہا سے زیادہ مایوس کن تھی۔ ۱۸۵۷ء کے قہر و غضب کے بعد لوگوں کے دل پر خوف ، ہیبت اور مایوسی کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ ابنائے زمانہ اکثر نئے آقاؤں کی ہواداری میں مصروف تھے ، پرانے وفادار پرانی خدمات کے صلے لے رہے تھے اور نئے خیر خواہ نئی خدمات انجام دینے کی فکر کر رہے تھے ۔ افراد کو چھوڑ کر مسلمان عام طور پر سہمے ہوئے اور روٹھے ہوئے اپنے گھروں میں بیٹھے تھے۔ اور نئی حکومت نئی تعلیم نئی تہذیب سے کچھ واسطہ نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انجام کیا ہوگا۔

۱۸۷۰ء میں دلی آنے کے بعد حالیؔ کے دل پر انتہائی مایوسی اور افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ جوانی کی ندی چڑھ کر اتر چکی تھی اور طبیعت سکون پر آکر گذری ہوئی زندگی کا جائزہ لے رہی تھی۔ لاہور کے قیام میں حالیؔ کا مذاقِ شعر بدل چکا تھا۔ اب انھیں اپنی پچھلی شاعری نکمی نظر آتی تھی اور اتنی عمر اکارت جانے کا بے حد قلق تھا۔ پھر یہ مشکل تھی کہ نئی آرزوئیں جوان کے دل میں اُبھرنے کے لئے بے چین تھیں

مایوسی کے بوجھ سے ابھرنے نہیں پاتی تھیں بلکہ سچ پوچھیے تو حالیؔ کو ان کا پوری طرح احساس بھی نہ تھا۔

دردِ دل ہوئے ہست و ندانم کہ کدام است

اس یاس و بے دلی سے حالیؔ کو نجات دینے والا وہی شخص تھا جس نے اس نازک وقت میں تمام مسلمانوں کی دستگیری کی۔ سرسید احمد خاں کو اس تدبر اور حکمت عملی کا بچا کھچا سرمایہ ملا تھا جس کی بدولت مسلمانوں نے آٹھ سو برس تک ہندوستان پر حکومت کی۔ انھوں نے دیکھا کہ سلطنت کے زوال کے بعد مسلمانوں کی زندگی کا اب کوئی مرکز باقی نہیں رہا ہے اور ان کا انتشار ان کو ہلاکت کی طرف لے جا رہا ہے۔ مصلحت شناسی کی نظر سے زمانے کے رنگ کو پہچان کر انھوں نے ایک طرف تو تمدن اور معاشرت کے بکھرے ہوئے اجزا کو "قوم" یا "ملت" کے شیرازے میں باندھنے کی کوشش کی۔ اور دوسری طرف حکومت وقت سے، جہاں تک اس ذلت اور افتادگی کی حالت میں ممکن تھا، عزت کے ساتھ مصالحت کرنے کا ڈول ڈالا جسے آج ان کے موافقین اور مخالفین دونوں اپنی کم نظری سے ابدی وفاداری کا عہد سمجھتے ہیں۔

سرسید کو یقین تھا کہ مغربی تعلیم حاصل کرنا اور ایک حد تک مغربی تہذیب اختیار کرنا نہ صرف مسلمانوں کی ترقی کے بلکہ ان کی زندگی کے لئے ضروری ہے۔ چنانچہ

انھوں نے پہلے ایک علمی انجمن کی، پھر ایک تعلیم گاہ اور ایک تعلیمی کانفرنس کی بنا ڈالی کہ مسلمانوں کو جدید تعلیم کی طرف راغب کریں۔

سرسید کی شخصیت اور ان کی تحریک کا حالی پر عجیب و غریب اثر پڑا۔ انھیں وہ رہنما مل گیا، وہ راہِ عمل نظر آگئی، وہ مقصدِ حیات ہاتھ آگیا جسے ان کا دل ڈھونڈ رہا تھا انھوں نے دل میں ٹھان لی کہ اپنی زندگی اور اپنی شاعری کو اس کام میں صرف کریں گے کہ مسلمانوں کے شعر و ادب کے مذاق کو سنواریں، ان کے دل میں جذبۂ قومی کو بیدار کریں اور تعلیم و ترقی کا شوق پیدا کریں۔

۱۸۷۹ء میں سرسید کی فرمائش پر حالی نے مسدس مدوجزرِ اسلام لکھا جس میں ان کی نئی قوت اور نیا جوش پورے شباب پر نظر آتا ہے۔ اس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب شاعر اپنا دکھڑا رونے کے بجائے قوم کے عروج و زوال کی داستان سناتا ہے۔ خیال آرائی اور مبالغے کو ترک کر کے اصلیت کا نقشہ کھینچتا ہے، لفاظی کو چھوڑ کر سیدھی سادی زبان استعمال کرتا ہے تو اس کے کلام میں اعجاز کا اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ مسدس ان نظموں میں ہے جو مردہ قوموں کو جلا دیتی ہیں۔

سرسید کی بدولت شاعر کو قوم مل گئی اور قوم کو شاعر مل گیا۔ اب حالی کی زندگی قوم کی خدمت کے لئے وقف ہو گئی۔ چند سال تک وہ ملازمت کے سلسلے کو نبھاتے رہے۔ عربک اسکول سے بدل کر گورنمنٹ کالج لاہور میں طلبہ کے اتالیق مقرر ہوئے

اور تھوڑے دن بعد اپنی جگہ پر واپس آ گئے۔ مگر اس عرصہ میں وہ برابر ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں میں شریک ہوتے رہے اور اپنی نظموں سے حامیانِ تعلیم کے دلوں کو گرماتے رہے۔ ۱۸۸۷ء میں جب سر آسمان جاہ نے دولت آصفیہ کی طرف سے ان کا وظیفہ مقرر کیا تو فکر معاش سے مطمئن ہو کر وہ علمی اور ادبی مشاغل میں مصروف ہو گئے۔

حالی نے جو مقصد اپنی زندگی کے قرار دیئے تھے ان میں سے ایک یہ تھا کہ ملک کے ادبی مذاق کی اصلاح کریں۔ اس کے دو طریقے ہو سکتے تھے۔ تنقید کے صحیح اصول مقرر کرنا اور عمدہ نمونے پیش کرنا۔ حالی نے ان دونوں طریقوں سے کام لیا۔ ۱۸۹۳ء میں انھوں نے اپنی قدیم و جدید غزلوں کا مجموعہ ایک مبسوط مقدمے کے ساتھ شائع کیا جس میں شعر و شاعری کے اصولوں سے حکیمانہ بحث کی گئی تھی۔ یہ مقدمہ ان کے حسن ذوق، وسعتِ نظر اور جدّتِ خیال کا آئینہ ہے جب کوئی غیر شاعر شعر کی تنقید پر قلم اٹھاتا ہے تو عموماً منطقی بحثوں میں پڑ کر اصل حقیقت کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ مگر حالی خود شاعر ہیں اس لئے انھوں نے اصولی مسائل کے ساتھ ساتھ فن کی باریکیوں کو بھی خوب سمجھا ہے۔ اور خوب سمجھایا ہے اردو میں حالی سے پہلے شعر کی تنقید کے معنی صرف یہ سمجھے جاتے تھے کہ لفظوں اور ترکیبوں کو اساتذہ کے کلام کی کسوٹی پر کس کر دیکھ لیں۔ حالی ہی نے پہلے پہل یہ

بحث چھیڑی کہ شاعری کی روح کیا ہے اور وہ شعر میں کیونکر پیدا ہوتی ہے۔

نثر میں تنقید شعر کے علاوہ حالی نے سیرت نگاری کی صنف کو اختیار کیا۔ ۱۸۸۶ء میں انھوں نے "حیاتِ سعدی"، ۱۸۹۶ء میں "یادگارِ غالب" اور ۱۹۰۱ء میں سر سیّد کی سیرت "حیاتِ جاوید" کے نام سے شائع کی۔ یہ تینوں بزرگ وہ ہیں جنھوں نے مختلف حیثیتوں سے ان کی زندگی پر اثر ڈالا۔ غالب ان کے استاد تھے۔ سعدی جگت استاد ہیں مگر جس حد تک حالی نے ان سے کسبِ فیض کیا ہندوستان کے کسی شاعر نے نہ کیا ہوگا۔ ان کے کلام میں سعدی کا رنگ اس قدر صاف جھلکتا تھا کہ لوگ انھیں "سعدیٔ ہند" کہنے لگے۔ سر سید تو ان کی زندگی کے دوسرے دور میں ان کے مرشد ہی تھے۔ حالی کی احسان شناسی کا یہ بھی ایک ثبوت ہے۔ انھوں نے اپنے ادبی اور روحانی رہنماؤں کی سیرت لکھ کر ان کو حیاتِ جاوید بخشی۔

سیرت نگاری میں بھی حالی نے وہی مجددانہ شان دکھائی جو شعر اور تنقیدِ شعر میں دکھائی تھی۔ یہ تینوں کتابیں خصوصاً "حیاتِ جاوید" محض واقعات کی پوٹ اور تعریفوں کا پشتارہ نہیں بلکہ جدید طرز کی سوانح عمری کا نمونہ ہیں جس میں انسان کی پوری زندگی پر اور اس کے عمل پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔ اس کا تعلق اس زمانے سے دکھایا جاتا ہے جس میں وہ پیدا ہوا۔ باوجود اس کے کہ حالی ان تینوں بزرگوں سے، جن کی سیرت انھوں نے لکھی، خصوصاً سر سیّد سے انتہائی عقیدت رکھتے تھے مگر نہ تو انھوں نے ان کی خوبیوں کو بڑھا چڑھا کر دکھایا ہے

اور نہ جان بوجھ کر ان کی برائیوں کو چھپایا ہے۔

حالی کی نثر بھی اپنے رنگ میں ان کی نظم سے کم نہیں۔ اس میں بھی پختگی اور سادگی کی وہی شان پائی جاتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ سلاست اور روانی میں نثر کبھی نظم کا مقابلہ نہیں کر سکتی خصوصاً وہ نثر جس میں علمی مضامین ادا کئے جائیں پھر بھی ان کا اسلوب بیان صاف اور سلجھا ہوا ہے کہ مشکل سے مشکل مسائل کو پانی کر دیتے ہیں اور لطف یہ کہ علمی متانت اور وقار کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا۔

ادب و شعر کی تہذیب و تجدید کے علاوہ دوسرا بڑا مقصد حالی کے سامنے یہ تھا کہ مسلمانوں کے دل میں جذبۂ ملی اور حمیت قومی پیدا کریں اور ان کے اس جوش سے تعلیمی ترقی اور اخلاقِ معاشرت کی اصلاح کا کام لیں۔ مسدس کے بعد انھوں نے " تعصب و انصاف "، " کلمۃ الحق "، " مناظرۂ واعظ و شاعر "، " پھوٹ اور ایکے کا مناظرہ "، " شکوۂ ہند "، " ننگ خدمت " کے ذریعہ سے مسلمانوں کو ان کے اخلاقی عیوب پر عبرت دلائی۔ ان کے بزرگوں کے اوصاف یاد دلائے اور احتسابِ نفس اور تہذیب نفس کا سبق پڑھایا۔ " بیوہ کی مناجات " سے ایک شرمناک معاشرتی ظلم کی طرف متوجہ کیا۔ اور " ترکیب بند بر مدرسۃ العلوم " " مسلمانوں کی تعلیم " اور اس قسم کی متعدد نظموں سے سرسید کی تعلیمی تحریک کی اہمیت

سمجھائی اور اس کی مدد پر آمادہ کیا۔

عام طور پر شاعر، چاہے وہ اپنے کلام میں عمل کی تلقین کرتے ہوں۔ خود عمل کے ہیٹے ہوتے ہیں مگر حالی ان شاعروں میں سے نہیں تھے۔ انھوں نے جہاں تک ہو سکا سرسید کے کام میں ان کا ہاتھ بٹایا۔ ان کے ساتھ ڈیپوٹیشن میں حیدرآباد گئے۔ اپنی ذاتی کوشش سے پانی پت اور کرنال میں چندہ کر کے ایک معقول رقم ان کی نذر کی اور اپنے کنبے کے لڑکوں کو علی گڈھ میں داخل کرادیا۔ اس کے علاوہ اپنے طور پر تعلیم کی ترویج میں دل وجان سے کوشش کرتے رہتے تھے۔ کوئین وکٹوریہ کی جوبلی کے موقع پر انھوں نے پانی پت میں ایک اسکول قائم کرنے کی کوشش کی مگر کافی چندہ نہ ہو سکا۔ جتنی رقم جمع ہو سکی تھی اس سے ایک کتبخانے کی عمارت بنوا کر وکٹوریہ لائبریری قائم کردی۔ جو اب میونسپل کمیٹی کے انتظام میں ہے۔ آخر عمر میں حالی مسلم اسکول اور ایک لڑکیوں کا اسکول قائم کیا۔ جس کی وجہ سے پانی پت اور آس پاس کے علاقے کے مسلمانوں میں تعلیم کا چرچا ہو گیا۔ ان تعلیمی خدمات کے اعتراف میں سنہ ۱۹۰۷ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کراچی کے صدر منتخب ہوئے جو خطبہ انھوں نے اس موقع پر پڑھا وہ کانفرنس کے نہایت مفید اور پر مغز خطبات میں سے ہے جن کی تعداد دو چار سے زیادہ نہ ہوگی۔

علی گڈھ کے ٹرسٹی کی حیثیت سے انھوں نے اس کے انتظامی امور میں بہت کچھ مدد دی اور جب کبھی کالج میں کوئی جھگڑا اٹھا، انھوں نے نہایت آزادی

کے ساتھ انصاف کی حمایت اور ترقی پسند جماعت کی ہمنوائی کی۔ سرسید کی محبت ان کے دل میں لبسی ہوئی تھی مگر حق کی محبت اس سے بھی زیادہ تھی۔ اس لئے بعض موقعوں پر انھوں نے کھلم کھلا سرسید کی مخالفت کی۔ مثلاً ۱۸۹۷ء میں جب یورپین اسٹاف کالج کے معاملات پر حاوی ہو گیا تھا۔ انھوں نے اس کا زور توڑنے میں سرسید کی مخالف جماعت کا ساتھ دیا۔ اسی طرح مسٹر ماریسن اور مسٹر آرچبولڈ سے جو اختلافات ہوئے اس میں بھی وہ آزاد پارٹی کے ساتھ تھے۔

اب ذرا ایک نظر حالی کی ذاتی زندگی پر بھی ڈالیئے۔ ایک سن رسیدہ عالم شاعر، حق پرست، حق گو، صاف دل، پاک باطن، حکیم، منکسر، خوددار، غیرت مند، محبت کا پتلا، اخلاق کا مجسمہ، دوستوں کا دوست، عزیزوں کا کفیل، غیروں کا ہمدرد، پانی پت میں رہتا ہے۔ اس کا دل محبت سے معمور ہے۔ اس کی زندگی خدمت کے لئے وقف ہے۔ کس کی محبت اور خدمت؟ علم و ادب کی، ملک اور قوم کی، خاندان کی، ہمسایوں کی، ادھر تصنیف و تالیف کا شغل جاری ہے۔ ادھر لوگ اپنی نظمیں اور کتابیں اصلاح کے لئے بھیجتے ہیں۔ علمی کاموں میں مشورہ طلب کرتے ہیں، ادبی مسائل کا حل چاہتے ہیں۔ یہ شخص سب کی فرمائش پوری کرتا ہے۔ سب کو جواب دیتا ہے اور اس عجز و انکسار کے ساتھ جیسے ان کے احسان کا شکریہ ادا کر رہا ہو۔ کوئی تعریف کرے تو شرمندہ ہوتا ہے۔ بجا اعتراض ہو تسلیم کر لیتا ہے، بیجا اعتراض ہو چپ ہو رہتا ہے۔ دشمن پھبتیاں کستے ہیں، گالیاں

دیتے ہیں۔ یہ چشم پوشی سے کام لیتا ہے۔ دوستوں میں سے کوئی جواب دینا چاہے تو اُسے منع کر دیتا ہے۔ بغض و حسد کے بادل برستے ہیں اور برس کر کھل جاتے ہیں۔ حلم کا دریا بہتا چلا جاتا ہے۔

کنبہ بہت بڑا ہے، اپنی اولاد، بھائی بہنوں کی اولاد، اولاد کی اولاد۔ مگر یہ مردِ خدا اتنا بڑا دل رکھتا ہے جس میں ایک ایک کی گنجائش ہے۔ قریب کا عزیز ہو یا دور کا سب کے ساتھ ایک سی شفقت، ایک سا سلوک۔ محبت جب نامحدود ہو تو قریب اور بعید کا فرق باطل ہو جاتا ہے اور اس شخص کی محبت محض رقتِ قلب نہیں، عملی محبت ہے۔ وہ سب کے دکھ سکھ میں شریک ہے۔ مشکلوں میں ہدایت کرتا ہے۔ ضرورت کے وقت دستگیری کرتا ہے۔ بیماری میں تیمار دار ہے مصیبت میں غمخوار ہے۔ خاندان بھر کے بچوں کی تعلیم کا کفیل اور تربیت کا نگراں ہے۔ اور خاندان کے باہر بھی ہمسایوں کے ہونہار لڑکوں کو اپنی قلیل آمدنی میں سے وظیفے دے کر مدرسے پڑھنے بھیجتا ہے جو پڑھ چکے ہیں، ان کی معاش کی فکر کرتا ہے۔ جو برسرِ بیکار ہیں ان کی ترقی میں کوشاں ہے۔

وہ سچا دین دار ہے، مومن ہے، عابد ہے، زاہد ہے، احکام ظاہر کا پابند ہے۔ طریق باطن کا سالک ہے مگر اسے نہ دین کا گھمنڈ ہے نہ ایمان کا۔ نہ عبادت کا نہ زہد کا نہ شریعت کا نہ طریقت کا۔ وہ اپنی نجات کا وسیلہ دو چیزوں کو سمجھتا ہے جو اصل میں ایک ہیں، محبت اور خدمت۔

حالی کی سیرت کی یہ ایک دھندلی سی تصویر ہے۔ آپ اسے صاف روشنی میں دیکھنا چاہیں تو ان کے کلام کا مطالعہ کیجئے۔ ہم حالی کے دوسرے دور کے کلام کا تھوڑا سا نمونہ پیش کر کے اس مضمون کو ختم کرتے ہیں۔ طویل بہت ہو چکا ہے تنقید اور تشریح کی گنجائش نہیں اور نہ اس کی ضرورت ہے۔ حالی کا کلام آپ ہی اپنی تنقید اور آپ ہی اپنی شرح ہے۔

کامل ہے جو ازل سے وہ ہے کمال تیرا
باقی ہے جو ابد تک وہ ہے جلال تیرا
ہے عارفوں کو حیرت اور منکروں کو سکتہ
ہر دل پہ چھا رہا ہے رعب جمال تیرا
کاوش میں ہے الٰہی دگدا ہیں ہے طبیعی
جو حل ہوا نہ ہوگا وہ ہے سوال تیرا
چھوٹے ہوئے ہیں گو جی بہ دل بندھے ہوئے ہیں
ملنے سے بھی سوا ہے چھٹنا محال تیرا

تو نہیں ہوتا تو رہتا ہے اُچاٹ
دل کو یہ کیسی لگا دی تو نے چاٹ
ملتیں رستوں کا ہیں سب ہیر پھیر
سب جہازوں کا ہے لنگر ایک گھاٹ

شکوہ کرنے کی خو نہ تھی اپنی
پر طبیعت ہی کچھ بھر آئی آج
جو رہے دل میں کچھ نہ کچھ یارو
نیند پھر رات بھر نہ آئی آج

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

ڈھونڈتا ہے دلِ شوریدہ بہانے مطرب — دردانگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز!
صحبتیں اگلی مصور ہمیں یاد آئیں گی — کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز
لے کے داغ آئے گا سینے پہ بہت اے سیاح — دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز
مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو — اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز

وقت نازک ہے اپنے بیڑے پر — موج حائل ہے اور ہوا ناساز
یا تھپیڑے ہوا کے لے ابھرے — یا گیا کشمکش میں ڈوب جہاز

رہا ہوں رند بھی اے شیخ پارسا بھی میں — مری نگاہ میں ہیں رند و پارسا ایک ایک
ہم آج بیٹھے ہیں ترتیب کرنے دفتر کو — ورق جب اس کے اڑا لے گئی ہوا ایک ایک
بہار نے بھی نہ بلبل تری بجھائی آگ — جگر کے پار ہے اب تک تری نوا ایک ایک

آگے بڑھے نہ قصۂ عشقِ بتاں سے ہم — کچھ دل سے تھے ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم
اب شوق سے بگاڑ کی باتیں کیا کرو — کچھ پا گئے ہیں آپ کے طرزِ بیاں سے ہم

یاروں کو تجھ سے حالی اب سرگرانیاں ہیں — نیندیں اچاٹ دیتی تیری کہانیاں ہیں
خاور سے باختر تک جن کے نشاں تھے برپا — کچھ مقبروں میں باقی ان کی نشانیاں ہیں

کھیتوں کو دے لو پانی اب بہ رہی ہے گنگا　　کچھ کر لو نوجوانو! اُٹھتی جوانیاں ہیں
فضل و ہنر بڑوں کے گر تم میں ہوں تو جانیں　　گر یہ نہیں تو بابا وہ سب کہانیاں ہیں

خوابِ راحت میں بھی وہ لذت تیرے آ بیری نہیں　　جو جوانی میں مزہ دیتی ہیں شب بیداریاں

اک عمر چاہیئے کہ گوارا ہو نیشِ عشق　　رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں
ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اُور　　تجھ سے جہاں میں لاکھ سہی تو مگر کہاں

بے قراری تھی سب امیدِ ملاقات کے ساتھ　　اب وہ اگلی سی درازیٔ شبِ ہجراں میں نہیں

جی ڈھونڈتا ہے بزمِ طرب میں انھیں مگر　　وہ انجمن میں آئیں تو پھر انجمن کہاں

درِ فیض جب بند تھا اور نہ اب ہے کچھ　　فقیروں کی جھولی میں ہے اب بھی سب کچھ
ہر اک کو نہیں ملتی یاں بھیک واعظ　　بہت جانچ لیتے ہیں دیتے ہیں تب کچھ
یہ طبلِ تہی ہیں جو بنکارتے ہیں!　　جنھیں کچھ خبر ہے وہ کہتے ہیں کب کچھ

وفا اغیار کی اغیار سے سُن!　　مری الفت در و دیوار سے پوچھ

تصور میں کیا کرتے ہیں جو ہم　　وہ تصویرِ خیالِ یار سے پوچھ

کبک و قمری میں ہے جھگڑا کہ وطن کس کا ہے　　کل خزاں آکے بتا دے گی چمن کس کا ہے

یاد ایام کہ بے رنگ تھی تصویرِ جہاں　　دستِ مشاطہ نہ تھا محرمِ زلفِ دوراں
گلِ خود رو سے بسا تھا چمنِ کون و مکاں　　چار سو حسنِ خداداد کا سکہ تھا رواں

وضعِ عالم میں نہ آیا تھا تغیر اب تک
خطِ قدرت کی وہی شان تھی اور نوک پلک

طفلِ معصوم کے مانند تھا یہ عالمِ پیر　　تھے ہم اک صنعتِ بے چون و چرا کی تصویر
ملکِ فطرت میں نہ تھی سلطنتِ نفسِ شریر　　طبع نے مملکتِ روح نہ کی تھی تسخیر

خوابِ غفلت کی گھٹا دل پہ نہ چھائی تھی بہت
دن چھپا تھا ابھی اور رات نہ آئی تھی بہت

اے راست گوئی کیا قہر ہے تو　　اے حق کی تلخی کیا زہر ہے تو
ہے ناگواری پہچان تیری　　الحق مر ہے شان تیری
یاروں کو کرتی اغیار تو ہے　　چلواتی گھر گھر تلوار تو ہے
خونخوار لشکر ہیں ساتھ تیرے　　رنگیں لہو میں ہیں ہاتھ تیرے

تیرے جلوے میں رسوائیاں ہیں — سنگ میں تیری تنہائیاں ہیں
ہوتی ہے جب جا تو جلوہ گستر — دفتر بہت سے ہوتے ہیں ابتر
پڑتی ہے ہلچل ہر مرحلے میں — آتی ہے دنیا اک زلزلے میں

اے راست گوئی اے ابر رحمت — ہے اس چمن میں تیری ہی برکت
گر تو نہ ہوتی یاں سایہ افگن — برباد کب کا ہوتا یہ گلشن
عالم ہے سرسبز تیرے قدم سے — آباد یہ گھر تیرے ہی دم سے
تو بے کسوں کی یاور رہی ہے — تو گمرہوں کی رہبر رہی ہے
جن بستیوں میں تو چہچہائی — کھیتی انھیں کی یاں لہلہائی
مشرق میں جب تھی تیری حکومت — چھائی ہوئی تھی مغرب میں ظلمت
جب دور تیرا مغرب میں آیا — مغرب کو تو نے مشرق بنایا

وہ مسلمانوں کی ہر بازی میں سبقت کیا ہوئی — وہ حجازی غیرت اور وہ حمیت کیا ہوئی
ہم مسلمانوں سے ہے اے ہند ننگ اسلام کو — تھا لقب خیر الامم جس کا وہ امت کیا ہوئی
جب کسی کی عزت افزائی سے خوش ہوتا نہیں — دل گواہی جس پہ دیتا تھا وہ عزت کیا ہوئی
دین و دولت، علم و دانش ہم میں کچھ باقی نہیں — حق نے پوری کی تھی جو ہم پر وہ نعمت کیا ہوئی
ملک و مال و سلطنت اک آنی جانی چیز ہے — جو ہمیشہ رہنے والی تھی وہ دولت کیا ہوئی

جھٹ پٹے کے وقت گھر سے ایک مٹی کا دیا
ایک بڑھیا نے سر رہ لا کے روشن کر دیا

تا کہ رہگیر اور پردیسی کہیں ٹھوکر نہ کھائیں
راہ سے آساں گذر جائے ہر اک چھوٹا بڑا

یہ دیا بہتر ہے ان جھاڑوں سے اور اس لیمپ سے
روشنی محلوں کے اندر ہی رہی جن کی سدا

گر نکل کر اک ذرا محلوں سے باہر دیکھئے
ہے اندھیر اگھپ در و دیوار پر چھایا ہوا

سرخ رو آفاق میں وہ رہنما مینار ہیں
روشنی سے جن کی ملاحوں کے بیڑے پار ہیں

اے مرے زور اور قدرت والے
حکمت اور حکومت والے

میں لونڈی تیری دکھیاری
دروازے کی تیرے بھکاری

موت کی خواہاں جان کی دشمن
جان پہ اپنی آپ اجیرن

اپنے پرائے کی دھتکاری
میکے اور سسرال پہ بھاری

سہہ کے بہت آزار چلی ہوں
دنیا سے بیزار چلی ہوں

بیاہ کے دم پائی تھی نہ لینے
لینے کے یاں پڑ گئے دینے

سیلانی جب باغ میں آئے
پھول ابھی تھے کھلنے نہ پائے

پھول کھلے جس وقت چمن میں
جا سوئے سیلانی بن میں

بیت نہ تھی جب پایا بیتم
جب ہوئی بیت گنوایا بیتم

آنی جانی چیز ہیں خوشیاں — چلتے پھرتے چھاؤں ہیں ارماں
منگنی، بیاہ، برات اور رخصت — میل ملاپ، سہاگ اور سنگت
ہیں دو دن کے سب بہلاوے — آگے چل کر ہیں پچھتاوے
ریت کی سی دیوار ہے دُنیا — اوچھے کا سا پیار ہے دُنیا

عقل و عشق

اقبال کی شاعری میں

عشق و عقل کی کشمکش اردو اور فارسی شاعری کا پرانا مضمون ہے۔ عشقیہ شاعری میں عقل مصلحت اندیشی اور احتیاط کے معنی میں آتا ہے اور عشق اس والہانہ محبت کے معنی میں جو آداب مصلحت سے ناآشنا اور وضع احتیاط سے بیگانہ ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں چیزیں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔

عشق درآمد نہ درگفت سلام علیک ؛ عقل بروں شد زسر گفت سلام علیک

متصوفانہ شاعری میں عقل سے مراد ہے منطقی استدلال سے جس کے ذریعہ سے ظنی مظاہر کا ایک دھندلا سا تصور قائم ہوتا ہے، اور عشق سے مراد ہے جذبۂ باطن جس کی بدولت طالب تعینات کے پردوں کو ہٹا کر حقیقت کی بلاواسطہ معرفت حاصل کرتا ہے۔ عقل کی کوششوں کا ماحصل علم یا "خبر" ہے یعنی ذہنی ادراک، اور عشق کی منزل معرفت یا "نظر" یعنی وجدانی مشاہدہ، اگر ہم عقل و ادراک سے حقیقت کے

عقدے کو حل کرنا چاہیں تو تصورات کا ایک لامتناہی سلسلہ بن جاتا ہے۔ ہر تصور کی تشریح کے لئے ایک نئے تصور کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہ نیا تصور پھر ایک نئی تشریح کا محتاج ہوتا ہے۔ غرض یہ عقدہ کبھی حل نہیں ہوتا، بلکہ اور نئی نئی گتھیاں پڑتی چلی جاتی ہیں۔

فلسفی رازِ حقیقت نتوانست کشود گشت رازِ دگر آں راز کہ افشا می کرد

اس عقدے کو حل کرنے کے یعنی وجودِ حقیقی کی معرفت حاصل کرنے کی صرف یہی صورت ہے کہ ہم ذوق شوق سے ریاضتِ جسمانی اور مجاہدۂ نفس کے مرحلے طے کر کے وہ نظر پیدا کریں جو ہمیں شاہدِ حقیقت کا جلوہ دکھاتی ہے۔

آدمی دیداست باقی پوست است دید آں باشد کہ دیدِ دوست است

جملہ تن را درگداز اندر بصر در نظر رو در نظر رو در نظر

اقبال نے عقل اور عشق کے تصورات صوفی شاعروں سے لے کران پر جدید فلسفۂ وجدانیت کا رنگ چڑھایا ہے اور اپنی جدتِ فکر سے ان کے تضاد کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔

صوفی شعراء "ہمہ اوست" کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک حقیقی وجود صرف ذاتِ الٰہی کا ہے۔ کائنات کا وجود محض ہمارے حواسِ ظاہری کا فریب ہے۔ اس لئے عقل جس سے ہمیں کائنات کا علم ہوتا ہے ان کی نظر میں کوئی

قدر نہیں رکھتی، مگر بجا ہے فلسفۂ وجدانیت، جس کا سب سے ممتاز نمائندہ فرانسیسی فلسفی برگسان ہے عقلی تصور کائنات کی عملی قدر کو تسلیم کرتا ہے۔ برگسان کہتا ہے انسان کے ذہن کا کام یہ ہے کہ حسی وظائف کو حرکیتی وظائف میں منتقل کر دے اس لئے جو تصور کائنات ذہن و حواس سے حاصل ہوتا ہے وہ عملی زندگی کے لئے ناگزیر ہے لیکن یہ تصور حقیقت کا تصور نہیں ہے۔ حقیقت کی معرفت بغیر عقل و حواس کے واسطے کے باطنی وجدان سے حاصل ہوتی ہے جس میں موضوع اور معروض کا فرق مٹ جاتا ہے اور نفس انسانی بیگانگی کے پردوں کو ہٹا کر اس حقیقت کا جس کا وہ خود ایک جزو ہے بلا واسطہ محرم ہو جاتا ہے۔

اقبال برگسان کی زبان سے کہتے ہیں:-

تا بر تو آشکار شود راز زندگی — خود را جدا ز شعلہ مثال شرر مکن
بہر نظارہ جز نگہ آشنا میار — در مرز و بوم خود چو غریبان گذر مکن

نقشے کہ بستۂ اوہام باطل است
عقلے بہم رساں کہ ادب خوردۂ دل است

اب اسی مضمون کو خود اقبال کی زبان سے سنیئے:-

عقل نے ایک دن یہ دل سے کہا — بھولے بھٹکے کی رہنما ہوں میں
ہوں مفسر کتاب ہستی کی — مظہر شان کبریا ہوں میں
دل نے سن کر کہا یہ سب سچ ہے — پر مجھے بھی تو دیکھ کیا ہوں میں

راز ہستی کو تو سمجھتی ہے — اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں
ہے تجھے واسطہ مظاہر سے — اور باطن سے آشنا ہوں میں
علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے — تو خدا جو، خدا نما ہوں میں
تو زمان و مکاں سے رشتہ بپا! — طائر سدرہ آشنا ہوں میں
کس بلندی پہ ہے مقام مرا — عرش ربِ جلیل کا ہوں میں

ان اشعار سے عقل اور عشق کا وہ تصور جو اقبال کے ذہن میں ہے واضح ہو جاتا ہے۔

(۱) عقل رازِ ہستی کو "سمجھتی ہے" یعنی مظاہر کی صورت میں اس کا بالواسطہ ادراک کرتی ہے اور عشق اسے "آنکھوں سے دیکھتا ہے" یعنی حقیقتِ ہستی کا بلاواسطہ مشاہدہ کرتا ہے۔

عقل زمان و مکان کی پابند ہے اور یہ صرف مظاہر کے ادراک کی صورتیں ہیں۔ اس لیے عقل کے ذریعہ سے ہمیں صرف "علم" حاصل ہوتا ہے۔ عشق زمان و مکان کی حدود سے نکل کر اس عالمِ نامحدود میں پہنچ جاتا ہے جہاں حقیقت مطلق بے حجاب نظر آتی ہے۔ اور یہ "معرفت" کا مقام ہے۔

(۲) عقل کی منزلِ مقصود بھی ہستی مطلق کی معرفت ہے۔ وہ "خدا جو" ہے لیکن اس کی جستجو بجائے خود ناتمام ہے۔ عشق "خدا نما" ہے یعنی راہِ طلب میں عقل کی رہبری

کرتا ہے اور اسے منزل تک پہنچا دیتا ہے۔ عقل اور عشق ایک دوسرے کے حریف نہیں بلکہ در اصل عشق عقل کا مرشد ہے۔

اب ہم اقبال کے تصورِ عقل و عشق کے ان دونوں پہلوؤں یعنی ان کے اختلاف اور اتحاد کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

(۱)

عقل کی کل کائنات "خبر" یعنی مظاہر کا علم ہے۔

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ نہیں

اس کا ادراک صورت زمانہ اور حواسِ ظاہری کا پابند ہے اس لئے وہ کعبۂ حقیقت سے ناآشنا اور صنم خانۂ مجازکی پرستار ہے۔

خرد زنجیری امروز و دوش است پرستار بتانِ چشم و گوش است
صنم در آستیں پوشیدہ دارد برہمن زادۂ زنار پوش است

عقل کا علم جو مشاہدۂ حقیقت سے محروم ہے ظن و گمان سے زیادہ نہیں۔ انسان کا دل محض گمان سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یقین حاصل کرنے کے لئے بیچین ہے۔

چو خس از موج ہر بادے کہ می آید ز جا رفتم دلِ من از گماں ہا در خروش آمد یقینے دہ

کائنات کا سطحی علم بیکار ہے جب تک انسان کی نظر اس کی تہ تک نہ پہنچ جائے

اگر بسینۂ ایں کائنات در نہ روی — نگاہ را بہ تماشا گذاشتن ستم است

عقل کی بصارت کے ساتھ عشق کی بصیرت بھی شامل ہو تو کائنات جیسے خود محرم راز کی تلاش ہے اپنے اسرار پنہاں آشکار کر دیتی ہے۔

یہ کائنات چھپاتی نہیں ضمیر اپنا — کہ ذرے ذرے میں ہے ذوق آشکارائی

کچھ اور ہی نظر آتا ہے کاروبار جہاں — نگاہ شوق اگر ہو شریک بینائی

کائنات کی حقیقت معلوم کرنے کی جو لگن انسان کے دل میں ہے وہ اقبال کے فلسفۂ خودی کی رو سے محض نظری اہمیت نہیں بلکہ اخلاقی اور عملی اہمیت رکھتی ہے۔ انسان کا مقصد حیات یہ ہے کہ اپنی شخصیت کی توسیع اور تکمیل کرے اور اسے پائیدار اور لازوال بنائے۔ عقل کو اس مقصد کا احساس تک نہیں وہ تو کشمکش حیات کا دور سے تماشا دیکھتی ہے مگر عشق جو پیغام خودی کا مخاطب اور محرم ہے بے تامل کارزار عمل میں کود پڑتا ہے۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق — عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

عشق فرمودۂ قاصد سے سبک گام عمل — عقل سمجھی ہی نہیں معنی پیغام ابھی

اس مقصد کے حاصل کرنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ انسان کائنات کی قوتوں کو تسخیر کرے اور زمانے کی قیود کو توڑ کر اپنی زندگی کو لازوال بنا دے۔

حیات چیست جہاں را اسیر جاں کردن — تو خود اسیر جہانی کجا توانی کرد

تو از شمارِ نفس زندہ نمی دانی کہ زندگی زشکستِ طلسمِ ایام است

ظاہر ہے کہ "شکستِ طلسمِ ایام" عقل کے بس کی بات نہیں اس لئے کہ وہ تو اپنی فطرت کی رو سے صورتِ زمان و مکان کی پابند ہے یعنی اس پر مجبور ہے کہ عالمِ خارجی کے تصور کو مکان کے سانچے میں اور عالمِ داخلی کے ادراک کو زمانے کے سانچے میں ڈھالے۔ وہ مظاہر کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے دیکھتی ہے اور آہستہ آہستہ ایک ایک قدم آگے بڑھاتی ہے۔ اسی لئے وہ کائنات کو نامحدود سمجھتی ہے اور اس کے احصار سے عاجز ہے ان قیود کو توڑ کے لازمان و لامکان کا مشاہدہ کرنے کے لئے عشق کی جرأتِ رندانہ درکار ہے۔

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

اس مطلب کو اقبال نے جاوید نامے میں ایک تمثیل کے پیرائے میں ادا کیا ہے جب شاعر زندہ رود اپنے پیرِ طریقت مولانا روم کے ساتھ عالمِ علوی کی سیر کو جانا چاہتا ہے تو روحِ زمان و مکان جس کا نام زروان ہے ظاہر ہوتی ہے اور کہتی ہے کہ میں طلسمِ کائنات کی محافظ ہوں، اس طلسم کو وہی توڑ سکتا ہے جو صدقِ دل سے لی مع اللہ وقت کہے یعنی صرف عشقِ الہیٰ کی توفیق سے زمانے کی حدود سے گذر کر ابدیت کی نامحدود فضا میں قدم رکھنا ممکن ہے۔

گفت زروانم جہاں را قاہرم ہم نہانم از نگہ ہم ظاہرم

من حیاتم من مماتم من نشور
من حسابِ دوزخ و فردوس و حور

در طلسمِ من اسیر است ایں جہاں
از دمم ہر لحظہ پیر است ایں جہاں

لی مع اللہ ہر کرا در دل نشست
آں جوانمردے طلسمِ من شکست

گر تو خواہی من نہ باشم درمیاں
لی مع اللہ باز خواں از عین جاں

زروان سے آنکھ ملاتے ہی شاعر کے سامنے زمان و مکان کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے تعینات کے پردے اُٹھ جاتے ہیں اور عالم حقیقت بے حجاب نظر آنے لگتا ہے۔ یہ وارداتِ قلب خود شاعر کی زندگی میں کایا پلٹ کر دیتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس عالم میں مر کر ایک اور عالم میں پیدا ہوا ہے۔ وہ اپنے جسم و روح میں ایک عجیب لطافت اور اپنی چشمِ باطن میں ایک نئی بصیرت پاتا ہے۔

در نگاہِ او نمی دانم چہ بود
از نگاہم ایں کہن عالم ربود

مردم اندر کائناتِ رنگ و بو
زادم اندر عالمِ بے ہائے و ہو

رشتۂ من زاں کہن عالم گسست
یک جہانِ تازہ آمد بدست

از زیانِ عالمے جانم تپید
تا دگر عالم ز خاکم بر دمید

تن سبک تر گشت و جاں ہشیار تر
چشمِ دل بینندہ و بیدار تر

یہی وہ کیفیت ہے جس میں شاعر بے اختیار کہہ اٹھتا ہے:-

با مروز اسیرم نہ بہ فردا نہ بدوش
دل نشیبے نہ فرازے نہ مقامے دارم

در جہانِ دلِ ما دورِ قمر پیدا نیست　　انقلابیست ولے شام و سحر پیدا نیست

بہ گوشِ من رسید از دل سروشے　　کہ جوئے روزگار از چشمہ سارم

ازل تاب و تبِ دیرینۂ من　　ابد از ذوق و شوقِ انتظارم

(۲)

ان سب اشعار میں اقبال کے پیشِ نظر عقل کا مروجہ تصور تھا یعنی وہ قوت جو حواسِ ظاہری کی مدد سے زمان و مکان کے دائرے کے اندر مظاہر کا علم و ادراک حاصل کرنے پر قناعت کرتی ہے لیکن خود ان کا تصور عقل اس سے جدا ہے۔ ان کے نزدیک عقل حقیقت میں عشق کی ضد نہیں بلکہ اس کی تمہید ہے۔ اگر وہ صحیح راہ پر چلے تو ہمارے دل میں مشاہدۂ حقیقت کی آرزو پیدا کرتی ہے اور اس طرح اس کی حد عشق سے جا ملتی ہے۔ وہ "خبر" پر قانع نہیں بلکہ ذوقِ "نظر" بھی رکھتی ہے۔ لیکن اس کی پرواز اتنی نہیں کہ مقامِ نظر کی بلندی تک پہنچ سکے۔

عقل ہم عشق است و از ذوقِ نظر بیگانہ نیست　　لیکن ایں بیچارہ را آں جرأتِ رندانہ نیست

ارباب معنی کے دل میں فلسفہ و حکمت کی قیل و قال بھی کیف و حال پیدا کرتی ہے۔

مگر رسم و راہِ فرزانگی ذوقِ جنوں بخشد　　دل از درسِ خردمنداں گریباں چاک می آید

عقل اگر اپنی صحیح فطرت سے منحرف یعنی ذوقِ نظر سے خالی ہو تو جو علم اس کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے وہ ہماری آنکھوں پر پردہ ڈال دیتا ہے، ہم مظاہر میں الجھ کر حقیقت سے محروم رہ جاتے ہیں لیکن اگر عقل اپنی منزلِ مقصود سے واقف ہے تو وہ علم ظاہر کے ذریعہ سے علم باطن کی راہ ہموار کر دیتی ہے اور اس حد تک ہماری رہنمائی کرتی ہے کہ ہمارے دل میں معرفت حقیقت کی آرزو پیدا کر دے یہی اس کی منتہائے پرواز ہے۔ یہاں پہنچ کر وہ ہمیں چھوڑ دیتی ہے کہ ہم عشق کے سہارے آگے بڑھتے چلے جائیں۔

علم اگر کج فطرت و بدگوہر است — پیشِ چشمِ ما حجاب اکبر است
علم را مقصود اگر باشد نظر — می شود ہم جادہ و ہم راہبر
می نہد پیشِ تو از قشرِ وجود — تا تو پرسی چیست این راز این نمود
جادہ را ہموار سازد این چنیں — شوق را بیدار سازد این چنیں
علم تفسیرِ جہانِ رنگ و بو — دیدہ و دل پرورشِ گیرد ازو
بر مقامِ جذب و شوق آرد ترا — باز چوں جبریل بگذارد ترا

عقل کا اس سے بھی زیادہ تصور یہ ہے کہ وہ "خبر" اور "نظر" "علم و عشق" دونوں پر حاوی ہے، اس کے دو پہلو ہیں ایک ناسوتی دوسرا لاہوتی۔ ایک پہلو سے دیکھئے تو اس کا عمل ادراک عالم آب و گل سے تعلق رکھتا ہے اور اس میں بھی سطحیات یعنی مظاہر

تک محدود ہے۔ دوسرے پہلو سے دیکھیے تو اس کی نظر ظاہر کائنات سے گذر کر اس کی ماہیت و حقیقت میں ڈوب جاتی ہے اور عالم تحت و فوق سے گذر کر عالم علوی کی سیر کرتی ہے۔ ایک طرف وہ زمان و مکان کے پردے میں مجاز کے ظنی علم سے آگے نہیں بڑھتی اور دوسری طرف ان پردوں کو اٹھا کر حقیقت کا عینی مشاہدہ کرتی ہے۔ یہی عقل کا دوسرا پہلو ہے جو سوزِ محبت سے آشنا اور نورِ معرفت سے روشن ہے، عشق کہلاتا ہے۔

عقلِ خود بیں دگر و عقلِ جہاں بیں دگر است — بالِ بلبل دگر و بازوئے شاہیں دگر است
دگر است آنکہ برد دانۂ افتادہ ز خاک — آنکہ گیرد خورش از دانۂ پرویں دگر است
دگر است آنکہ زند سیرِ چمن مثلِ نسیم — آنکہ در شد بہ ضمیرِ گل و نسریں دگر است
دگر است آں سوئے نُہ پردہ کشادن نظرے — ایں سوئے پردہ گمان و ظن و تخمیں دگر است

اے خوش آں عقل کہ پہنائے دو عالم با اوست
نورِ افرشتہ و سوزِ دلِ آدم با اوست

غرض اقبال کے تصور عقل و عشق کا ماحصل یہ ہے کہ ان دونوں میں کوئی حقیقی فرق نہیں بلکہ صرف مدارج ارتقا کا فرق ہے ان میں ما بہ الامتیاز آرزوئے معرفت کی وہ خاص کیفیت ہے جسے شاعر نے سوز کہا ہے اگر عقل میں یہ سوز پیدا ہو جائے تو وہ عشق بن جاتی ہے۔

چہ می پرسی میانِ سینہ دل چیست — خرد چوں سوز پیدا کرد دل شد

حدیثِ دیگراں

مرزا غالبؔ کا شعر ہے :-

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

یہ شعر تو آپ نے بارہا پڑھا ہوگا مگر کبھی یہ بھی سوچا کہ آخر یہ مرزا صاحب کے دل کا معاملہ تھا کیا جسے وہ چھپانا چاہتے تھے۔ بگراں کے منتخب کلام نے غمازی کی اور سب پتے کی باتیں بتا دیں۔ آپ کہیں گے بھئی اس میں کیا مشکل ہے یہ وہی "دورِ ایامِ جوانی چنانکہ افتد دانی" کا معاملہ ہے جسے شیخ سعدی جیسے بے ریا حق گو بزرگ بھی فقط اشارہ کر کے ٹال گئے۔ مگر حضرت یہ بات تو کچھ دل کو نہیں لگتی۔ مرزا صاحب کے مکتوبات آپ نے ملاحظہ فرمائے ہیں اور شیخ سعدی کی گلستاں بھی پڑھی ہے۔ "جوانی دیوانی" کی کیفیت مرزا اور شیخ دونوں نے اس بے تکلفی سے سنائی ہے اور "وقت پیری شباب کی باتیں" اس طرح مزے لے لے کر بیان کی ہیں کہ "اخفائے واردات" کا الزام ان دونوں بزرگوں پر کسی طرح

عائد نہیں ہوتا۔ نہیں صاحب یہ "دل کا معاملہ" کچھ اور ہی ہے جس کے ظاہر ہو جانے کا مرزا صاحب کو افسوس ہے۔ یہ شاعر کے مرکزِ حیات یعنی جوہرِ ذات شخصیت یا خودی کا راز ہے۔ شاعر اور ایک شاعر ہی پر کیا موقوف ہے، ہر شخص جو لفظ، نقش یا نغمے کے ذریعہ سے حقیقت کی تصویر کھینچتا ہے یا اس کی تفسیر کرتا ہے، خودی کے دونوں سروں یعنی خود نمائی اور خود پوشی کے بیچ میں جھولا کرتا ہے بلکہ سچ پوچھیے تو ہر انسان جو بقدرِ بصیرت زندگی کا مطالعہ اور بقدرِ ہمت اس کی تشکیل کرتا ہے اسی کشمکش میں مبتلا رہتا ہے۔ حیات و کائنات کا اپنی بساط کے مطابق احاطہ کرنے کے لئے ہر انسان اس پر مجبور ہے کہ اپنی ذات کو مرکز بنا کر فکر و عمل کا ایک دائرہ کھینچے، زندگی کا صحیح توازن یہ چاہتا ہے کہ مرکز اور محیط کا فرق مٹ جائے۔ یعنی انسان کی شخصیت اس کے نصب العین اور اس کے کام میں اس طرح گھل مل کر ایک ہو جائے کہ دوئی کا شعور تک باقی نہ رہے۔ لیکن یہ مقام بہت مشکل ہے اور چند خاصانِ خدا کے سوا کسی کو نصیب نہیں ہوتا۔ عام طور پر انسان کبھی مرکز کی طرف جھکتا ہے کبھی محیط کی طرف، کبھی اپنی ذات کو اپنے کام سے اہم سمجھ کر اسے ابھارنا اور چمکانا چاہتا ہے۔ اور کبھی اسے محض حصولِ مقصد کی ایک خوشنما جان کر اپنے کام میں کھپا دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی خود نمائی کی انتہا یہ ہے کہ زندگی کی ساری صرف و نحو واحد متکلم کا صیغہ بن کر رہ جاتی ہے۔ ہر فعل کا فاعل "میں"، ہر صفت کا موصوف "میں" ہر صلے کا موصول "میں"۔ ہر

خبر کا مبتدا" میں"، ہر مسند کا مسند الیہ "میں"، ہر اشارے کا مشار الیہ "میں"۔

جدھر دیکھتا ہوں اُدھر میں ہی میں ہوں

اور خود پوشی کی آخری حد یہ ہے کہ اپنی شخصیت کے نقش کو جو قدرتی طور پر اس کے اقوال واعمال پر ثبت ہوتا ہے مٹا دینے میں اپنی طرف سے کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتا مگر ظاہر ہے کہ نفی ذات کا مرحلہ اثبات ذات سے کہیں زیادہ مشکل ہے اس لیے کہ خود عمل نفی دوسروں کو نفی کرنے والے کی طرف متوجہ کر دیتا ہے، کہنے والا لاکھ کہے :-

مشہور ہیں دنیا میں تو کیا ہیں بھی کہیں ہم
القصہ نہ درپے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

لیکن اس سے سننے والے کا اشتیاق کم نہیں ہوتا۔ بلکہ بڑھ جاتا ہے۔ اور وہ اور بھی زیادہ یہ معلوم کرنے کے درپے ہوتا ہے کہ آخر یہ "نہیں ہم" ہیں کون بزرگ۔

خود نمائی اور خود پوشی کی یہ دورنگی اہل قلم میں بھی نظر آتی ہے۔ بعض لکھنے والے ہیں کہ موقع بے موقع نوک قلم سے صفحۂ کاغذ پر ٹپکے پڑتے ہیں، کوئی موضوع ہو، کوئی مسئلہ ہو خود بدولت ضرور بیچ میں آکودیں گے۔ ان کا ہر قول قائل کی داستان، ہر روایت راوی کی کہانی ہے۔ جگ بیتی ان کی زبان سے آپ بیتی بن کر نکلتی ہے۔

مگر بعض خدا کے بندے ایسے بھی ہیں جن کے قال میں ان کا حال مذکور کیا

مقدر بھی نہیں ہوتا۔ فوٹوگرافر کی طرح وہ کیمرے کے سامنے نہیں بلکہ پیچھے کھڑے ہوتے ہیں اور لوحِ تصویر پر اپنا عکس تک نہیں پڑنے دیتے جب وہ حق کے چہرے سے نقاب اٹھاتے ہیں تو اس کے نظارے میں ایسے محو ہوتے ہیں کہ انھیں اپنا ہوش نہیں رہتا۔

مولوی عبدالحق صاحب انھیں بزرگوں میں سے ہیں جو انا الحق سے "انا" کو حذف کر دیتے ہیں۔ رسالہ "جوہر" کے سالنامے میں جو مولوی صاحب کی سترویں سالگرہ کے موقع پر شائع ہوا ہے، دوستوں کے کئی دلچسپ اور قابل قدر مضامین شائع ہو رہے ہیں جن سے موصوف کی سیرت پر کچھ نہ کچھ روشنی پڑتی ہے۔ مگر باہر سے دیکھنے والوں کی نظریں خواہ وہ کتنی ہی تیز اور باریک کیوں نہ ہوں ایک بھرپور اور گہری شخصیت کے ہر گوشے تک نہیں پہنچ سکتیں، خصوصاً اگر اس شخصیت کے مالک نے اپنے آپ کو خود پوشی کے پردوں میں چھپا رکھا ہو تو دیکھنے والوں کو اس کے ایک دھندلے سے خاکے کے سوا کچھ نظر نہیں آتا، جب وہ اس کی تصویر کھینچنا چاہتے ہیں تو بس ایک گردِ تصویر بنا کر رہ جاتے ہیں۔ اس کے خط و خال کو مکمل کرنے کے لئے خود صاحبِ تصویر کے موقلم کی ضرورت ہے لیکن اگر صاحبِ تصویر باوجود اس کے کہ وہ ایک دنیا کا مرقع کھینچتا ہے اپنی چھاؤں تک نہ دیتا ہو تو پھر تصویر کے بننے کی کیا صورت ہو؟۔

اس کی صرف ایک ہی صورت نظر آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ "سرِ دلبراں" کو

"حدیثِ دیگراں" میں تلاش کیا جائے۔ ایک مصنف خواہ وہ خود پوشی میں کتنا ہی اہتمام کرتا ہو۔ یوں تو اپنی ہر تحریر کے اسلوب اور مضمون میں اپنی شخصیت کی ایک جھلک دکھانے پر مجبور ہے لیکن خاص کر اس وقت جب وہ دوسروں کی سیرت پر قلم اٹھاتا ہے اس کے خلوتکدۂ ذات کا حجاب اٹھ جاتا ہے۔ اوروں کے جوہر پرکھنے میں خود اس کے جوہر کھل جاتے ہیں۔

دو سال ہوئے مولوی عبدالحق صاحب کے چودہ مضامین کا مجموعہ جوان کے شاگرد رشید شیخ چاند مرحوم نے اپنی وفات سے کچھ دن پہلے مرتب کیا تھا، انجمن ترقی اردو نے "چند ہم عصر" کے نام سے شائع کیا۔ ان مضامین میں مولوی صاحب نے اپنے زمانے کے کچھ لوگوں پر تبصرہ کیا ہے۔ جن سے انھیں خاص تعلق تھا یا جن سے وہ خاص طور پر متاثر ہوئے تھے۔ ان میں تین شعراء ہیں یعنی مولانا حالی، حضرت گرامی اور امیر مینائی۔ پانچ اہل علم ہیں یعنی مولوی چراغ علی۔ مولوی سید علی بلگرامی مولوی عزیز مرزا، مولوی وحیدالدین سلیم اور پروفیسر مرزا حیرت۔ چار رہبرانِ قوم ہیں یعنی سید محمود، نواب محسن الملک، خواجہ غلام الثقلین اور مولانا محمد علی۔ ایک باکمال طبیب حکیم امتیاز الدین اور ایک غریب سپاہی "گدڑی کا لال" نور خاں۔ یہی وہ کتاب ہے جس سے ہم خود مولوی صاحب کی سیرت کے متعلق نقادوں کی اصلاح میں کچھ "اندرونی شہادت" فراہم کرنا چاہتے ہیں۔

کتاب کی علمی اور ادبی خوبیوں کے متعلق کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں

معانی کا وزن اور عبارت کی سبک روی، خیالات کی متانت اور بیان کی شگفتگی جذبات کا جوش اور ان کے اظہار میں ضبط و اعتدال، مولوی صاحب کی تحریر کے عام جوہر ہیں اور اس کتاب میں خاص طور پر نمایاں ہیں۔ واقعات کے جمع کرنے میں افراط و تفریط سے پرہیز، جو علمی سیرت نگاری کی شرطیں ہیں پوری طرح ملحوظ رکھی گئی ہیں، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان خاکوں میں جو اس قدر صحت کے ساتھ تیار کئے گئے ہیں رنگ بھرنے میں مصنف کے قلم نے موقلم کا کام کیا ہے اور اس کے جاں بخش اندازِ تحریر نے ان خاموش تصویروں میں جان ڈال دی ہے۔

لیکن اس وقت ہمیں جس چیز سے بحث ہے وہ کچھ اور ہی ہے۔ ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ اس رنگا رنگ مرقع سے مصنف کے رنگ طبیعت کا کیا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہیں آپ یہ امید نہ باندھ لیجئے گا کہ نقش کے اندر سے نقاش کو ڈھونڈ نکالنے کا کام یہ مختصر مضمون پورا کر دے گا۔ اس میں تو صرف چند اشارے ہیں جن سے شاید اس شخص کو، جو اس مہم کو سر کرنے کا بیڑا اٹھائے، تھوڑی بہت مدد مل سکے۔ اس کے لئے ایک تو مولوی صاحب کے واقعات زندگی تفصیل سے جاننے کی اور دوسرے نہ صرف "چند ہم عصر" بلکہ موصوف کی کل تصانیف کے گہرے مطالعے اور ان کے افکار و خیالات کی نفسیاتی تحلیل کی ضرورت ہے صرف اسی طرح سے کسی شخص کے حال کا اس کے قال اور خیال کی روشنی میں

مطالعہ کیا جاسکتا ہے، بڑی محنت اور قابلیت کا کام ہے اور بہت وقت چاہتا ہے۔

امیر مینائی کے ذکر میں مولوی صاحب لکھتے ہیں:۔

"منشی صاحب مرحوم نہایت با اخلاق اور پاک سیرت آدمی تھے۔ تکبر اور عُجب نام کو بھی نہ تھا۔ ہر ایک سے خندہ پیشانی سے پیش آتے، صوم و صلوٰۃ کے بھی پابند تھے۔ وقار اور متانت کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیا۔ علاوہ اس کے شگفتہ بیان تھے۔"

ذرا صفات کی ترتیب کو دیکھئے گا۔ سب سے پہلے حسن خلق اور پاکی سیرت پھر خاکساری اور تواضع پھر صوم و صلوٰۃ کی پابندی پھر وقار اور متانت اور سب سے آخر میں شگفتہ بیانی۔ کیا یہ ترتیب محض اتفاقی ہے یا اس کی تہ میں اخلاقی اقدار کا ایک خاص معیار ہے جس کی رو سے صفائے باطن کو ظاہری تقدس اور درویش صفتی کو مرزا منشی پر ترجیح ہے۔

گرامی اور حالی ہمارے ملک کے دو نامور شاعر تھے جن کے مزاج، عادات اور خصائل ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔ گرامی بقول مولوی صاحب سُچا شاعر تھا۔ ہمارے ہاں شاعر کے لئے جو لوازم سمجھے جاتے ہیں وہ سب اس مرحوم میں موجود تھے۔ بے نیاز و بے پروا، دنیا کے معاملات سے بالکل بے خبر، لاابالی، اگرچہ دنیا کی نظروں میں دیوانہ تھا مگر شعر کہنے میں فرزانہ تھا۔

اکھڑ تھا مگر دل میں خلوص تھا۔ تو اضع اس طرح کرتا تھا جیسے کوئی لڑتا ہے اور یہ اس کے عین خلوص کی علامت تھی۔ دوستی کا سچا اور دوستوں کا قدر دان تھا ضد ضرور تھی مگر وہی بچوں کی سی۔ منانے پر فوراً من جاتا تھا اور دوستوں کا کہنا مان لیتا تھا۔ مگر سچ کہنے میں وہ بڑے بڑوں سے نہیں چوکتا تھا۔"

اور حالی :-

ہماری قدیم تہذیب کا بے مثل نمونہ تھے۔ شرافت اور نیک نفسی ان پر ختم تھی۔ چہرے سے شرافت، ہمدردی اور شفقت ٹپکتی تھی اور دل کو ان کی طرف کشش ہوتی تھی۔ ان کے پاس بیٹھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چیز ہم پر اثر کر رہی ہے۔ درگذر کا یہ عالم تھا کہ کوئی ان سے کیسی ہی بدمعاملگی اور بدسلوکی کیوں نہ کرے کیا مجال کہ اس کی بدسلوکی اور بدمعاملگی کا ذکر زبان پر آئے ایسے لوگ جن سے ہر شخص حذر کرتا جب ان سے ملتے تو ان کے حسن سلوک اور محبت کا کلمہ پڑھتے ہوئے جاتے تھے۔ وہ پرلے درجے کے نکتہ چیں جو دوسروں کی عیب گیری کے بغیر مانتے ہی نہیں ان کے ڈنک یہاں آکر گر جاتے تھے۔"

تعجب ہوتا ہے کہ ایک ہی شخص ایک آہوئے ختن اور ایک غزال حرم کا ذکر یکساں جوش اور محبت کے ساتھ کرتا ہے، ایک کی وحشت اور دوسرے کے انس کو یکساں سراہتا ہے جو گرامی کے جذب اور حالی کے سلوک کی برابر قدر

کرتا ہو یقیناً اتنا وسیع قلب رکھتا ہے کہ اس میں دونوں متضاد طبیعتوں کے لئے جگہ ہے بلکہ شاید خود اس کی طبیعت میں یہ دونوں رنگ موجود ہیں۔

حالیؔ سے مولوی صاحب کو بہت گہری عقیدت ہے۔ فرماتے ہیں:-

"کتنا ہی بُرا زمانہ کیوں نہ ہو، دنیا اچھوں سے خالی نہیں ہوتی۔ اب بھی بہت سے صاحب علم و فضل، باکمال، ذی وجاہت، نیک سیرت، نیک دل لوگ موجود ہیں مگر افسوس ہے کوئی حالیؔ نہیں" دیکھنا یہ ہے کہ حالیؔ میں وہ کونسی صفت تھی جو مولوی صاحب کی نظر میں علم و فضل، وجاہت، نیکی ان سب سے بڑھ کر مرحوم کی خصوصیت تھی۔ اور جس میں کوئی ان کا ہمسر نہیں۔ سنئے:-

"ایک صاحب جو علی گڑھ کے گریجویٹ اور حیدر آباد میں ایک معزز عہدے پر فائز تھے، مولانا سے ملنے آئے، ٹمٹم پر سوار تھے۔ زینے کے قریب اترنا چاہتے تھے، سائیس کی جو شامت آئی تو اس نے گاڑی دو قدم آگے کھڑی کی۔ یہ حضرت ذرا سی چوک پر آپے سے باہر ہو گئے۔ اور سڑاسڑ کئی ہنٹر اس غریب کے رسید کر دیئے۔ مولانا یہ نظارہ اوپر برآمدے میں کھڑے دیکھ رہے تھے۔ اس کے بعد وہ کھٹ کھٹ سیڑھیوں پر سے اوپر چڑھ آئے مولانا سے ملے، مزاج پرسی کی اور کچھ دیر باتیں کر کے رخصت ہو گئے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ مولانا کا چہرہ بالکل متغیر تھا۔ وہ برآمدے میں ٹہلنے جاتے تھے

اور کہتے تھے، ہائے ظالم نے کیا کیا، اس روز کھانا بھی اچھی طرح نہ کھا سکے۔ کھانے کے بعد قیلولے کی عادت تھی، وہ بھی نصیب نہ ہوا۔ فرماتے تھے، یہ معلوم ہوتا ہے وہ ہنٹر کسی نے میری پیٹھ پر مارے ہیں۔ اس کیفیت سے جو درد و کرب مولانا کو تھا وہ بدنصیب سائیس کو بھی نہ ہوا ہوگا"۔

مولانا کی سیرت میں دو ممتاز خصوصیتیں تھیں، ایک سادگی اور دوسرے دردِ دل"۔ یہ دردِ دل ہے شاعر کی جان، انسان کا جوہر، جس نے حالی کو حالی اور مولوی عبدالحق کو حالی کا معتقد بنا دیا۔ دردِ دل کی قدر اہلِ دل ہی کرسکتے ہیں۔

اب ذرا یہ بھی دیکھ لیجیے کہ جن اہلِ علم کا ذکر اس کتاب میں ہے ان کی کونسی صفات خصوصیت کے ساتھ مولوی صاحب کے دل کو اپنی طرف کھینچتی ہیں:۔

مرزا حیرت ایک ایرانی عالم تھے جو زندگی کی بہت سی راہوں سے بھٹکنے کے بعد ۱۸۷۳ء میں الفنسٹن کالج ممبئی میں فارسی کے پروفیسر ہو گئے تھے۔ ان کا علم اس قدر وسیع اور ان کا حافظہ اس قدر وسیع تھا کہ اگر حافظ اور سعدی کی تصانیف دنیا سے مٹ جائیں تو وہ صرف اپنے حافظہ سے بلا کم و کاست پھر پیدا کرسکتے تھے۔ ان کو اساتذہ کے ہزارہا عربی اور فارسی

اشعار یاد تھے اور موقع پر بلا تائل سیکڑوں اشعار پڑھتے چلے جاتے تھے۔ عربی اور فارسی انشا پردازی میں وہ عدیم النظیر تھے۔ بہت کم لوگ یہ جانتے تھے کہ وہ ایک اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے۔ طبیعت میں اس قدر آمد تھی کہ بلا مبالغہ ایک دریا ہے کہ امڈا چلا آرہا ہے اور جو بات منہ سے نکلتی ہے موزوں نکلتی ہے وہ ایک بڑے فلاسفر اور انسانی فطرت کو نظر غائر سے دیکھنے والے تھے۔ وہ اپنی قوم کے تمام علوم و فنون سے واقف تھے۔ اور در حقیقت ایک زندہ انسائیکلو پیڈیا تھے۔"

کیا یہی صفات ہیں جن کی بنا پر وہ مولوی صاحب کے خیال میں پروفیسری کے عہدے کے لئے نہایت موزوں تھے بلکہ وہ مثال تھے اس امر کی کہ ایک عمدہ سے عمدہ پروفیسر ایسا ہونا چاہیئے؟" نہیں۔ وسعت معلومات دقت نظر، قوت حافظہ، موزونی طبع ایسی چیزیں نہیں جو ہندوستان میں کمیاب ہوں۔ مگر عمدہ پروفیسر اس ملک میں کمیاب کیا نایاب ہیں۔ پھر مرزا حیرت میں کیا بات تھی جس کی وجہ سے مولوی صاحب انھیں عمدہ سے عمدہ پروفیسر کی مثال قرار دیتے ہیں؟ ایک تو ان کی اصول پرستی، دوسرے ان کا استغنا۔" سترہ برس کی عمر میں گیلان کی صوبہ داری نظر کی گئی، مگر مرزا حیرت نے اسے قبول نہ کیا۔ کیونکہ ایران میں یہ دستور ہے کہ جب کوئی شخص کسی اعلیٰ عہدے کے لئے منتخب کیا جاتا ہے تو اسے شاہی خزانہ میں معتد بہ

رقم داخل کرنی پڑتی ہے اور جب وہ اپنی جگہ پر قابض ہو جاتا ہے تو خوب ہاتھ رنگتا ہے اور جتنا دیتا ہے اس سے بیس گنا وصول کرتا ہے۔ انھوں نے اس جبر و تعدی اور اس سلسلۂ ظلم و ستم کو نہایت ناپسند کیا اور یہ ہرگز روا نہ رکھا کہ غریب رعایا کا خون چوس چوس کر اپنے تن و توش کو پھلایا جائے۔" پروفیسری یا منصب درس و ہدایت تحقیقِ حق اور تلقینِ حق کا نام ہے اور حق کے دو پہلو ہیں، ایک ذہنی اور دوسرا اخلاقی، جنھیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا صرف وہی شخص جو اخلاق و عمل کے میدان میں حق کو ناحق پر ترجیح دے اور اس کی خاطر ہر طرح کی قربانی کرنے پر تیار ہو علم کے میدان میں حق کا علمبردار ہو سکتا ہے۔

مرزا صاحب ہر چیز سے درگذر کر سکتے تھے مگر جھوٹ اور دنائت کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ انھیں اپنے فرض منصبی کا بہت بڑا خیال تھا اور اپنے فرض کے ادا کرنے میں اپنی صحت تک کی پروا نہ کرتے تھے؟! اگر ہم یہ سوچیں کہ ہم میں سے جو لوگ پروفیسر کہلاتے ہیں ان پر یہ قول کس حد تک صادق آتا ہے تو شرم سے سر جھکا کر رہ جائیں گے۔ ادائے فرض میں انتہائی انہماک، اپنی ذات کو اپنے کام میں محو کر دینا، یہی سچے استاد یا پروفیسر کی شان ہے۔ کیا مرزا حیرت کی اصول پرستی، فرض شناسی، خصوصاً ان کے استغنا سے مولوی صاحب کے دل کا متاثر ہونا دو سازوں کی ہم آہنگی کی دلیل

ہے؛ اس سوال کے جواب کے لئے اس بات پر غور کیجئے کہ خود مولوی صاحب باوجود اس کے کہ انہیں حیدر آباد میں غیر معمولی اثر و اقتدار حاصل تھا کچھ کم پچاس برس کی خدمت میں عثمانیہ یونیورسٹی کی پروفیسری سے اوپر نہیں گئے۔ سچ پوچھئے تو مسند علم کی وہ منزلت ہے کہ جاہ و دولت کی طمع میں اس سے اوپر جانا حقیقت میں نیچے اترنے کے برابر ہے۔

مولوی چراغ علی کا ذکر ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے: "نواب اعظم یار جنگ، مولوی چراغ علی مرحوم ان لوگوں میں سے تھے جو اپنے بل بوتے پر آپ کھڑے ہوئے۔ اور اپنی محنت سے دنیا میں جاہ و ثروت و لیاقت و فضیلت حاصل کی۔ اپنے سہارے آپ کھڑے ہونا خدا کی بڑی نعمت اور بڑے پن کی علامت ہے۔ جو دوسروں کا سہارا تکتا رہتا ہے وہ خود کبھی نہیں بڑھتا ہے اور جو بڑھتا ہے تو جتنا پاتا ہے اس سے زیادہ کھوتا ہے۔" ہمارے زمانے میں جب کہ ترقی کا راز "مربی بیار د مربے بخور" سمجھا جاتا ہے۔ کوئی بیل کی طرح طفیلی بن کر بڑے درخت سے لپٹتا ہے۔ کوئی گیدڑ کی طرح شیر کے شکار کا آسرا لگائے بیٹھا رہتا ہے کوئی ماہتاب کے مانند آفتاب کی روشنی میں چمکتا ہے۔ خودی اور خود داری کا پیام سنانے والا اور اس کا عملی نمونہ پیش کرنے والا ایک اقبال تھا۔ مندرجہ

بالا عبارت پڑھ کر خوشی ہوتی ہے کہ اقبال کا ہم نوا اور ہم مشرب ایک اور شخص بھی موجود ہے۔

ایک جگہ لکھتے ہیں۔ ”انسان نہیں رہتا لیکن اس کے اعمال رہ جاتے ہیں جو کسی کے مٹائے نہیں مٹ سکتے۔ یہی اس کی پونجی، یہی اس کی آل اولاد اور یہی اس کی کمائی ہے۔ اولاد مرحوم کی بھی ہے۔۔۔ اور کون جان دار ہے جو اس پر نازاں نہیں بلکہ جتنے ادنیٰ اور ذلیل جانور ہیں ان کی اتنی ہی زیادہ اولاد ہوتی ہے۔ چنانچہ بعض کیڑے ایسے ہیں کہ ان کے ایک گھنٹہ میں ہزاروں بلکہ لاکھوں بچے پیدا ہو کر مر جاتے ہیں، لیکن اس کا نام اس کے کام سے ہے۔ آج جو ہم مرحوم کو یاد کر رہے ہیں تو کیا ان کی اولاد اور مکانات اور جاہ و ثروت کی وجہ سے؟ ہرگز نہیں یہ سب آنی جانی چیزیں ہیں۔ بلکہ ان کے کیریکٹر اور کام کی وجہ سے اس سے اس بات پر روشنی پڑتی ہے کہ خود مولوی صاحب کا گرہستی کے جنجال ہیں نہ پڑنا محض سہولت پسندی نہ تھی بلکہ ان کا عمل کسی اصول کے ماتحت تھا۔ ہمارے ملک میں صحرانشین سادھوؤں کی کمی نہیں مگر علائق کے سمندر کے بیچوں بیچ تجرد کے ٹاپو میں رہنے والے بہت کم نظر آتے ہیں۔ اور یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے ترک تعلق کی وجہ روحانی خود غرضی یا عافیت پسندی نہیں ہوتی بلکہ کسی فوق الافراد مقصد کو حاصل کرنے کی دھن۔

مولوی سید علی بلگرامی کے تبحّر اور جامعیت کے مولوی صاحب دل سے معترف ہیں۔ فرماتے ہیں:۔ "مرحوم ہندوستان کے عہد جدید کے ان نامور علماء میں سے ہیں جنہوں نے علوم السنۂ مشرقیہ و مغربیہ میں کمال پیدا کر کے ہند کے تمدن، علمی ترقی اور روشن خیالی میں ایک نئی شان پیدا کی۔ یہ لوگ دراصل جدید تعلیم کے رہبر اور رہنما ہیں۔ ان کے فضل و کمال کا مولوی صاحب کی نظر میں وہ درجہ تھا اور ان سے اتنی توقعات تھیں کہ ان کی علمی کارگذاری کو کسی معمولی کسوٹی پر کسا نہیں بلکہ بہت اونچے معیار پر پرکھا ہے۔ ان کی تالیفات اور تراجم کی فہرست گنوا کر جو ایک ایسے شخص کے لئے جس کی زندگی زیادہ تر علمی خدمات میں گذری کچھ کم نہیں، لکھتے ہیں۔ "جب ان کے کام پر نظر ڈالی جاتی ہے تو افسوس کے ساتھ یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ان کے علم کے مقابلے میں ان کا عمل بہت ہی کم تھا۔ دکن کی آب و ہوا اور خاص کر یہاں کے حالات اس وقت کچھ ایسے تھے کہ آدمی کرتا بھی ہو تو کچھ نہ کر سکے۔ خصوصاً مرحوم کی سی بے چین اور متلون طبیعت کے لئے اس دلدل سے نکلنا دشوار تھا۔" کہیں ایسا تو نہیں کہ اس عبارت میں غائب کی ضمیر متکلم کی طرف بھی راجع ہو۔ اور تنقید غیر کی یہ انتہائی سخت گیری اس لئے ہو کہ اس میں تنقید ذات چھپی ہوئی ہے۔

علم و فضل کے علاوہ مرحوم کی جو باتیں مولوی صاحب کو خاص طور پر محبوب ہیں انھیں بھی سن لیجیے۔ "مرحوم اہل علم کی بڑی قدر کرتے تھے، اور

جب ایسے لوگوں میں سے کوئی اُن سے ملنے جاتا تو اس سے ملتے ہیں کبھی عذر نہ کرتے خواہ کیسے ہی ضروری کام میں مصروف ہوں۔ اگر اس اثنا میں کوئی بڑا آدمی آجاتا تو اس سے بہت جلد پیچھا چھڑا لیتے تھے۔ لوگ اپنے ہمعصروں کے کمال کی داد دینے میں بڑا بخل کرتے ہیں لیکن مرحوم اس میں بڑے فیاض تھے۔" بہت بامروت تھے۔ اگر کوئی شخص کسی قسم کی درخواست کرتا اور وہ اسے پوری نہ کر سکتے تو خاموش ہو رہتے مگر جب وہ دوسری بار پھر آتا تو اس شرمندگی میں سب سے مقدم اس کا خیال کرتے اور حتی الامکان اس کی مقصد براری میں کوشش کرتے یہاں تک کہ کتابیں جو انہیں بہت عزیز تھیں ان کے دینے میں بھی تامل نہ تھا۔ بشرطیکہ سچا قدردان ہو۔"

سید محمود مرحوم کی غیر معمولی دماغی قابلیت، جدت طبع، وسعت نظر، خوش بیانی، بذلہ سنجی کے افسانے ہمارے ملک میں مشہور ہیں۔ مولوی صاحب بھی ان کے ان اوصاف کو سراہتے ہیں۔ "اس کا نام بہت سے ایسے لوگوں سے زیادہ مشہور ہے جن کی تصانیف پوٹ کی پوٹ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا نے اسے ایسا جوہر عطا کیا تھا جس کے سامنے بڑی بڑی تصانیف کی کچھ حقیقت نہیں۔ وہ جوہر اس کی غیر معمولی قابلیت تھی جو نہ امتحانات کے پاس کرنے سے حاصل ہوئی ہے، نہ کتابوں کے پڑھنے اور فضیلت کی دستار

باندھنے سے۔" ۔ "محمود کا دماغ قانون کے لئے خاص طور پر بنایا گیا تھا ان کے فیصلوں سے اُن کی حذاقت، تحقیق، وسعتِ نظر اور ذوقِ سلیم کا کافی ثبوت ملتا ہے۔ بڑے بڑے ماہرینِ فن اور اساتذہ ان کے فیصلوں کو دیکھ کر عش عش کرتے ہیں۔ ہر فن میں خواہ ادب ہو یا فلسفہ و تاریخ وغیرہ وہ ایسی ایسی باریکیاں پیدا کرتے تھے کہ خود اس فن کے ماہرین دنگ رہ جاتے تھے...... اس کی ظرافت بھی عجب شان کی ظرافت تھی۔ اس کے ایک ایک ٹھٹول میں وہ وہ نکات ہوتے تھے جو عمر بھر کے مطالعے اور کتابوں کے کھنگالنے سے بھی حاصل نہیں ہو سکتے۔ اس کی گفتگو میں وہ سحر تھا جو میں نے آج تک کسی میں نہیں دیکھا۔"

لیکن جس غیر معمولی جوش اور زور کے ساتھ ان کی قناعت، عزلت پسندی اور شہرت سے بے پروا ہونے کا ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب کے دل پر گہرا اثر ڈالنے والی حقیقت میں یہی چیزیں ہیں۔ "سننے باوجود اس لیاقت اور ثروت کے اس نے اپنی زندگی درویشانہ بسر کی، شہرت اور دولت اور حکومت جن سے ایک عالم میں ہیجان اور انقلاب برپا ہے اور جن کی آگ قریباً ہر سینے میں مشتعل ہے، وہ ان کی آنچ سے بالکل محفوظ تھا وہ چاہتا تو اس قدر دولت اور شہرت حاصل کرتا جو دوسرے کی قدرت سے باہر ہے لیکن ان چیزوں کو مستانہ وار ٹھکرا کر چلا گیا...... یہ شیر بیشۂ عزلت

کہا کرتا تھا۔ "کیا حاصل ہے شہرت سے؟ یہی نا کہ لوگ ہمارے نام سے واقف ہو جائیں، اگر یہی ہے تو کیوں نہیں ہزاروں لاکھوں کارڈ اپنے کام اور نام درج کر کے تقسیم کر دیں تاکہ ایک دنیا ہمارے نام سے واقف ہو جائے۔ اور پھر سیٹھ خوش ہو لیں!"

مولوی صاحب عمل کے پرستار ہیں لیکن ان تنگ نظر لوگوں میں سے نہیں جو انسان کی قدر و قیمت ناپنے کے لئے عمل کے سوا اور کوئی پیمانہ جانتے ہی نہیں۔ آخر عمل کا مقصد یہی ہے تاکہ انسان کی قوتوں کو درجۂ کمال تک پہنچا دے یا پھر اگر خود قدرت نے کسی شخص کو کمال عطا کیا ہو تو کیا وجہ ہے کہ ہم عمل سے قطع نظر کر کے محض اس کے جوہر ذات کی قدر نہ کریں۔ قدرت کی صناعی کے اعلیٰ نمونے خود بخود دلوں کو متاثر کرتے ہیں اور ان کی یہ تاثیر بھی حقیقت میں ایک بے ارادہ اور بے مشقت عمل ہے۔ چاہے اس پر انسانی عمل کی تعریف صادق نہ آئے۔ "بڑی عظیم الشان چیز گو وہ عملی لحاظ سے کیسی ہی ساکت و صامت ہو لیکن اس کے وجود ہی سے دنیا پر اس قدر اثر پڑتا ہے جو بڑے بڑے کاموں سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ تاروں بھری رات کو جب ہم نیلگوں آسمان پر نظر ڈالتے ہیں جس کی وسعت کی کوئی انتہا نہیں تو کیا ہمارے دل و دماغ پر کوئی عمدہ اثر نہیں پڑتا، جب ہم سمندر کے کنارے کھڑے ہو کر اس وسیع سطح اور بے چین موجوں کو دیکھتے ہیں تو

کیا اس سے ہمارے قلب پر عجیب وغریب کیفیت پیدا نہیں ہوتی؟ یہی حال ان وسیع النظر عالی دماغ لوگوں کا ہے۔ گو وہ کچھ نہ کریں لیکن ان کا اثر نہایت پر زور اور عجیب و غریب ہوتا ہے۔" آپ نے دیکھا کہ مولوی صاحب اشخاص اور اشیا کو جمالیاتی نقطۂ نظر سے بھی دیکھ سکتے ہیں لیکن اس تشبیب کے بعد گریز ملاحظہ ہو۔ "میں اخیر زمانے میں سید محمود کو ایک شاندار انسانی کھنڈر کہا کرتا تھا۔ لیکن کیا کھنڈر ہم کو عزیز نہیں ہوتے؟" اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مولوی صاحب کا اصلی نقطۂ نظر اخلاقی ہے۔ جمالیاتی قدر کو وہ نظر انداز نہیں کرتے۔ لیکن اخلاقی قدر کے تابع رکھتے ہیں۔ "شان دار انسانی کھنڈر" کا دردناک فقرہ یہ بتاتا ہے کہ گو ان کے دل میں سید محمود کی انتہائی قدر و محبت ہے۔ لیکن اس مرحوم کی زندگی کو ایک برباد اور ناکام زندگی سمجھتے ہیں۔

نواب محسن الملک مرحوم کا ذکر پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب باوجود اپنی اخلاقی سخت گیری کے ارباب سیاست کی مشکلوں اور ضرورتوں کو جانتے ہیں اور ان کی حکمت عملی اور مصلحت پرستی کو، اگر وہ حدودِ شرافت کے اندر اور اعلیٰ مقاصد کے تابع ہو، نہ صرف جائز بلکہ قابل قدر سمجھتے ہیں۔ "ریاستوں میں نوکری کرنا اور اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں، وہاں سازشوں، ترغیبوں، پیچیدگیوں کا ایسا جال بچھا ہوتا ہے کہ بڑے بڑے شاطر، تیز نظر اور

ہوش مند بھی پھنس ہی جاتے ہیں اور اگر کچھ کرنا ہے تو دانستہ یا نادانستہ بالواسطہ یا بلاواسطہ پھنسنا ہی پڑتا ہے۔ البتہ فرق اتنا ہے کہ اکثر تو ذاتی اغراض کے لئے یہ سب جتن کرتے ہیں مگر خاص خاص لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ریاست کی بہبودی کی خاطر اپنا سر اوکھلی میں دے دیتے ہیں۔ ان چند مخصوص لوگوں میں نواب محسن الملک کا بھی شمار ہے۔ اس اکھاڑے میں اترنا اور نلوہ نکل آنا اصل حکمت اور تدبر ہے اور یہ کوئی محسن الملک سے سیکھتا۔" لیکن اسی کے ساتھ ہی مولوی صاحب اس حقیقت سے بے خبر نہیں کہ :-

به دریا در منافع بے شمار است

اگر خواہی سلامت بر کنار است

چنانچہ اوپر کی عبارت کے سلسلے میں ایک مختصر سا جملہ ریاستی سیاست کے عبرتناک انجام کو دکھاتا ہے۔ "لیکن باوجود اس قدر مدبر، ہوشمند اور شاطر ہونے کے آخر وہ خود بھی اس کا شکار ہوئے۔"

مولوی صاحب کے مذاق کی خاص چیز جو محسن الملک میں تھی وہ یہ تھی "ان میں پارس پتھر کی خاصیت تھی۔ کوئی ہو، کہیں کا ہو، ان سے چھوا نہیں اور کندن ہوا نہیں۔ اگر کسی نے سلام بھی کر لیا تو ان پر اس کا بار رہتا تھا اور جب تک اس کا معاوضہ نہ کر لیتے ان کو چین نہ آتا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے دشمن کو بھی نہیں بھولتے تھے۔" یہی وجہ تھی کہ نواب محسن الملک کی رخصت کے وقت

حیدر آباد میں کہرام مچ گیا تھا اور ہزار ہا آدمیوں کا ٹھٹھ اسٹیشن کے باہر اور اندر لگا ہوا تھا۔ سینکڑوں آدمی جن میں غریب، بیوائیں، یتیم سبھی تھے زار و قطار رو رہے تھے۔"

سیاسی رہبروں اور قومی مصلحوں کے لئے سب سے بڑی صفات مولوی صاحب کے نزدیک اعتدال، ضبط نفس اور استقلال ہیں۔ ان ہی صفات کی کمی کی وجہ سے وہ مولانا محمد علی کی شخصیت کو نہایت عزت و وقعت کی نظر سے دیکھنے اور اس کی شوکت و عظمت کے قائل ہونے کے باوجود ناممکل سمجھتے ہیں۔

"وہ انگریزی کا بہت بڑا ادیب اور زبردست انشا پرداز اور اعلیٰ درجہ کا مقرر تھا۔ لیکن جب لکھنے اور بولنے پر آتا تو اعتدال اور تناسب دونوں نظروں سے اوجھل ہو جاتے تھے۔۔۔۔ وہ آزادی کا دلدادہ اور جبر و استبداد کا پکا دشمن تھا لیکن اگر کبھی اس کے ہاتھ میں اقتدار آتا تو وہ بہت بڑا جابر اور مستبد ہوتا، وہ محبت اور مروت کا پتلا تھا اور دوستوں پر جان نثار کرنے کے لئے تیار رہتا تھا، مگر بعض اوقات ذرا سی بات پر اس قدر آگ بگولا ہو جاتا تھا کہ دوستی اور محبت طاق پر دھری رہ جاتی تھی۔۔۔۔۔۔۔ تکمیل کو پہنچانا اس کی طبیعت ہی میں نہ تھا۔۔۔۔۔ مرحوم ہر اعتبار سے ایک دیو پیکر شخص تھا۔ اس کے رفقاء اور ہمعصر اس کے سامنے بودے تھے مگر افسوس اسے اپنے اوپر قابو نہ تھا اور یہی اس

کی ناکامی کی اصل تھی:"

خواجہ غلام الثقلین مرحوم مولوی صاحب کے بہت پرانے دوست اور ہمعصر تھے۔ اور نوعمری سے ان کی سیرت کی نشو ونما مولوی صاحب نے دیکھی تھی، وہ طالب علمی کے زمانے میں بھی اپنے مطالعے اور وسیع معلومات کی وجہ سے ممتاز تھے۔ اور تمام طالب علم (سوائے بعض کھلنڈروں کے) اور پروفیسر انہیں وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ یونین کلب میں ان کی تقریروں کی آتش افشانی اور اخوان الصفا میں ان کے مضامین کی فصاحت بیانی مشہور تھی۔ وہ اس قدر راست باز اور بے لاگ تھے کہ سچ بات کے کہنے میں کسی کی پروا نہیں کرتے تھے۔ اور اس لیے بعض لوگ ان سے خوش نہیں رہتے تھے۔ مگر ان کی لیاقت اور سچائی کے سب قائل تھے۔ اور خود سر سید مرحوم انھیں محض ان کی قابلیت کی وجہ سے عزیز رکھتے تھے۔ مگر اختلاف کرنے میں وہ ان سے بھی نہ جھجکتے تھے حالانکہ ان کے سامنے بڑے بڑوں کے پر جلتے تھے۔" اگرچہ خواجہ صاحب میں وہ باتیں موجود تھیں جو مولوی صاحب کی میزان قدر میں سب سے زیادہ وزن رکھتی ہیں اور مولوی صاحب کو ان سے دلی انس تھا لیکن دیانت علمی کے تقاضے سے ان خامیوں کے دکھانے میں تامل نہیں کرتے جو قبل از وقت نشو ونما پا جانے والی طبیعتوں میں قدرتی طور پر موجود ہوتی ہیں۔ "خواجہ صاحب طبعاً ذکی الحس واقع ہوئے

تھے۔ اُن پر بعض اوقات ناکامیابی کا بہت برا اثر پڑتا تھا ..... وہ زیادہ دیر تک ناکامیابی کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ اور بہت جلد پریشان ہو جاتے تھے۔"

"آخر کار ان کی طبیعت میں ایک خاص اعتدال پیدا ہو گیا تھا اور ان میں وہ اضطراب اور پریشانی اور وہ ضد نہیں رہی تھی جو پہلے تھی۔" اس کے معنی یہ ہیں کہ خواجہ صاحب مرحوم میں جہاں طبعاً پارے کی خاصیت تھی وہاں انھیں کیمیائے سعادت کا وہ نسخہ بھی معلوم تھا جس کی بدولت وہ پارے کو سونا بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کی سیرت پر مجموعی نظر ڈالتے ہوئے مولوی صاحب فرماتے ہیں:" ایسے وقت میں جب کہ بے لاگ اور بے ریا کام کرنے والوں کی شدید ضرورت ہے، جب کہ قومی ترقی کے لئے ہر شعبہ میں انسانوں کی تلاش ہے، جبکہ کام بہت ہیں اور کام کرنے والے کم، ایک صائب الرائے معتدل مزاج، بے لاگ اور باخلوص کام کرنے والے کا اُٹھ جانا غضب ہے" صائب الرائے، معتدل مزاج، بے لاگ اور باخلوص کام کرنے والا۔ سیدھے سادھے الفاظ ہیں مگر ذہنی اور اخلاقی صفات کے امتزاج کو ظاہر کرنے کے لئے ان سے زیادہ جامع الفاظ ہماری زبان میں شاید ہی مل سکیں۔

بڑے لوگوں کی اس فہرست میں ایک ان پڑھ غریب سپاہی "نور خاں" کا نام دیکھ کر شاید بعض لوگوں کو تعجب ہو۔ لیکن یہ وہی لوگ ہوں گے جو

اب تک یہ نہیں سمجھے کہ مولوی صاحب بڑائی کے پرستار نہیں بلکہ انسانیت کے شیدا ہیں۔ فرماتے ہیں۔ "لوگ بادشاہوں اور امیروں کے مقبرے اور مرثیے لکھتے ہیں، نامور اور مشہور لوگوں کے حالات قلمبند کرتے ہیں، میں ایک غریب سپاہی کا حال لکھتا ہوں اس خیال سے کہ شاید کوئی پڑھے اور سمجھے کہ دولتمندوں امیروں اور بڑے لوگوں ہی کے حالات لکھنے اور پڑھنے کے قابل نہیں ہوتے بلکہ غریبوں میں بھی بہت سے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی زندگی ہمارے لئے سبق آموز ہوسکتی ہے، انسان کا بہترین مطالعہ انسان ہے اور انسان ہونے میں امیر غریب کا کوئی فرق نہیں۔"

آپ کہیں گے کہ آخر نور خاں میں ایسے کیا لعل ٹکے تھے کہ مولوی صاحب نے انھیں "گدڑی کا لعل" کہا۔ سنئے "خاں صاحب میں بعض ایسی خوبیاں تھیں کہ بڑے لوگوں میں بھی نہیں ہوتیں۔ سچائی بات کی اور معاملے کی، ان کی سرشت میں تھی، خواہ جان ہی پر کیوں نہ بن جائے وہ سچ کہنے میں کبھی نہیں چوکتے تھے.... مستعد ایسے تھے کہ اچھے اچھے جوان ان کا مقابلہ نہیں کرسکتے تھے.... دن ہو رات ہو ہر وقت کام کرنے کے لئے تیار، کسی کام کو کہئے تو ایسی خوشی خوشی کرتے تھے کہ کوئی اپنا کام بھی اس قدر خوشی سے نہ کرتا ہوگا۔ دوستی کے بڑے پکے اور بڑے وضع دار تھے...... ان کا گھر مہمان سرائے تھا۔ خود دار ایسے تھے کہ کسی کے ایک پیسے کے بھی روادار نہ تھے... بہت زندہ دل

تھے، چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ رہتی تھی جسے دیکھ کر خوشی ہوتی تھی۔ وہ بچوں میں بچے اور جوانوں میں جوان اور بوڑھوں میں بوڑھے تھے، غم اور فکر کو پاس نہ آنے دیتے تھے۔ ہمیشہ خوش رہتے تھے اور دوسروں کو خوش رکھتے تھے۔"

"وہ حساب کے کھرے، بات کے کھرے اور دل کے کھرے تھے۔ وہ مہر و وفا کے پتلے اور زندہ دلی کی تصویر تھے۔ ایسے نیک نفس، ہمدرد، مرنج و مرنجاں اور وضع دار لوگ کہاں ہوتے ہیں، اُن کے بڑھاپے پر جوانوں کو رشک آتا تھا اور ان کی مستعدی دیکھ کر دل میں اُمنگ پیدا ہوتی تھی۔ ان کی زندگی بے لوث تھی اور ان کی زندگی کا ہر لمحہ کسی نہ کسی کام میں صرف ہوتا تھا۔ قومیں ایسے ہی لوگوں سے بنتی ہیں، کاش ہم میں بہت سے نورخاں ہوتے۔"

ہم بہت مختصر مضمون لکھنا چاہتے تھے۔ مگر اقتباسات کی وجہ سے بہت طویل ہو گیا۔ آپ گھبرایئے نہیں بس اب چند سطروں میں ختم ہوتا ہے، ہم آپ کو پھر ایک بار اس نکتے کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ کسی شخص کی سیرت کی گہرائیوں کو سمجھنے کے لئے خود اس کی شہادت کی بھی ضرورت ہے مگر بلاواسطہ شہادت اس معاملے میں اتنی اہمیت نہیں رکھتی جتنی بالواسطہ شہادت، کیونکہ خود اپنا

ذکر کرتے ہوئے انسان عموماً انکسار یا افتخار، خود پوشی یا خود نمائی سے کام لیتا ہے۔ اور اصلیت کو گھٹا کر یا بڑھا کر بیان کرتا ہے۔ دوسروں کا ذکر کرتے وقت وہ غیر شعوری طور پر اپنی حالت کو ظاہر کر دیتا ہے۔ اگر اس کی شخصیت کا صحیح اندازہ مقصود ہو تو یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ وہ کن لوگوں کو پسند کرتا ہے، ان کی کونسی صفات اسے کس حد تک متاثر کرتی ہیں۔ اس نکتے کو مدنظر رکھ کر مولوی عبدالحق کی تنقیدی تحریروں، خصوصاً "چند ہم عصر" کا مطالعہ کیجیے۔ ان رنگارنگ صورتوں میں خود ان کی سیرت کی جھلک دیکھیے اور عالمِ تصور میں ان کی زبان سے یہ شعر سن کر لطف اٹھائیے۔

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

سچّا افسانہ

وسط یورپ کے مشہور شہر میں ہندوستان کے چند نوجوان تعلیم پاتے ہیں۔ جوانی کا جوش، بڑھے ہوئے ارادے، بلند خیالات، ایک زندہ قوم کی مثال ان سب باتوں کا مجموعی اثر یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنی آیندہ زندگی کو ملک و ملت کی خدمت میں صرف کرنے کا قصد کر لیا ہے۔ چونکہ سب کے سب علمی مذاق رکھتے ہیں اس لئے انھوں نے اپنا قصدِ زندگی یہ قرار دیا ہے کہ ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کو یورپ کی ذہنی غلامی سے نجات دلائیں۔ انھیں احساس ہے کہ یورپ نے اپنے علوم کی بیڑیاں خود ان کے پیروں میں بھی ڈال دی ہیں لیکن وہ جانتے ہیں کہ ان بیڑیوں میں جو لوہا لگا ہے وہ بجائے خود مفید چیز ہے اور اگر کسی میں ہمت و جرأت ہو اور توفیق الٰہی اس کا ساتھ دے تو وہ ان بیڑیوں کو گلا کر تیر اور تلوار بنا سکتا ہے جو دشمنوں کے دل میں ڈر اور دوستوں کے دل میں عزت و احترام پیدا کرتی ہے۔ عقل سلیم نے انھیں بتایا ہے کہ اگر ان کے ایک ہاتھ میں مشرقی تمدن کی ڈھال اور دوسرے ہاتھ میں مغربی

تہذیب کی تلوار ہو تو وہ دنیا کی ساری قوموں سے پکار کر کہہ سکتے ہیں کہ اگر تمہارے دل میں بدی ہے تو آؤ یہ تلوار تمہیں برباد کر دے گی اور یہ ڈھال ہمیں بچائے گی لیکن اگر تمہاری نیت نیک ہے تو ہم اس تیغ کو نیام میں اور اس سپر کو دوش پر رکھ لیتے ہیں۔ چلو صلح اور آشتی کی راہ پر۔ دیکھیں کون بڑھ کر قدم رکھتا ہے۔

یہ ہمتیں اور یہ ارادے ہیں ان نوجوانوں کے مگر دنیا میں بڑے کام کرنے والے کے لئے محض ہمت اور ارادہ کافی نہیں جب تک تجربہ اور معلومات دانائی اور تدبیر، احتیاط اور استقلال شریک کار نہ ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ صفات نوجوانوں کو نصیب نہیں۔ یہ اُس پیرِ دانش کے حصے میں آتی ہیں جس کی رگوں میں خون کی گردش معتدل ہو چکی ہو اور جس کی بصیرت میں ذہنی قوتیں امتزاج پا چکی ہوں۔ ان نوجوان سپاہیوں کو تلاش ہے ایک پیر مرد کی جو ان کا سالار بنے۔ یہ ایسا سالار چاہتے ہیں جس نے مشرق و مغرب کے درمیان کی دشوار گذار گھاٹیوں کو طے کیا ہے اور دونوں میدانوں میں داد شجاعت دی ہے۔ جس نے رن دیکھے ہیں اور معرکے جیتے ہیں۔ جس نے سختیاں جھیلی ہیں اور مشکلوں پر فتح پائی ہے۔ یہ لوگ چشم تصور سے ہندوستان کے تمام سربرآوردہ مسلمانوں کو دیکھتے ہیں مگر کوئی ان کے کام کا نظر نہیں آتا۔

ایک دن خبر آتی ہے کہ ایک قریب کے شہر میں ہندوستان سے ایک مسیحا نفس حکیم آرہا ہے۔ یہ نوجوان امید و بیم کی کشمکش دل میں لئے ہوئے اس کے پاس حاضر ہوتے ہیں۔ یہ منظر جہاں ولولۂ شباب دبدبۂ پیری کے آگے سر نیاز خم کرتا ہے۔ دیکھنے کے قابل ہے۔ پہلی نظر امید دلاتی ہے کہ جس رہنما کی انھیں تلاش تھی وہ مل گیا ہے اور پہلی گفتگو اس امید کو یقین سے بدل دیتی ہے۔ وہ ان کے خیالات کو غور و فکر اور شفقت و محبت سے سنتا ہے اور رکے ہوئے الفاظ میں، اپنے تلے ہوئے فقروں میں ایسا جواب دیتا ہے کہ ان کا دھندلا تخیل ایک واضح اور روشن نصب العین کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اُن آنکھوں سے ناتجربہ کاری کے پردے ہٹ جاتے ہیں۔ اور راہِ عمل صاف نظر آنے لگتی ہے۔ وہ ان سے کہتا ہے کہ چلو میرے ساتھ دہلی کی ایک تعلیم گاہ میں کام کرو جو تمھارے اصول کے مطابق چل رہی ہے۔ وہاں تمھارے لئے مال و دولت اور جاہ و حشم نہیں ہے مگر خدا کی خوشنودی اور وہ مسرت جو خلق کی سچی اور خاموش خدمت سے ہوتی ہے، موجود ہے۔

نوجوانوں کے دل میں اس پیر روشن ضمیر کو دیکھ کر اور اس کی گفتگو سن کر عجیب جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ جوش کا طوفان اٹھتا ہے لیکن اس کی متانت و وقار کی چٹان سے ٹکرا کر نشیب میں گرتا ہے۔ اور عزم و استقلال کا دریا بن کر خاموشی مگر تیزی سے بہنے لگتا ہے۔ نعرہ ہائے تحسین لب تک آتے ہیں لیکن اس کی پرسکون شخصیت کے اثر سے خدمت و عمل کا عہد بن کر زبان سے نکلتے ہیں۔ نوجوانوں کے

لئے یہ بالکل نیا احساس ہے اسے وہی سمجھ سکتا ہے جسے اس پیکرِ وقار کا فیض حاصل ہوا ہے۔ یہی اس بے نظیر شخصیت کے اثر و نفوذ کا راز ہے جسے دنیا بہ چشمِ حیرت سے دیکھتی ہے۔

نقشِ باتفاق متانت جہاں گرفت

اس سچے افسانے کا دوسرا منظر دہلی ہے۔ جن نوجوانوں کو آپ نے مغرب کے طلسمات میں مسحور دیکھا تھا وہ اب سرزمینِ مشرق کے حقیقت زار میں ہیں۔ یہاں پہنچ کر انھیں نصب العین اور واقعات کا وہ تفاوت نظر آتا ہے جو سب نوجوانوں کے لئے شدید روحانی صدمے کا باعث ہوا کرتا ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ وہ جس قوم کی خدمت کرنا چاہتے ہیں اس کی بے مرکزی اور اس کا انتشار حد سے گذر گیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ ذہنی اور سیاسی آزادی کی عاشق ہے لیکن حصول آزادی کے طریقے کے متعلق کوئی متفقہ رائے قائم نہیں کر سکتی۔ اس کی ہمتیں بظاہر اتنی پست ہیں کہ وہ ترقی کے نام سے ڈرتی ہے۔ اس کو پچھلے پچاس سال میں اس کے رہنماؤں نے دنیاوی قوتوں کا سہارا ڈھونڈنے کا اس قدر عادی بنا دیا ہے کہ نہ اسے خدا پر توکل رہا ہے، نہ اپنی قوت بازو پر بھروسہ۔ یہ نوجوان اس تعلیم گاہ کو جس کی ترقی کی کوشش میں انھیں اپنی عمر صرف کرنا ہے اس حال میں پاتے

ہیں کہ نہ اس کے پاس اپنی عمارت ہے نہ سرمایہ، نہ ساز ہے نہ سامان بس چند اللہ کے بندے جو ہمت کے پورے اور ارادے پکے ہیں جمع ہیں کہ اپنی عمر کا ایک حصہ تحصیل علم میں اس طرح گذاریں کہ دنیا کو جانیں اور اس کے مالک کو پہچانیں۔ اللہ کے حقوق اور بندوں کے حقوق سے واقف ہوں۔ اپنے تمدن کی اجتماعی زندگی میں مضبوطی سے جڑ پکڑیں اور بقدر ضرورت اس میں جدید تمدن کا پیوند لگائیں کوئی مفید پیشہ سیکھیں اور اپنی آئندہ زندگی اس پیشے میں اس طرح گذاریں کہ مقصود اصلی قوم کی فلاح و بہبود ہو اور مقصود ضمنی اپنی ذات اور اپنے خاندان کی پرورش۔ ان اولوالعزم افراد کو دیکھ کر ہمارے نوجوانوں کے دل میں جوش اور ولولے کی ایک آگ بھڑک اٹھتی ہے لیکن عقل دنیاوی یہ کہہ کر اس پر پانی پھیر دیتی ہے۔

آرزوؤں سے پھرا کرتی ہے تقدیر کہیں

اس امید و بیم کے کارزار میں، اس حوصلہ و مایوسی کی کشمکش میں نوجوانوں کی دستگیری وہی پیر شصت سالہ کرتا ہے۔ جس نے پہلی بار ان کے ذوق جادہ پیمائی کو صحیح راہِ عمل دکھائی تھی۔ ذرا چشم عبرت سے اس بدلے ہوئے نقشے کو دیکھیے۔ ایک وہ حالت تھی کہ نوجوانوں کا طائرِ فکر عالمِ غیبی کی نامحدود فضا میں اڑتا تھا اور یہ تجربہ کار پیر مرد نے اسے ایک محدود دائرۂ پرواز دکھایا تھا۔ ایک یہ

صورت ہے کہ ان کی ہمتیں بال و پر شکستہ گرنے والی ہیں کہ اس مردِ نا خدا کا سموا عزم انھیں ابھارتا ہے اور آہستہ آہستہ پروں کو تول کر بلندی کی طرف حرکت کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ وہ انھیں چشمِ تخیل سے ایک تصویر دکھاتا ہے۔ ایک عالی شان عمارت مغل طرزِ تعمیر پر بنی ہوئی ہے۔ اس میں علم و ہنر کے سچے شیدائی ہزاروں کی تعداد میں اپنے اپنے کام میں مصروف ہیں۔ ایک طرف قرآن و حدیث کا درس ہو رہا ہے۔ دوسری طرف فلسفہ و حکمت کا۔ ایک طرف سائنس کے تجربات کئے جا رہے ہیں دوسری طرف صنعت و حرفت کا بازار گرم ہے۔ ایک طرف دارالتصنیف ہے جس میں دادِ تحقیق دی جا رہی ہے۔ دوسری طرف ایک مطبع ہے جس میں مفید کتابیں صحت اور خوش نمائی کے ساتھ چھپ رہی ہیں۔ مرکزی تصویر کے گرد ایک بہت بڑا دائرہ ہے جس میں دن و رات کے مدرسوں کا ایک جال پھیلا ہوا ہے اور ہر طبقہ کے بچوں کو ابتدائی تعلیم دی جا رہی ہے۔ اس دائرہ میں جا بجا کہیں کہیں کھیت نظر آتے ہیں۔ کہیں دکانیں، کہیں صنعتی کارخانے۔ جن میں ان مدرسوں کے فارغ التحصیل طلبہ اپنے اپنے کام میں مصروف ہیں۔ لیکن ہر جگہ دو کتبے زریں حرفوں میں لکھے ہوئے آویزاں نظر آتے ہیں۔ جن کی عبارت یہ ہے۔ "مکمل زندگی دین و دنیا کے مجموعہ کا نام ہے۔" "فرد کی زندگی قوم کی زندگی سے وابستہ ہے۔"

یہ تصویر دکھا کر پیر مرد نوجوانوں سے کہتا ہے۔ دیکھو یہ ہے میرا اور تمھارا نصب العین۔ اس کا حاصل کرنا مشکل ہے مگر ناممکن نہیں۔ اس کے لئے ضرورت ہے

عزم واستقلال کی اور خاموشی سے لگاتار کام کرنے کی۔ اگر دیر لگے تو کوئی ہرج نہیں۔ میں نے دور دراز کے سفر کیے ہیں اور سعیٔ پیہم کا لذت آشنا ہوں، اٹھو میرے ساتھ چلو۔ وشت نوردی کی صعوبتوں کا عادی ہونے کے بعد تھیں میرا ہمزبان ہوکر کہنا پڑے گا ؎

ہر قدم پر ہے فزوں لذتِ سرگرمیٔ سعی!
شوق نے خوب مزے دوریٔ منزل کے لئے

نوجوانوں نے اس پیرِ دانا کی رہنمائی میں کام شروع کر دیا ہے۔ باوجود اس کے کہ اس مردِ خدا کی ذات بہت سے قومی کاموں کا مرکز اور بے شمار بندگانِ خدا کی انفرادی حاجتوں کا مرجع ہے، وہ قومی تعلیم کے کام سے جس میں یہ نوجوان اس کے رفیقِ کار ہیں ایک لمحہ کے لئے بھی غافل نہیں ہوتا۔ اس کی مصروفیتوں کا اندازہ کرنے کے لئے ایک دن کا قصہ سنئے :۔

یہ حکیم قوم تڑکے بیدار ہوتا ہے۔ حوائج ضروریہ اور عبادت الٰہی سے فارغ ہوکر سات بجے اپنی نشست گاہ میں پہنچ جاتا ہے۔ وہاں بعض تار رکھے ہیں جن کا فوراً جواب لکھوایا جاتا ہے۔ بعض اہل غرض بیٹھے ہیں جن کی درخواست سنی جاتی ہے اور پوری کی جاتی ہے۔ ابھی مطب کا وقت نہیں لیکن دو چار مریض آگئے ہیں آٹھ بجے کی گاڑی سے واپس جانا ضروری ہے۔ ان کی نبض دیکھی جاتی ہے۔ نسخہ

لکھا جاتا ہے۔ اب آٹھ بج گئے ہیں۔ دیوانخانے میں مریض جمع ہیں صحن میں ڈولیاں اور پالکیاں رکھی ہیں۔ دروازے پر موٹریں، بگھیاں، تانگے کھڑے ہیں۔ مسیحا نفس حکیم اٹھ کر مطب میں آتا ہے۔ مریض ایک ایک کر کے آتے ہیں اور نبض دکھاتے ہیں۔ کوئی امیر ہے کوئی غریب، کوئی متعدی مرض میں مبتلا ہے۔ کوئی امراض جنسی سے تصویر عبرت بنا ہوا ہے۔ کوئی ادب اور تمیز سے گفتگو کرتا ہے کوئی اختصار سے اپنا ٹھیک ٹھیک حال بتاتا ہے۔ کوئی طول وطویل بے سر و پا تقریر کرنے لگتا ہے لیکن حکیم سراپا صبر و تحمل مجسم خلق و تواضع ہے۔ متانت سے توجہ سے، سکون و اطمینان سے ہر ہر مریض کو دیکھتا ہے۔ اس سے مناسب سوال کرتا ہے اور اس کا نسخہ لکھوا کر اسے رخصت کر دیتا ہے مریضوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا۔ حکیم کی طبیعت خود نا ساز ہے۔ گرمی کے دن ہیں، دھوپ کی حدت بڑھتی جا رہی ہے۔ پیشانی پر پسینے کے قطرے جھلک رہے ہیں لیکن کیا مجال جو ابرو پر بل آجائے۔ اسی کشادہ پیشانی سے آخری مریض کو دیکھتا تھا۔ اب گیارہ ساڑھے گیارہ ہو گئے، کھانے کا وقت ہے۔ وہاں سے اٹھ کر کھانے کے کمرہ میں آتا ہے۔ نشست گاہ میں کچھ رفقاء، کچھ اہل کار، کچھ اجنبی بیٹھے ہیں۔ ان کو بلا کر کھانے میں شریک کرتا ہے۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد کیا ہوتا ہے۔ استراحت؟ نہیں توبہ استراحت کا کیا ذکر ہے۔ یہ خطوط کے سننے اور جواب لکھوانے کا وقت ہے۔ بے شمار خطوط ذاتی۔ دواخانہ کے متعلق، طبی مدرسہ کے متعلق، قومی مدرسہ کے متعلق سنے جاتے

ہیں اور ان کا جواب لکھوایا جاتا ہے۔ مگر یکسوئی کے ساتھ نہیں نشست بالاخانے پر خاص کمرے میں ہے مگر یہاں بھی اہل حاجت پہنچ گئے ہیں کوئی ذاتی کام سے آیا ہے ان کی طرف بھی توجہ ہے۔ کسی سے وہیں گفتگو ہوتی ہے کسی سے علیحدہ کمرے میں جا کر لیتے ہیں کوئی زنان خانے سے آکر کان میں آہستہ کہتا ہے۔ "بہو کی طبیعت اس وقت بہت خراب ہے" چہرے پر تفکر کے آثار نمایاں ہونے لگتے ہیں مگر اضطراب کے نہیں۔ اٹھ کر اندر جانے کا قصد ہے۔ حاضرین مجلس سمجھتے ہیں کہ ایسی صورت میں کاموں کا بار ڈالنا ٹھیک نہیں۔ عرض کرتے ہیں "ہم کو اجازت ہو۔ کل حاضر ہو جائیں گے" ارشاد ہوتا ہے۔ "نہیں بیٹھیے کام تو کرنا ہی ہے، میں ابھی حاضر ہوتا ہوں" تھوڑی دیر کے وقفہ کے بعد پھر یہ مبارک صورت نظر آتی ہے۔ چہرے سے دل کے جذبات کا بالکل پتہ نہیں چلتا۔ اللہ رے ضبط۔

کام کا سلسلہ شروع ہو گیا اور ڈھائی بجے تک جاری رہا۔ اب مریضوں کو دیکھنے کے لئے جانا ہے لیکن یہی ایک چیز نہیں طبی مدرسہ کے ایک جلسہ میں شریک ہونا ہے، قومی مدرسہ میں ایک معزز مہمان کو لے جانا ہے نشست گاہ سے موٹر تک جاتے جاتے ان مدارس کے مہتمموں کو مفصل ہدایتیں دی جاتی ہیں، ہر کلی اور جزوی بات سمجھائی جاتی ہے۔ شام کو ساڑھے پانچ بجے بے شمار اہم کاموں سے فراغت کرنے کے بعد یہ جلیل القدر ہستی قومی مدرسہ میں چھوٹے

بچوں کے دارالاقامہ میں نظر آتی ہے۔ پیرِ دانشمند کمسن اطفال کے حلقے میں ہے ان سے مسکرا کر باتیں ہو رہی ہیں: "بتاؤ تم میں سب سے زیادہ شریر کون ہے" "تم ہماری دعوت کب کروگے؟" بچے خوشی کے مارے پھولے نہیں سماتے۔ ہر طرف سے نرغہ کیے ہوئے ہیں۔ ایک پر ایک گرا پڑتا ہے۔ وہی کشش، وہی جاذبیت جو بڑوں کو مسحور کرتی ہے بچوں پر بھی اثر کر رہی ہے۔ ساڑھے چھ بجے پھر نشست گاہ میں مراجعت ہوتی ہے۔ تنہائی اب بھی نصیب نہیں۔ چند مریض موجود ہیں اور چند اہلِ حاجت، سب کی حاجت روا ہوتی ہے۔ نماز سے فراغت کرنے کے بعد شام کا کھانا کھایا جاتا ہے۔ بعض احباب بعض اجنبی اس وقت بھی موجود ہیں۔ کھانے کے بعد پھر دربار جمتا ہے۔ اب احباب خاص اور اہلِ شہر کا مجمع ہے۔ اب اخبار سنایا جاتا ہے۔ سیاسی اور علمی مسائل پر گفتگو ہوتی ہے۔ قومی مدرسہ کے لوگ وہی نوجوان جن کے ذکر سے یہ قصہ شروع ہوا ہے موجود ہیں۔ ان سے اس تعلیم گاہ کے مستقبل کے متعلق باتیں ہوتی ہیں۔ آج شب کو بارہ بجے اسی کے لئے چندہ کرنے کو ایک دور دراز شہر میں جاتا ہے مگر اس سے قبل بہت سے کام ہیں۔ شہر کے بعض معاملات پیش ہیں۔ ان کا فیصلہ کرنا ہے۔ دواخانہ کے لئے ایک نیا نسخہ تجویز کرنا ہے جس کے سلسلہ میں بعض طبی کتابوں کا دیکھنا ضروری ہے۔ ایک قومی انجمن کے کارکنوں کو ضروری مشورہ دینا ہے افکار و مشاغل کا یہ ہجوم ہے لیکن وہی سکون، وہی اطمینان، وہی خلق و تبسم

ایک ایک کر کے ترتیب سے سارے کام نپٹائے گئے۔ ساڑھے گیارہ بج گئے اسباب تیار ہے۔ موٹر حاضر ہے۔ سب سے رخصت ہو کر ایک ایک سے مصافحہ کر کے روانگی ہوتی ہے۔ رات کی نیند کا اللہ مالک ہے۔

جو قصہ آپ نے سنا یہ ایک دن کا نہیں۔ تھوڑے بہت تغیر کے ساتھ روز یہی ہوتا ہے۔ اس شدید مشغولیت کی حالت میں دو برس تک قومی مدرسہ کا کام کیا جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ ترقی ہوتی ہے۔ لوگ متوجہ ہوتے ہیں۔ طلبہ بڑھتے ہیں۔ مدرسہ کی شاخیں قائم ہوتی ہیں۔ تعلیم کا نظم درست ہوتا ہے۔ اشاعت علوم کا کام پھیلنا شروع ہوتا ہے۔ مطبع بڑے پیمانہ پر چلنے لگتا ہے۔ مالی مشکلات سب سے زیادہ تکلیف دہ ہیں لیکن یہ بھی کسی نہ کسی طرح دور کی جاتی ہیں کبھی دوسروں کی مدد سے، کبھی اپنی فیاضی سے حکیم قوم کے لوگوں کو قومی تعلیم کا مفہوم سمجھاتے اور ان سے اپنی محبوب تعلیم گاہ کے لیے امداد حاصل کرنے کی غرض سے متعدد بار سفر کرتا ہے۔ کبھی سخت بیماری کی حالت میں اکثر تن تنہا، ہمیشہ مالی نقصان برداشت کر کے، یہ ہے سچا ایثار اسے کہتے ہیں دامے درمے، قدمے سخنے مدد کرنا۔ سب سے زیادہ اہم بمبئی کا سفر ہے، ملک کا مسیحا درد قولنج میں مبتلا بستر علالت پر ہے۔ نقل و حرکت دشوار ہے مگر بمبئی جا کر ایک اولوالعزم تاجدار کے سامنے قومی مدرسہ کی طرف سے سپاسنامہ

پیش کرتا ہے۔ لوگ مایوس ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ ایسی صورت میں سفر ناممکن ہے لیکن انھیں اس مردِ خدا کی ہمت کا صحیح اندازہ نہیں۔ اسی حالت میں سفر ہوتا ہے سپاسنامہ پیش ہوتا ہے۔ مالک تاج وتخت قومی مدرسہ کی پرزور تائید کرتا اور امداد کا وعدہ کرتا ہے۔ تمام ہندوستان اس قومی تعلیم گاہ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، تمام ملت اسلامی اس کی قدر کرنے لگتی ہے۔

اب دو سال میں کوششوں کا نتیجہ نکلنے والا ہے۔ ہمارے نوجوان بہت خوش ہیں۔ معلوم ہے کہ ان کا محترم رہنما نئے سال کے شروع سے ملک کا دورہ کرے گا۔ اب خدا نے چاہا تو کامیابی یقینی ہے۔ نوجوان تعطیل میں اپنی تعلیم گاہ کے مقاصد کی نشر واشاعت کے لیے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ کوئی مدراس میں ہے کوئی علی گڑھ میں۔ کوئی دہلی میں کوئی لکھنؤ میں، ۲۹ دسمبر کی صبح کو یکایک یہ لوگ اپنے اپنے مقام پر اخباروں میں یہ سرخی پڑھتے ہیں "حکیم اجمل خاں نے وفات پائی"۔ ان چند لفظوں کا اثر بیان نہیں ہوسکتا۔ دماغ میں سکتہ، بدن میں سنسنی۔ آنکھوں میں اندھیرا۔

"آں قدح بشکست وآں ساقی نماند۔ آں ساقی نماند"۔ یہ حقیقت ہے، جاں کاہ حقیقت، دلخراش حقیقت۔ مگر "آں قدح بشکست"؟ خدا نہ کرے۔ اجمل خاں نہیں رہے مگر اجمل خاں کا خدا موجود ہے

جو کسی کی محنت ضائع نہیں کرتا۔ اجمل خاں کے فرزند ارجمند اور سچے دوست موجود ہیں۔ اجمل خاں سے تربیت پائے ہوئے نوجوان موجود ہیں۔ اور اجمل خاں کی قوم موجود ہے۔ کیا یہ سب اجمل خاں کے کام کو ادھورا چھوڑیں گے۔ عقل قبول نہیں کرتی۔ دل گواہی نہیں دیتا۔

برناڈشا

جارج برناڈشا آئرستان کے دارالسلطنت ڈبلن میں ۱۸۵۶ء میں پیدا ہوا۔ اس کا خاندان آئری نسل سے تھا۔ مگر مذہبًا پروٹسٹنٹ کاتیسلک کے پیوریٹین[1] فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔ صوبہ السٹر کے پروٹسٹنٹ باشندے ابتدا سے آئرستان میں انگریزی حکومت کے حامی اور مددگار تھے۔ برناڈشا کا باپ جارج کارشا آئرستان کی سول سروس کا رکن رہ چکا تھا اور پنشن لینے کے بعد تجارت کرتا تھا۔ ہندوستانی عہدیداران سول سروس کی طرح آئرستان کے سول سروس والے بھی عزیزوں میں بیگانہ ہو کر رہتے تھے۔ انھیں اپنے آبائی تمدن سے کوئی سروکار نہ تھا وہ ہر بات میں اپنے حکمرانوں کی تقلید کرتے تھے۔ اور اتحاد مذہب کے سبب سے ان کا رشتہ ان غیر ملکیوں سے اور بھی مضبوط ہو گیا تھا مگر پھر بھی نسل کے اثر سے ان میں آئرستانی خصوصیات موجود تھیں۔ برناڈشا کی سیرت کے سمجھنے کے لئے ان دونوں عناصر کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ آئرستان والوں کی وسعت تخیل، ظرافت و صاحب خیال تنقید،

[1] PURITAN عیسائیوں کے اس فرقے کو کہتے ہیں جو خدا کی عقلی پرستش کا قائل ہو، مذہب میں جذبات کا عنصر داخل کرنا نہیں چاہتا اور اخلاقی اصول میں بے حد سخت ہے۔

واقعہ بینی، سادگی، سختی، خشکی، جنگجوئی، ماحول اور تربیت کے اثر سے پیدا ہوئی۔ شاؔکی ابتدائی عمر کا تصور کیجیے تو یہ نظر آتا ہے کہ ایک بے چین طبیعت پاک دل، گہری نظر رکھنے والا بچہ ایک مصنوعی ماحول میں تعلیم پا رہا ہے، جو وطنیت کے جذبات سے خالی، قومی روایات سے بیگانہ، ماضی کے اثرات سے آزاد ہے۔ اس کے سامنے زندگی کا ایک بلند اور مجرد تصور ہے۔ لیکن اس کی واقعی حالت سے، اس کی نیرنگیوں سے، اس کی پیچیدگیوں سے واقف ہونے کا اسے موقع نہیں ملتا۔ اس کی نظر میں انسانیت کا ایک اعلیٰ اور یک رنگ تخیل ہے۔ مگر جیتے جاگتے انسانوں کی کشمکش آرزو، ان کے سعی و عمل کے نشیب و فراز، ان کے جذبات و احساسات کے مدوجزر کو دیکھنے اور سمجھنے سے وہ معذور ہے، وہ آنکھ کھول کر دیکھتا ہے تو اپنے ہم مذہبوں کے حلقہ کو دیکھتا ہے؛ جو قومی زندگی کے ایک بحرِ ذخار کے سامنے ایک چٹان کی طرح کھڑا ہے؛ جسے خبر تک نہیں کہ کونسی ہوائیں موجوں کو حرکت دیتی ہیں، کون سے طوفان سمندر میں تلاطم پیدا کرتے ہیں۔

ایسی بے تعلقی اور ناآشنائی کے دامن میں پرورش پاکر انسان یا تو مردمِ بےزار راہب، یا عالم بنتا ہے۔ یا شاید انقلاب پسند۔ شاؔکی سرشت میں بنی نوع انسان کی محبت تھی۔ اور اس کی تربیت ہیوریٹن مذہب پر ہوئی تھی۔ اس لئے وہ رہبانیت سے محفوظ رہا اور انقلاب پسندی کی طرف جھک گیا۔

علمی ذوق اسے ابتدا سے تھا اور اخیر تک ہے۔ لیکن اخلاقی جوش اور عملی ولولے نے اسے پیشہ ور سائنس داں نہ بننے دیا۔ منطقی تحلیل اور غور و فکر کی قوت کو اس نے علمی تحقیق میں صرف کرنے کے بجائے عملی زندگی کی تنقید اور اصلاح کے لئے وقف کر دیا۔

تنقید کا شوق اور اصلاح کا جوش برناڈ شا کے دل میں اسی زمانے میں پیدا ہو گیا تھا جب وہ اسکول میں تعلیم پاتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ انگلستان اور اسکاٹستان میں پیوریٹن مذہب پر زوال آ چکا تھا۔ اور آئرستان میں بھی اس کا انحطاط شروع ہو گیا تھا۔ لوگ اس کے آہنی اصولوں کے زبان سے قائل تھے مگر عمل محض برائے نام باقی رہ گیا تھا۔ باطنی خلوص اور عقیدت کے گھٹنے سے ظاہری تعصب اور تشدد بڑھ گیا تھا۔ پادریوں میں نفسانیت اور تنگ نظری کا دور تھا اور وہ اپنا وقت آپس کے مناظروں میں ضائع کرتے تھے۔ نوعمر شا اپنے گھر پر یہ دیکھتا تھا کہ اس کا باپ پیوریٹن عقیدے کے مطابق شراب نوشی کا مخالف ہے۔ مگر چھپ کر شراب پیتا ہے۔ باہر اسے یہ نظر آتا تھا کہ دینیات کے فروعی مسائل پر دور از کار بحثیں ہوا کرتی ہیں لیکن زندگی کے مسائل پر کوئی غور نہیں کرتا۔ شا کے گہرے مذہبی احساس اور سچے اخلاقی جوش کو اس کھوٹی مذہبیت سے اس قدر وحشت ہوئی کہ وہ سرے سے مذہب ہی کا مخالف ہو گیا نوعمری کی خام کاری اکثر لوگوں کو ایسے شبہات میں مبتلا کر دیتی ہے مگر وہ عموماً

انھیں چھپاتے ہیں۔ شا کے ولولے اور اس کی ہمت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس نے مذہب کی مخالفت اور الحاد کی تائید میں ایک مضمون لکھا۔ اور اسے اخبار میں چھپوا بھی دیا۔ خدا جانے خاندان کی مخالفت کا اثر تھا یا کوئی اور وجہ تھی کہ شا ایک ہی مضمون لکھ کر خاموش ہو گیا۔ مگر اس کی لا مذہبی ایک مدت تک کے لئے راسخ ہو گئی۔ برسوں کے بعد ذاتی روحانی واردات کے صیقل نے اس کے آئینۂ قلب سے اس زنگ کو دور کیا۔

اسکول کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد شا کو کسی تجارتی کارخانے میں معقول آمدنی کی جگہ مل گئی اور باوجودیکہ یہاں اس کے علمی اور ادبی ذوق کے پورا کرنے کا کوئی سامان نہ تھا وہ انتہائی ضبط نفس سے کام لے کر چار سال تک اپنے فرائض ایمانداری اور محنت سے انجام دیتا رہا۔ لیکن اسے خدا نے ایسا دل دیا تھا جو اپنے بنی نوع کی مصیبتوں پر کڑھتا تھا۔ اسے یہ گوارا نہ ہوا کہ زندگی کے طوفان خیز سمندر میں ایک چٹان پر بیٹھا ہوا ڈوبنے والوں کے ہاتھ پیر مارنے کا تماشا دیکھا کرتا۔ اس نے یک بیک اپنے کاروبار کو چھوڑ دیا اور چین کی زندگی سے منہ موڑ کر ڈبلن سے لندن چلا آیا۔ اور انقلابی تحریکوں میں شریک ہو کر ہر قسم کی سختیاں جھیلنے لگا۔

یہاں وہ ابتدا میں نراجیوں اور دہریوں کے ساتھ ریاست اور کلیسا سے جنگ کرتا رہا مگر آخر میں اشتراکیوں کا ہمخیال اور شریک کار ہو گیا۔ شا کے

ہاتھ میں تنقید اور طنز کی جو بے پناہ تلوار تھی اس سے صرف اس کے مخالفین ہی نہیں بلکہ اس کے موافقین بھی پناہ مانگتے تھے۔ اس کی دیانتداری اور انصاف پسندی کا یہ حال تھا کہ جس جماعت میں وہ شریک ہوتا تھا اس کی کمزوریوں کو ظاہر کرنا اپنا سب سے پہلا فرض سمجھتا تھا۔ وہ سیاسی اور سماجی انقلاب چاہتا تھا لیکن انقلاب پسندوں کی جذبات پرستی اور بے اصولی پر سختی سے نکتہ چینی کرتا تھا۔ وہ آزادئ نسواں کا حامی تھا لیکن اس بات پر شدت سے اعتراض کرتا تھا کہ عورتیں ایک طرف تو دل و دماغ میں مردوں کی برابری کا دعویٰ کریں اور دوسری طرف صنف نازک بن کر خاص رعایتوں کی طالب ہوں۔ وہ مروجہ مذہب کا مخالف تھا اور اس پر حملے کرتا تھا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ ان لوگوں کی خبر لیتا تھا جنھوں نے سائنس کو مذہب کی حیثیت دے رکھی تھی۔ غرض کچھ تو اس بیگانہ وار تربیت کا اثر تھا اور کچھ اس کی ناآشنا طبیعت کا فیض کہ وہ کسی اصول کی تحریک کو آنکھ بند کر کے والہانہ جوشِ عقیدت کے ساتھ قبول نہیں کرتا تھا۔ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ وہ اپنے خیالات میں راسخ اور دھن کا پکا نہ تھا۔ اخلاق و معاشرت کی اصلاح کی ہر کوشش میں وہ پوری سرگرمی سے حصہ لیتا تھا۔ لیکن دو باتوں کے سبب سے اس کے رفیق اس کے شاکی رہتے تھے، ایک تو یہ کہ وہ ان کے کاموں کا بہت سختی سے احتساب کرتا تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ ہر اصلاحی اور انقلابی تحریک کو محض عقل اور انصاف پر مبنی رکھنا چاہتا تھا اور جذبات کے ہیجان کو جو اخلاقی احساس کا جزوِ اعظم

جزو اعظم ہے کمزوری کی دلیل سمجھ کر دبا دیتا تھا۔ خود اس کا دل ہمدردی اور محبت سے معمور تھا۔ لیکن وہ انھیں منطقیانہ خشکی اور ناقدانہ طنز کے پردے میں چھپاتا تھا۔ اس کا درد آشنا دل انسان تو انسان حیوانوں تک سے الفت رکھتا تھا۔ چنانچہ وہ ابتدا سے گوشت خوری کا مخالف تھا۔ اور سوائے سبزی ترکاری کے کچھ نہیں کھاتا تھا۔ لیکن اس کا سبب وہ بہ ظاہر کرتا تھا کہ گوشت کھانا اقتضائے فطرت کے خلاف ہے۔

برناڈ شا کی جد و جہد کا مرکز فیبین سوسائٹی تھی جسے انگلستان کے چند قابل بلند نظر، دور اندیش اربابِ فکر نے اشتراکیت کی تبلیغ اور ملک و قوم کی تدریجی اصلاح کی غرض سے قائم کیا تھا۔ اس کے ارکان وہ لوگ تھے جن میں سے بعض آج لیبر حکومت میں وزراء کے منصب پر فائز ہیں۔ شا اس حد تک ان لوگوں کا ہمخیال ہے کہ وہ ریاست کو حکومت اور سیاست، اقتصاد و تجارت میں مختار کل بنانا چاہتا ہے۔ لیکن مذہب و اخلاق، علم و فن، آرٹ و شاعری غرض سارے روحانی اور ذہنی امور میں وہ انفرادی آزادی کا قائل ہے۔ طرزِ حکومت کے معاملے میں بھی اسے اشتراکیوں کے تمام اصولوں سے اختلاف ہے۔ وہ جمہوریت کا حامی نہیں ہے بلکہ اس کا یہ عقیدہ ہے کہ ملک کا نظم و نسق چند دیانت دار اور روشن خیال افراد کے ہاتھ میں ہونا چاہیئے۔ جو اجتماعی مفاد کو پیشِ نظر رکھ کر حکومت کریں۔ لیکن ان اختلافات کے باوجود عقائد کے

اعتبار سے سب سے زیادہ قریب ان ہی اشتراکیوں کو پاتا تھا اس لئے وہ ان کی جماعت کا سرگرم رکن بن گیا۔ وہ ان لوگوں کے لئے پمفلٹ لکھا کرتا تھا اور ان کے مباحثوں میں شریک ہو کر ان کے اچھے اصولوں کی تائید اور ان کی کمزوریوں پر سخت سے سخت تنقید کیا کرتا تھا۔

یہ شا کے لیے سخت دشواریوں کا زمانہ تھا۔ پورے چھ برس اس نے ایسی عسرت میں گذارے کہ اسے پیٹ بھرنے کو سوکھی روٹی اور تن ڈھانکنے کو موٹا کپڑا بھی مشکل سے میسر آتا تھا۔ وہ آرٹ کی تنقید، خصوصاً موسیقی کی تنقید پر مضامین لکھا کرتا تھا لیکن اس کی صاف گوئی اور تلخ بیانی کے سبب سے اخبارات اور رسالے بہت کم اس کی تحریروں کو قابل اشاعت سمجھتے تھے۔ کبھی کبھی اسے کوئی اشتہار یا کسی تصویر کی تشریح لکھنے کو مل جاتی۔ اور اسی کے قلیل معاوضے سے جیسے تیسے اس کا کام چلتا تھا۔ اس زمانے میں اس نے ناول بھی لکھے مگر ان میں سے کوئی مقبول نہ ہوا۔

سب سے پہلے ولیم آرچر نے اس کی قدر پہچانی اور اسے "سیٹر ڈے ریویو" کے لئے آرٹ کی تنقید لکھنے کا کام سپرد کیا۔ اب شا کو فکر معاش کی طرف سے کسی قدر اطمینان نصیب ہوا اور اپنے جوہر قابل کے اظہار کا موقع ملا۔ اس موقع سے اس نے سب سے پہلے یہ فائدہ اٹھایا کہ اپنا بت شکنی کا کام آرٹ اور ادب کے میدان میں شروع کر دیا۔ وہ جانتا تھا کہ انگلستان والے بہت سے بتوں

کی پرستش کرتے ہیں۔ جیسے سامراج، امارت پسندی، قدامت پرستی، لیکن ان کا سب سے بڑا بت شکسپیر ہے، وہ شکسپیر کی شاعری کا بہت قائل تھا۔ لیکن شکسپیر کے فلسفۂ زندگی کا جو تخیل اس کے ذہن میں تھا اس کا وہ بڑی سختی سے مخالف تھا۔ شا کے جمالیاتی نظریہ کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ آرٹ کو کوئی مستقل مقصدِ زندگی (قدر) تسلیم نہیں کرتا۔ بلکہ تمدنی اور اخلاقی اغراض کا آلہ کار سمجھتا ہے چنانچہ اس نے شکسپیر کی شاعری پر زیادہ تر اس پہلو سے نظر ڈالی کہ وہ کائنات کی کیا تفسیر کرتا ہے اور زندگی کا کون سا نصب العین پیش کرتا ہے۔ اور اُسے یہ نظر آیا کہ یہ شاعر جسے انگلستان والے پوجتے ہیں، زندگی کو ایک چند روزہ تماشا اس کے مقاصد کو کھلونا، اس کے فرائض کو کھیل جانتا ہے۔ اور آزادی، رندی اور لاابالی پن کی تعلیم دیتا ہے۔ بھلا برناڈ شا جس کے نزدیک زندگی ایک ازلی اور ابدی قوت کا مظہر، عالمگیر ارتقا کا سلسلہ، خشک اور سخت گیر اخلاق کا ضابطہ ہے۔ ان خیالات کو کیونکر پسند کرتا۔ اس نے اپنے زورِ قلم سے ادبی دنیا میں ہل چل مچادی اور شکسپیر کے سنگین بت کو گرا نہیں سکا تو اس کی بنیادوں کو ضرور ہلا دیا۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ برناڈ شا شکسپیر کی شاعری کا منشا صحیح نہیں سمجھا۔ شکسپیر نشاۃ ثانیہ کے زمانے کا شاعر اپنے دور کی ذہنی شراب سے سرشار تھا اس کے عہد میں مغربی تمدن کلیسا کی جابرانہ حکومت سے نیا نیا آزاد ہوا تھا۔

اور صدیوں تک تنگ خیالی اور تنگ نظری کی کال کوٹھری میں بند رہنے کے بعد نئی زندگی کی صاف روشنی اور تازہ ہوا کا لطف اٹھا رہا تھا۔ وہ اپنے ہمعصروں کے ساتھ زندگی کی وسعت اور گوناگونی کے نظارے میں ایسا مگن تھا کہ اسے اس کے مقصد اور منشا پر غور کرنے اور اس کی ذمہ داریوں کو سمجھنے اور قبول کرنے کی فرصت نہ تھی وہ نہ تو نقاد تھا اور نہ مصلح بلکہ محض مصور اور مغنی یعنی خالص شاعر وہ انسان کے جذبات و احساسات، اس کی امیدوں اور آرزوؤں، اس کے ارادوں اور کوششوں کا خود مشاہدہ کرتا تھا اور دوسروں کو کراتا تھا۔ زندگی کے راحت والم، مدوجزر، نشیب و فراز پر خود ہنستا اور دوسروں کو ہنساتا اور رلاتا تھا۔ اس کے نزدیک زندگی واقعی ایک تماشا ہے مگر عبرت آموز تماشا، اس کے مقاصد واقعی کھلونے ہیں مگر دیوتاؤں کے کھلونے۔ اس کے فرائض واقعی کھیل ہیں مگر قسمت کے کھیل۔ اس کی شاعری کو سمجھنے کے لئے نشاۃ ثانیہ کی روح کو سمجھنے کی ضرورت ہے جس سے برناڈ شا اپنی خلقت اور تربیت کی بدولت بیگانہ ہے۔ جس چیز کو وہ رندی اور لاابالی پن سمجھتا ہے وہ اصل میں جوش نمو تھا اور ولولۂ حیات جو آئینۂ فطرت میں اپنی ہی صورت دیکھتا تھا اور مشاہدے کے کیف میں ڈوبا ہوا سبک روی سے زندگی کی راہیں طے کر رہا تھا۔

شیوۂ رندانِ بے پروا خرام از من مپرس
ایں قدر دانم کہ دشوار است آساں زیستن

مگر اس میں شک نہیں کہ یہ طرزِ خیال اور شیوۂ زندگی زیادہ دن قائم رہنے والا نہ تھا۔ مغربی تمدن کے حاملوں کو بہت جلد یہ محسوس ہوا کہ بھونرے کی طرح کلی کلی کا رس لیتا انسانیت کی تکمیل کے لئے کافی نہیں انھیں ایک گہرے اور مستحکم عقیدے کی ضرورت ہوئی اور مذہبی اصلاح کی تحریک نے اس ضرورت کو پورا کیا۔ اس کے بعد ان پر عقلیت، روحانیت، عینیت کے دور گذرے جن میں ان کے دماغ میں ترتیب، ان کے جذبات میں گہرائی، ان کے تخیل میں وسعت پیدا ہوئی، آخر میں ثبوتیت کا دور آیا جس میں ان کے تجربے اور مشاہدے کی قوتوں نے بے حد ترقی کی۔ انہوں نے صنعت و حرفت و سائنس سے مدد لے کر زندگی میں ایسی سہولتیں پیدا کیں اور عیش و آرام کے ایسے اسباب مہیا کئے جو اس سے پہلے کسی نے خواب میں بھی نہیں دیکھے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ صنعتی انقلاب نے بڑی بڑی پیچیدگیاں بھی پیدا کر دیں۔ زندگی کا مادی پہلو لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گیا، اور روحانی پہلو کی طرف سے لوگ غافل ہو گئے۔ کسبِ معاش کی کشمکش اس قدر ہو گئی کہ سکون و اطمینان کافور ہو گئے۔ اور مذہب کی کھیتی جو قلبِ مطمئن کی زمین پر سرسبز ہوتی ہے مرجھا کر رہ گئی۔ زندگی کے ربط و اتحاد کا رشتہ ٹوٹ گیا، تمدن اپنے مختلف شعبوں میں بکھر کر رہ گیا۔ ایک شعبہ دوسرے شعبہ سے بے تعلق ہو گیا بے تعلقی سے اختلاف اور اختلاف سے مخالفت تک نوبت پہنچی اقتصاد سیاست سے دست و گریباں ہو گیا۔ آرٹ اور اخلاق میں لڑائی چھڑ گئی۔ علم نے مادی

فلاح کا ذہن تمام کر مقاصدِ زندگی سے قطع تعلق کر لیا۔ امیروں اور غریبوں۔ سرمایہ داروں اور مزدوروں نے ایک دوسرے کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ غرض یہ اندیشہ پیدا ہو گیا کہ کہیں یہ انتشار اجتماعی زندگی کے شیرازے کو توڑ کر مغربی تمدن کا خاتمہ نہ کر دے۔

اب اگر ہم اس زمانے کا مقابلہ شکسپیر کے زمانہ سے کریں تو صبح و شام بہار و خزاں، شباب و پیری کا فرق نظر آتا ہے۔ کہاں نشاۃ ثانیہ کے آغاز کا جوش اور ولولہ اور کہاں انیسویں صدی کے آخر کی افسردگی اور بے دلی، کہاں وہ امید سے معمور عقیدۂ زندگی، کہاں یہ یاس سے لبریز بے عقیدگی۔ کہاں وہ فطرت انسانی کی گود میں پلنے اور بڑھنے والی ہم رنگ اور ہم آہنگ تہذیب کہاں یہ عقل اور سائنس کی زنجیروں میں جکڑا ہوا بے مرکز اور بے ربط تمدن ظاہر ہے کہ شکسپیر کا فلسفۂ حیات (اگر محض سرودِ زندگی کو حیات کہا جا سکے) جس نے بادِ بہار کی آغوش میں پرورش پائی تھی، خزاں کے دور کے لئے مناسب ہے۔ یہ سچ ہے کہ وہ قلبِ انسانی کے اسرار کا ترجمان ہے جو ہر قدم اور ہر دور کے لئے یکساں ہیں لیکن جدید زندگی کے اکثر مسائل ایسے ہیں جن میں وہ رہنمائی نہیں کر سکتا۔ یہی حقیقت تھی جسے برنارڈ شا نے انگریز قوم پر جو اپنی قدامت پرستی کی بدولت اب تک شکسپیر کا کلمہ پڑھتی تھی، واضح کرنا چاہا۔ شکسپیر کے شاعرانہ کمال کا وہ معترف ہی لیکن یہ کمال اس کی نظر میں زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ وہ افلاطون کی طرح شاعر

سے تعلیم اخلاق کا کام لینا چاہتا ہے۔ اور جو شاعر اس کام کا نہ ہو وہ اسے کسی کام کا نہیں سمجھتا۔

شا محض نقاد نہیں وہ مصلح بھی ہے۔ اس نے شکسپیر کے نصب العین کی جو اس کے نزدیک ناقص اور غلط ہے۔ تردید کرنے پر اکتفا نہیں کی بلکہ اس کے مقابلے میں ابسن کا نصب العین پیش کیا ہے جسے وہ عہد جدید کا اولیں پیغمبر سمجھتا ہے۔ ابسن کے پیغام کے صحیح منشا سے اپنی قوم کو آشنا کرنا برنارڈ شا کا سب سے بڑا تنقیدی کارنامہ ہے۔ اس زمانہ میں انگلستان میں یہ غلط خیال پھیلا ہوا تھا کہ ابسن آسکر وائلڈ کی طرح محض جمالیات پرست شاعر ہے جو آرٹ کو اخلاق سے برتر سمجھتا ہے۔ شا نے لوگوں کو یہ سمجھایا کہ ابسن کی تصانیف اخلاقی روح اور اخلاقی جوش سے لبریز ہیں۔ البتہ اس کا نظریۂ اخلاق علم روش سے علیحدہ ہے۔ یہ نارویے کا ڈرامہ نگار جس نے تمدن و معاشرت کی تنقید کو اپنا موضوع قرار دیا تھا۔ شا کے نزدیک انسانی زندگی کا سچا مفسر اور حقیقی معنی میں آرٹسٹ اور شاعر ہے۔ اس سے وہ اس درجہ عقیدت رکھتا ہے کہ اپنے آپ کو اس کا مقلد اور اپنی تصانیف کو اس کے فلسفۂ حیات کی تفسیر کہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اس معاملے میں بہت حسن ظن سے کام لیتا ہے۔ ابسن میں اور اس میں سوائے اس کے کوئی چیز مشترک نہیں کہ دونوں مروجہ رسوم و اخلاق کے نقاد ہیں۔ اور انفرادی آزادی کے حامی۔ جب تک وہ محض تخریبی تنقید کرتا رہا اس کے خیالات ابسن سے مشابہ رہے

لیکن جس دن اس نے ایک مستقل نصب العین زندگی کی تعمیر شروع کی۔ اسی دن سے وہ ابسن کی راہ سے دور ہٹنے لگا۔ خیالات کے علاوہ طرزِ ادا اور اسلوب بیان کے اعتبار سے بھی ابسن اور شا میں بہت بڑا فرق ہے۔

ان تنقیدی مضامین کی بدولت جو اہل انگلستان کے عزیز ترین عقائد کی بنیاد کو ہلا رہے تھے۔ لوگ برناڈ شا کے نام کے دشمن ہو گئے۔ اور اس پر ہر طرف سے نفرین کی بوچھار ہونے لگی۔ یہی سبب ہے کہ جب اس نے خود تصنیف کے میدان میں قدم رکھا تو اس کی کتابیں عرصہ تک رواج نہ پا سکیں۔ ابتدا میں چند ناول لکھے۔ لیکن اسے بہت جلد محسوس ہو گیا کہ ادب کی اس صنف سے اس کی طبیعت کو مناسبت نہیں ہے، اس لئے اس نے ڈراما کو اختیار کیا۔ انگلستان کے ادیب اور نقاد تو اس سے جلے ہی بیٹھے تھے، اس کے پہلے ناٹکوں کے شائع ہوتے ہی ہر طرف سے اعتراضات کی باڑھ چلنے لگی۔ شا نے نہایت ہمت اور استقلال سے اس مخالفت کا مقابلہ کیا۔ اور رفتہ رفتہ لوگوں کے تعصبات پر فتح پاکر بہتوں کو اپنا ہمخیال اور قریب قریب سب کو اپنا قدردان بنا لیا۔

شا کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر ناٹک کے ساتھ ایک مفصل دیباچہ لکھتا ہے۔ جس میں وہ اپنے فنی اور اخلاقی نقطۂ نظر کی تشریح کرتا ہے۔ اور نقادوں کے اعتراضات کا جواب دیتا ہے۔ اس جدت کو بہت سے لوگ سینہ زوری سمجھتے ہیں لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دو وجہوں سے یہ طرز عمل اختیار کرنے پر

مجبور ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ وہ محض جمالیاتی ذوق کی خاطر نہیں بلکہ سماج کی تنقید واصلاح کی غرض سے لکھتا ہے، وہ اخلاق و معاشرت کے بارے میں اپنے مخصوص خیالات رکھتا ہے اور انھیں رواج دینا چاہتا ہے۔ ناٹک کے اشخاص کی گفتگو میں موقع بے موقع اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے مگر قصہ آخر قصہ ہی ہے۔ اس میں اتنی گنجائش نہیں کہ کوئی نظریہ منطقی ترتیب سے پیش کیا جا سکے۔ اس لئے شا کو یہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ دیباچہ میں وہ مسائل جن کا ناٹک میں سرسری طور پر ذکر آیا ہے زیادہ مفصل اور مدلل طریقے پر بیان کرے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ابتدا میں انگلستان کے سارے نقاد شا کی مخالفت میں یک زبان تھے اور اس کا طرف دار کوئی نہ تھا۔ اس لئے وہ مجبور ہوا کہ اپنی حمایت میں خود قلم اٹھائے۔ اس کی دیانت داری اور صاف گوئی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ اپنی زبان سے اپنی تعریف کرتے نہیں شرماتا۔ اپنے ناٹکوں کے دیباچوں میں وہ طنز اور مضحکے کی تلوار سے معترض پر وار کرتا ہے اور ظرافت کی سپر سے اپنی شہرت کی حفاظت کرتا ہے۔ اور اس میں بھی دوسرے مصنفوں کی طرح شہرت پسندی اور داد طلبی کی کمزوری ہے مگر اس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ محض اپنی تصانیف اور اپنے خیالات کی ترویج چاہتا ہے، اپنے ہمعصروں کی طرح اپنی زندگی کی جزویات کو اخباروں میں شائع نہیں کرتا۔ اور اپنی خودستائی کو ظرافت کے پیرائے میں اس خوبی سے نبھاتا ہے کہ وہ بدنما

نہیں معلوم ہوتی"۔

بہر حال یہ دیباچے اس کے خیالات کی اشاعت اور اس کی شہرت کی حمایت کے لئے خواہ کتنے ہی ضروری کیوں نہ ہوں، لیکن خالص آرٹ کے نقطۂ نظر سے ضرور قابل اعتراض ہیں۔ اس لئے کہ آرٹ کی دلکشی اور دلفریبی کا راز یہ ہے کہ وہ علم کی طرح زندگی کو بے جان اور بے رنگ معانی میں تحلیل نہیں کرتا۔ بلکہ اس کی نیرنگیوں کی جیتی جاگتی تصویریں دکھاتا ہے۔ خصوصاً ڈرامے کا تو کام ہی یہ ہے کہ ایک زندہ اور سالم مرقع مشاہدے کے سامنے پیش کرے، برناڈ شا یہ غضب کرتا ہے کہ اپنے ناٹک میں ایسا مرقع بنا کر اسے دیباچے میں پھر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتا ہے۔ اس کے اکثر ناٹکوں میں زندگی، تازگی اور جرأت موجود ہے۔ اگر ان کے دیباچے پڑھ کر انھیں پڑھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ محض سرد اور خشک علمی مقالے ہیں۔

بات یہ ہے کہ برناڈ شا جس طرح آرٹ کا کوئی علیحدہ اور مستقل مقصد تسلیم نہیں کرتا اسی طرح وہ اس کے مخصوص قوانین کا بھی قائل نہیں، وہ صرف اپنے ناٹک کے ساتھ دیباچہ لکھ کر ان قوانین کو پامال نہیں کرتا بلکہ خود ناٹک کے اندازِ تحریر، قصے کی ترتیب، اشخاص کی سیرت نگاری میں بھی اصول فن کی طرف سے بے پروائی برتتا ہے۔ اس کا اسلوب بیان سادہ، بے تکلف اور پر زور ہے جیسا علمی مسائل پر عام فہم رسالے لکھنے میں اختیار کیا جاتا ہے

وہ عموماً اپنی عبارت میں ادبی خوبیاں پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ البتہ کہیں کہیں (جیسے کینڈیڈا میں نوجوان شاعر کی گفتگو یا "جان بل کا دوسرا جزیرہ" میں مجنوں پادری کی تقریر) خطیبانہ بلند پروازی سے بھی کام لیتا ہے لیکن ظرافت اور طنز کی چاشنی اس کے یہاں ایسی ہے کہ خواہ وہ کیسے ہی خشک مسئلے پر بحث کرے اسے بے حد دلچسپ بنا دیتا ہے۔ سیرت نگاری اس کے ڈرامے کا کمزور پہلو ہے۔ اس کے اشخاص عموماً کوئی اپنی علیحدہ شخصیت نہیں رکھتے بلکہ مختلف طبقوں اور مختلف پیشوں کے نمائندے ہوتے ہیں۔ خصوصاً وہ جن کی زبان سے وہ اپنے خیالات ادا کرتا ہے۔ بالکل کٹ پتلی بن کر رہ جاتے ہیں۔ اس کے سارے ناٹکوں میں صرف دو اشخاص ایسے ہیں جن کی خیالی تصویر میں جان ڈالنے میں وہ کامیاب ہوا ہے: سینٹ جون اور جولیس سیزر۔ اور یہ دونوں تاریخی شخصیتیں ہیں جنھیں اس نے اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے۔ اپنے ناٹکوں میں دلچسپ "مواقع" پیدا کرنے میں بھی وہ کوئی خاص اہتمام نہیں کرتا۔ لیکن ڈراما کی حقیقت کے خلقی احساس کی بدولت وہ محض گفتگو کی گرمی اور جوش سے ناٹک کے مناظر کو موثر بنا دیتا ہے۔ اس کا سارا کمال گفتگو کے زور شور اور طنز و ظرافت کی نوک جھونک میں ہے۔ خوش طبعی کی جن تین قسموں کا ہم ذکر کر چکے ہیں ان میں سے دل لگی کا تو برنارڈ شا کے یہاں کہیں نام ہی نہیں۔ البتہ ظرافت اور طنز سے اس کی تصانیف کا ہر صفحہ مالا مال ہے۔ بعض ناٹکوں میں مثلاً "اللہ اعلم بالثواب"

اور "شادی کی بات چیت" میں تو قصے اور واقعات کا جزو محض برائے نام ہے اول سے آخر تک سوائے ظریفانہ طنز آمیز مکالمے کے اور کچھ نہیں۔ لیکن ان ہی مکالموں میں اس نے یہ کمال دکھا دیا ہے کہ دونوں ناٹک پڑھنے میں دلچسپ ہیں اور اسٹیج پر کامیاب۔

اسلوب بیان اور زور کلام کے اعتبار سے برناڈ شا کے ابتدائی دور اور آخری دور کے ناٹکوں میں کچھ بڑا فرق نہیں ہے۔ وہ جوانی میں بڑھاپے کی پختہ کاری رکھتا تھا اور بڑھاپے میں جوانی کی تازگی اور جوش رکھتا ہے۔ البتہ خیالات کے اعتبار سے اس کی تصانیف کا رنگ بہت کچھ بدلتا رہا ہے، ہم اس کے نظریۂ زندگی کے ارتقا کے تین دور قرار دے سکتے ہیں۔

(۱) تخریبی تنقید۔

(۲) تعمیری تنقید

(۳) ایک مستقل فلسفۂ حیات کی تشکیل۔

<u>تخریبی تنقید</u>:۔ سب سے پہلے شا کے سات ناٹکوں کا سلسلہ "خوشگوار" اور "ناخوشگوار" کے نام سے شائع ہوا جو حسب ذیل تمثیلوں پر مشتمل تھا۔

(۱) "اسلحہ اور انسان"

(۲) "تقدیر کا بندہ"

(۳) "کینڈیڈا"

(۴) "عشقبازؔ"

(۵) "مسز وارن کا پیشہ"

(۶) "رنڈووں کا گھر"

(۷) "واللہ اعلم بالصواب"

یہ ہمارے ڈرامہ نگار کے شباب کا زمانہ تھا۔ سب مخلص نوجوانوں کی طرح وہ بھی اپنے سینے میں ایسا دل رکھتا تھا جو اصلاحی جوشش اور انسانی ہمدردی سے معمور رہتا۔ مروجہ رسوم و اخلاق کی خرابیاں اس کی نظروں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی تھیں۔ اسے یقین تھا کہ قدیم طرزِ معاشرت کی بنیادیں بالکل کھوکھلی ہو گئی ہیں اور جب تک اس عمارت کو گرا کر اور اس کی بنیادوں کو بدل کر دوسری بنیادیں قائم نہ کی جائیں کسی جدید زندگی کا تعمیر کرنا ناممکن ہے۔ اسے قدیم سماج سے سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ وہ کائنات اور زندگی کے مشاہدے میں اپنی آنکھوں سے کام نہیں لیتی بلکہ ہر چیز کو عینیت یا رومانیت کی عینک سے دیکھتی ہے۔ عینیت سے شاؔ کی مراد ہے اخلاق و معاشرت کے ان اصولوں کو جو انسان کی ہدایت اور بہتری کے لئے بنائے جاتے ہیں مستقل مقاصد سمجھ لینا، اور انسان کی راحت و مسرت یا اس کی زندگی کو ان اصنامِ خیالی پر قربان کر دینا۔ اور رومانیت اس کے نزدیک عقل کے بجائے جذبات کو عقیدے اور عمل کا معیار بنانے کا نام ہے۔

رومانیت کے روح رواں عشق و شجاعت کے جذبات ہیں۔ اس کا نصب العین زندگی یہ ہے کہ انسان محبت کو منزل مقصود اور دلیلِ راہ سمجھے اور محبوب کی راہ میں جانبازی اور سرفروشی کے کارنامے دکھائے۔ شا اس نصب العین پر سختی سے نکتہ چینی کرتا ہے۔ اور رومانیوں کے نزدیک عشق و شجاعت کا جو مفہوم تھا اس کا مضحکہ اڑاتا ہے۔

"اسلحہ اور انسان" اور "تقدیر کا بندہ" ان دونوں ناٹکوں میں شا شجاعت کی حقیقت سے بحث کرتا ہے۔ رومانی نقطۂ نظر سے شجاعت اسے کہتے ہیں کہ انسان بڑے سے بڑے خطرے کی کوئی حقیقت نہ سمجھے اور ہرچہ بادا باد کہہ کر بے تامل اپنی جان ورطۂ ہلاکت میں ڈال دے۔ "اسلحہ اور انسان" میں ایک لڑکی کا قصہ ہے جس کی تربیت انھیں خیالات کی فضا میں ہوئی ہے۔ ایک بار جنگ کے زمانے میں اتفاقاً ایک سوئسٹانی سپاہی اس کے یہاں پناہ لیتا ہے یہ آزمودہ کار جنگ آزما اسے شجاعت کی حقیقت سے آگاہ کرتا ہے۔ اس کے خیال میں بے سمجھے بوجھے اپنی جان پر کھیل جانا حماقت ہے۔ اچھے سپاہی وہ ہیں جو بغیر اشد ضرورت کے خطرے کے پاس نہیں جاتے ہیں۔ جب جاتے ہیں تو اپنے بچانے کا پورا سامان کر لیتے ہیں۔

"تقدیر کا بندہ" میں اس نے عہد جدید کے سب سے بڑے فوجی ہیرو نپولین کی تصویر کھینچی ہے اور اس عام خیال کی تردید کی ہے کہ نپولین غیر معمولی

رعب اور دبدبے کا آدمی تھا۔ اور بڑے سے بڑے خطرے کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ شا کا نپولین بہت سی باتوں کے لحاظ سے معمولی آدمی ہے۔ البتہ اس میں ارادے کی پختگی، چالاکی، مردم شناسی دوسروں سے زیادہ ہے۔

عشق کے جس تصور نے رومانیت کی آب و ہوا میں پرورش پائی تھی۔ وہ یہ تھا کہ یہ ایک مبارک جذبہ ہے جو یکایک انسان کے سینے میں بھڑک اٹھتا ہے۔ اور اس کے جسم و روح پر چھا جاتا ہے۔ سچے عشق میں یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ جادو بن کر معشوق کے دل کو تسخیر کر لیتا ہے۔ یہ جذبہ زندگی کے عام قوانین کے تحت میں نہیں آتا بلکہ اپنا جداگانہ قانون رکھتا ہے۔ اس کی بدولت انسان کی سعادت اور مسرت کی تکمیل ہوتی ہے۔ اور اسے اعلیٰ روحانی مدارج حاصل ہوتے ہیں۔ شا نے "کینڈیڈا" میں عشق کے اس تصور کو آماجگاہ بنایا ہے۔ عاشقوں کی بے چینی اور بے قراری کو وہ جوانی کی جذبات پرستی کا نتیجہ سمجھتا ہے جو انسان کی شان خودداری کے خلاف ہے۔ اس ناٹک میں ایک نوجوان شاعر کے عشق مضطرب کا مقابلہ ایک پختہ کار خاتون کی پرسکون دوستی سے کیا گیا ہے۔ وہ ایک پادری کی بیوی ہے اور اپنے شوہر سے محبت رکھتی ہے باوجود اس کے شاعر کے جوشِ محبت سے وہ متاثر ہوتی ہے اور اس سے بہت مانوس ہو جاتی ہے لیکن وہ جانتی ہے کہ اپنے عاشق سے جو رابطہ ہے وہ جذبات کے عارضی ہیجان پر مبنی ہے مگر اپنے شوہر سے جو تعلق ہے وہ مصالح زندگی کی مضبوط بنیادوں پر

قائم ہے۔ اس لئے وہ شاعر کے عرض نیاز کو خوش اسلوبی سے رد کر دیتی ہے۔

شا کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ نقادوں کی تنقید اور مصلحوں کی اصلاح پر بہت زور دیتا ہے۔ وہ اس حقیقت سے واقف ہے کہ نئے زمانے والے پرانے لوگوں کی جن کمزوریوں پر اعتراض کرتے ہیں وہ ایک دوسری شکل میں خود ان میں موجود ہیں۔ مثلاً یہی عینیت اور رومانیت جو اس کے ہمعصروں کی نظر میں قابل مضحکہ ہیں۔ "عشقباز" میں اس نے "اِبسن کلب" کا نقشہ پیش کیا ہے۔ جس کے ارکان آزاد خیال اور ترقی پسند ہونے کے مدعی ہیں۔ مگر ان میں سے سن رسیدہ جماعت (جس کا نمائندہ کرنل کریون ہے) عملاً ان تعصبات میں مبتلا ہے۔ نوجوان ممبروں میں بھی جولیا جذبات پرستی میں رومانی عہد کی عورتوں کو مات کرتی ہے، سب سے دلچسپ شخصیت، ایک نوجوان ڈاکٹر کی ہے۔ جو کرنل کریون کا معالج ہے۔ اس کا خیال ہے کہ کرنل کریون ایک مہلک بیماری میں مبتلا ہے جسے سب سے پہلے اس نے معلوم کیا ہے۔ ڈاکٹر کو اپنی اس تحقیق پر بڑا ناز ہے۔ مگر اس کی اشاعت سے پہلے وہ مزید اطمینان کر لینا چاہتا ہے۔ بعض فیصلہ کن تجربوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کا خیال غلط تھا اور کرنل کریون کو کوئی بیماری نہیں ہے۔ بجائے اس کے کہ ڈاکٹر کو اپنے مریض کی سلامتی سے خوشی ہو۔ اسے اپنے مرض کے ثابت نہ ہونے سے سخت صدمہ ہوتا ہے۔ ادھر کریون اس بات پر خفا ہے کہ ڈاکٹر

کے اس خیالی خطرے کی بنا پر وہ عرصہ تک گوشت اور شراب کے استعمال سے محروم رہا، بلکہ انجمن مخالفین شراب نوشی کا صدر بھی بن گیا۔ یہاں برنارڈ شا کو جدید عین پرستی کی جگہ لینا منظور ہے۔ اس کے خیال میں جس طرح پرانے خیال کے لوگ مجرد مذہبی اور اخلاقی تصورات کی پرستش کرتے تھے اسی طرح نئے زمانے کے لوگ سائنس کی کرتے ہیں۔ اس زمانے کے پادریوں کو گناہگاروں کی نجات سے زیادہ گناہ کی حقیقت سے دلچسپی تھی، اسی طرح آج کل ڈاکٹروں کو مریض کی صحت سے زیادہ مرض کی ماہیت سے ذوق ہے۔ جس طرح وہ جیتے جاگتے انسانوں کو دین داری یا نیکی کے نام پر قربان کر دیتے تھے اسی طرح یہ لوگ انھیں علمی تحقیقات کی دیوی پر بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔

"مسز وارن کا پیشہ" اور "رنڈووں کا گھر" میں شا نے دو بڑی اخلاقی خرابیوں کی پردہ داری کی ہے۔ جنہوں نے موجودہ مغربی تمدن کی جڑوں میں گھن لگا دیا ہے عصمت فروشی کا باقاعدہ کاروبار کی حیثیت سے فروغ پانا اور بے مایہ غریبوں کا سرمایہ داروں کے ہاتھ سے لوٹا جانا۔ ان دونوں ناٹکوں میں اس نے یہ دکھلایا ہے کہ ان خرابیوں کے ذمہ دار وہ خاص طبقے نہیں ہیں جو انھیں پیشے کے طور پر اختیار کرتے ہیں اور ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں جن میں سے ہزاروں کو اپنی اس آلودگی کی خبر بھی نہیں ہے۔ مثلاً مسز وارن نے یورپ کے بہت سے شہروں میں قحبہ خانے قائم کر رکھے ہیں مگر ان میں ایسے ایسے لوگوں کا سرمایہ اور

مشورہ شریک ہے جو سوسائٹی میں عزت و احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان لوگوں کی اولاد جسے یہ خبر نہیں کہ والدین کی آمدنی کس شرمناک کاروبار پر موقوف ہے، اسی ناپاک روپے سے تعلیم پاتی ہے۔ مسز وارن کی لڑکی کو جس نے اعلیٰ درجہ کی تعلیم و تربیت پائی ہے۔ جب اس کی خبر ہوتی ہے تو وہ گھر کی ناز و نعمت کو لات مار کر چلی جاتی ہے اور اپنی قوت بازو سے روزی پیدا کر کے عزت کی زندگی بسر کرتی ہے۔ مگر اتنی غیرت و حمیت ہر شخص میں نہیں ہوتی، بہت سے لوگ یہ جانتے ہیں کہ ان کی آمدنی کا ذریعہ ناجائز ہے اور اس سے نفرت بھی رکھتے ہیں مگر ان میں اتنی ہمت نہیں کہ اس سے ہاتھ اٹھائیں اور حلال کی روٹی کما کر کھائیں۔

"رنڈووں کا گھر" میں ایک نوجوان کا قصہ ہے جو اپنی منسوبہ کے باپ پر یہ الزام لگاتا ہے کہ وہ ناجائز ذرائع سے روپیہ کما کر امیر ہو گیا ہے۔ وہ چند مکانوں کا مالک ہے جن میں غریب مزدور کرائے پر رہتے ہیں، مکان اس قدر تنگ و تاریک، بوسیدہ اور گندے ہیں کہ رہنے والوں کو سخت تکلیف ہے اور ان کی صحت برباد ہو رہی ہے۔ وہ ان کی کبھی مرمت نہیں کراتا۔ مگر بچارے غریبوں سے کرایہ خوب دبا کر وصول کرتا ہے۔ نوجوان کے طعنوں کے جواب میں بڈھا یہ ثابت کرتا ہے کہ نوجوان کی آمدنی بھی ایسے ذرائع سے ہوتی ہے جو غریبوں کو لوٹنے پر موقوف ہے، نوجوان کو سخت ندامت ہوتی ہے مگر بجائے اس کے کہ وہ اپنے

دامن کی آلودگی کو دور کرے، وہ دوسرے کی تر دامنی سے چشم پوشی کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔

ان سب ناٹکوں میں شا نے سماج کی ریاکاری کی جھاڑ کی ہے، وہ ریاکاری کو بڑا اخلاقی گناہ سمجھتا ہے۔ اس لئے اس کی تضحیک قریب قریب اس کے ہر ناٹک میں موجود ہے۔

اس کے بعد شا کے تین ناٹک "پیوریٹن لوگوں کے لئے تین ناٹک" کے نام سے شائع ہوئے۔ ان سے شا کی تعمیری تنقید کا دور شروع ہوتا ہے۔ اب وہ مسلمہ عقائد اور مروجہ اخلاق پر نکتہ چینی کرنے پر اکتفا نہیں کرتا۔ بلکہ اپنے نظریۂ زندگی کی ایک جھلک بھی دکھاتا ہے۔ اس کے اصول اخلاق کا لب لباب یہ ہے کہ: انسان بالطبع نیک ہے لیکن اس کے ماحول کی خرابیاں اس کی سیرت کو برباد کر دیتی ہیں۔ اس کی اصلاح وعظ و نصیحت سے نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس کے لئے ضرورت ہے کہ وہ رکاوٹیں دور کر دی جائیں جو اس کی فطرت کی آزاد نشوونما میں حائل ہیں۔ نیکی وہی ہے جو انسان اپنی فطرت کے تقاضے سے کرتا ہے۔ نہ کہ کسی خارجی مقصد کے لئے۔

"شیطان کا مرید" میں ایک ایسے شخص کا قصہ ہے جو سماج کے نقطہ نظر سے مجرم سمجھا جاتا ہے۔ وہ ایک عورت کو جس سے وہ واقف تک نہیں، ہلاکت سے بچانے کے لئے اپنی جان دے دیتا ہے۔ اس کے پیش نظر عشق و محبت یا ہمدردی یا ایثار غرض کوئی شعوری، روحانی یا اخلاقی مقصد نہیں ہے بلکہ ایک مصیبت زدہ کو دیکھ کر

اس کا جی بے اختیار چاہتا ہے کہ اپنی جان دے کر اسے بچائے۔ اور وہ بے سوچے سمجھے یہ کر بھی گذرتا ہے۔

"کپتان براس باؤنڈ کا انتقام" میں شا نے انتقام کے جذبے کے رومانی ملمع کو دور کر کے اس کی بدنمائی اور مضرت دکھائی ہے۔ براس باؤنڈ اپنے ایک رشتہ دار جج کے خلاف، جس نے اس کے خیال میں اس کی ماں کے ساتھ ظلم کیا تھا، انتقام کا جذبہ دل میں لئے ہوئے ڈاکو بن گیا ہے۔ اسے یہ معلوم نہیں کہ ماں اپنی بدکرداری کے سبب اسی برتاؤ کی مستحق تھی۔ اتفاق سے وہ جج افریقہ کے صحرا میں براس باؤنڈ کے ہاتھ پڑ جاتا ہے۔ مگر اس کی بہن لیڈی سسلی کی ہمت، دانشمندی اور سبک دستی کی بدولت اس کی جان بچتی ہے۔ وہ بلطائف الحیل براس باؤنڈ کو روکتی رہتی ہے، یہاں تک کہ وہ اسے سچے واقعات سے آگاہ کرتی ہے۔ اس کا طلسم انتقام ٹوٹ جاتا ہے۔ آنکھیں کھول کر زندگی کو اس کے اصلی رنگ میں دیکھنے لگتا ہے۔

تیسرا ناٹک "جولیس سیزر" اس دور کا سب سے اہم ڈرامہ ہے اور شا کی بہترین تصانیف میں اس کا شمار ہے۔ "جولیس سیزر" کا کیرکٹر گویا شا کے آئیڈیل ہیرو کی تصویر ہے۔ اس میں ذہانت، نکتہ سنجی، معاملہ فہمی، ظرافت وغیرہ ذہنی خوبیوں کے علاوہ اخلاقی صفات بھی موجود ہیں جو شا کے نزدیک ایک قائد اور فاتح کے لئے ضروری ہیں۔ اولوالعزمی، حوصلہ مندی، ہمت، استقلال

انھیں صفات کی بدولت وہ دلوں پر حکومت کرتا ہے، اس کے مزاج میں، اس کے طرزِ زندگی میں اس کی گفتگو میں انتہائی سادگی ہے۔ تکلف یا بناوٹ کا نام تک نہیں۔ اس کے رعب وداب اور اس کے اثر و نفوذ کا راز محض اس کی شخصیت میں پنہاں ہے۔ وہ اپنی طبیعت پر پورا قابو رکھتا ہے۔ اور عارضی جذبات کے جوش میں اپنے مستقل مقاصد کو نہیں بھولتا۔ وہ ضرورت کے وقت حکمتِ عملی اور دروغ مصلحت آمیز سے کام لیتا ہے۔ لیکن بدعہدی یا بے وفائی کبھی نہیں کرتا اپنوں اور غیروں کے بڑے سے بڑے قصور کو معاف کر دیتا ہے۔ لیکن اس کی وجہ رحم و مروت نہیں بلکہ تدبر اور مصلحت اندیشی ہے۔ اپنے وفادار رفیقوں کی بڑی قدر کرتا ہے لیکن کسی سے اس کو اتنا تعلق خاطر نہیں جسے دوستی کہہ سکیں۔ اس کی زندگی مافوق الافراد مقاصد کے لئے وقف ہے۔ ذاتی محبت اور عداوت کی نہ وہ صلاحیت رکھتا ہے نہ فرصت۔

"میجر باربرا" اور "جان بل کا دوسرا جزیرہ" میں یہ تعمیری تنقید اور بھی صاف نظر آتی ہے۔ "میجر باربرا" میں شا نے مذہبی احساس اور جذبۂ خدمت کی قدر و قیمت سے بحث کی ہے۔

باربرا ایک لکھ پتی انڈرشیفٹ کی بیٹی ہے۔ جو دینداری اور انسانی ہمدردی کے جوش میں مکتی فوج میں داخل ہو جاتی ہے۔ اس کا باپ بہت سے کارخانوں کا مالک ہے اور اپنے کاروبار کو جدید ترین طریقہ پر نہایت خوش اسلوبی سے

جلاتا ہے ۔ اس کے یہاں مزدوروں کو معقول اجرت ملتی ہے ۔ ان کے لئے حفظانِ صحت، تعلیم و تربیت، سیر و تفریح کا معقول انتظام ہے ۔

باربرا اپنے باپ کو غاصب، جابر، بے دین اور اس کے روپئے کو ناپاک سمجھتی ہے، اس کا عقیدہ ہے کہ یہ دولت مند سرمایہ دار دنیا کو ہلاکت کی طرف لے جا رہے ہیں ۔ اور اس کی نجات صرف مکتی فوج کی تحریک ہو سکتی ہے ۔ وہ اس تحریک میں نہایت خلوص اور سرگرمی سے کام کرتی ہے اور سچی ہمدردی، دلسوزی، پاک نفسی کی بدولت بہت سے بدنصیب لوگوں کی جو جرم و افلاس میں مبتلا ہیں، بڑی حد تک اصلاح ہو جاتی ہے ۔ لیکن اس کی جماعت کو مالی امداد کے لئے اس کے باپ کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے جس کے صدمے سے اس کا دل ٹوٹ جاتا ہے، شا اس ڈرامے میں مذہبی تحریکوں کے خلوص کا اعتراف کرتا ہے ۔ لیکن اس کے خیال میں جدید زمانے میں دنیا کی نجات غریبوں کی بھولی بھالی دینداری اور ایثار سے نہیں ہو سکتی ۔ بلکہ فرض شناس امیروں کی تنظیم اور تدبیر سے ۔

"جان بل کا دوسرا جزیرہ" میں بھی شا نے مغربی تمدن کے دورِ جدید کی روح کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے ۔ اس میں شا نے ترقی پذیر انگلستان اور جمود میں مبتلا آئرستان کا مقابلہ کر کے یہ دکھایا ہے کہ جو قوم زمانے کو نہیں پہچانتی اور اس کے ساتھ نہیں چلتی وہ ہمیشہ مغلوب رہے گی ۔ شا کے نزدیک آئرستان والے انگریزوں سے زیادہ گہرا تخیل رکھتے ہیں ۔ ان سے زیادہ سمجھدار

اور ذہین ہیں لیکن زمانے کی رفتار سے نا آشنا ہیں۔ اس لئے میدانِ عمل میں دست پاچہ ہو کر رہ گئے، انگریز ان سے ذہنی اوصاف میں کم ہیں، لیکن انھوں نے اپنے زمانہ کی روح کو جذب کر لیا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ان کی یہ کم نظری اور کم فہمی ان کے حق میں نعمت ہے۔ کیونکہ اسی کی بدولت وہ بغیر کسی خاص کوشش کے اور بغیر محسوس کئے ہوئے روح زمانہ کے آلۂ کار بن گئے ہیں۔ زمانہ کے رجحانِ افادیت، صنعت و حرفت، شہری زندگی، مشترکہ کاروبار کی طرف ہے۔ آئرستانیوں کو ابھی تک ان چیزوں سے مناسبت نہیں پیدا ہوئی انگریز مدتوں پہلے اپنی طبیعت کو ان کے مطابق بنا چکے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ وہ آئرستان پر حاوی ہیں۔

مستقل فلسفۂ حیات کی تشکیل

اب تک برنارڈ شا کے پیش نظر کوئی مکمل اور مربوط نظریۂ زندگی نہیں تھا۔ اُسے کوئی چیز ایسی نہیں ملی تھی جسے وہ زندگی کی بنیاد اور اس کی کنجی قرار دے سکے۔ مگر اس کا عقیدہ تھا کہ زمانہ ترقی کر رہا ہے۔ ہر دور پچھلے دور سے بہتر ہے، جس کی بڑی علامت یہ ہے کہ زندگی سے جذبات و تخیلات کا اثر کم ہوتا جاتا ہے اور عقل کا عنصر بڑھتا جاتا ہے۔ اصنام خیالی کی پرستش چھوڑنے سے انسان کی قوت مشاہدہ آزادی سے نشو و نما پا رہی ہے۔ اس کی آنکھوں سے حجابات اٹھ رہے ہیں اور وہ زندگی کی

دیکھنے اور سمجھنے لگا ہے۔ لیکن جب اس نے یونانی ادب اور فلسفہ خصوصاً افلاطون کی تصانیف کا مطالعہ کیا تو اسے معلوم ہوا کہ دنیا میں ڈھائی ہزار برس پہلے ایک قوم موجود تھی جو آزادیٔ خیال اور نظر کی گہرائی اور وسعت میں آج کل کے لوگوں سے پیچھے نہ تھی۔ اس سے وہ یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوا کہ ذہنی اور روحانی اعتبار سے دنیا نے کچھ زیادہ ترقی نہیں کی ہے۔ لیکن اس کے اس عقیدے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی کہ انسانی زندگی میں ترقی کی صلاحیت اور قوت موجود ہے۔ اس قوت کے فعل میں نہ آنے کا سبب اس نے یہ قرار دیا کہ انسان اب تک زندگی کی حقیقت کو نہیں سمجھا ہے۔ اور عمل ارتقا میں مدد دینے کے بجائے اس میں رکاوٹیں ڈال رہا ہے۔ اس کا تصور کائنات ایک حد تک شوپن ہاؤر کے فلسفے سے ماخوذ ہے۔

شوپن ہاؤر کے نزدیک ہماری زندگی اور ہماری دنیا کی اصل "ارادہ للحیات" ہے۔ یہ ایک اندھی قوت ہے جس نے اپنے اظہار کے لیے یہ بے معنی گورکھ دھندا بنا رکھا ہے۔ انسان کی نجات اسی میں ہے کہ زندگی کو مٹا کر اس جابر قوت کے پنجے سے چھوٹ جائے۔ شا نے اس عالمگیر قوت کا نام قوت حیات رکھا ہے۔ اس کے خیال میں بھی یہ قوت شعور اور احساس سے خالی ہے۔ مگر اندھی نہیں ہے کیونکہ اس کا رخ ایک اعلیٰ مقصد کی طرف ہے، وہ مقصد یہ ہے کہ دنیا میں ایک ایسی نسل پیدا کرے جو نسل انسانی سے بہتر اور برتر ہو۔ یہی نیٹشے کا مافوق البشر کا نصب العین ہے

شاؔ کے نزدیک یہ قوت عورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ وہ اپنے لئے ایسا مرد ڈھونڈتی ہے جو اس سے جسمانی اور روحانی مناسبت رکھتا ہو۔ یہ انتخاب بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اسی پر آئندہ نسل کی صورت اور سیرت کا انحصار ہے۔

"بشر اور مافوق البشر" میں شاؔ نے ٹینر اور این کا قصہ سنا کر اس نظریئے کی تشریح کی ہے۔ یہ اس کا سب سے مشہور ڈراما ہے اور بعض لوگوں کے نزدیک اس نے اس میں اپنا سارا کمال صرف کر دیا ہے۔

اپنے فلسفۂ حیات کے بنیادی اصولوں کو معین کرنے کے بعد شاؔ نے اس کے ماتحت زندگی کے جزوی مسائل پر غور کرنا شروع کیا۔ اس کے اخلاقی نظریے میں بہت بڑی تبدیلی ہو گئی۔ پہلے وہ اخلاق کا معیار اور مقصد فرد کی شخصی فلاح کو قرار دیتا تھا مگر ایک مافوق الافراد قوت کا قائل ہو جانے کے بعد وہ ان مسائل کو بہت وسیع زاویۂ نظر سے دیکھنے لگا۔ "شادی کی بات چیت" میں جو محض نام کے لئے ڈراما ورنہ اصل میں ایک مکالمہ ہے اس نے شادی کے مسئلے پر بحث کی ہے، نکاح کے مروجہ طریقے کی مخالفت اور موافقت میں بہت سی دلیلیں پیش کی جاتی ہیں۔ عورت اور مرد کے تعلقات کی متعدد صورتیں ہیں مگر کوئی بھی وسیع اجتماعی نقطۂ نظر سے قابل قبول نہیں ٹھیرتی۔ آخر فیصلہ ہوتا ہے کہ پرانے طریقے میں تبدیلی کرنا سہل نہیں ہے۔

"ڈاکٹروں کی حیرانی" کے پڑھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاؔ اس دور میں اپنے

اخلاقی اصول میں افلاطون کی طرح بہت سخت گیر ہو گیا ہے۔ وہ سماج کی مجموعی فلاح کے لیے افراد کی زندگی قربان کرنے کو تیار ہے۔ قصہ یہ ہے کہ ایک بدچلن اور بدخصال آرٹسٹ جو اپنے فن میں کمال رکھتا ہے ایک مہلک بیماری میں مبتلا ہے۔ اس کے جاں بر ہونے کی صرف یہ صورت ہے کہ ڈاکٹر غیر معمولی توجہ اور اہتمام سے علاج کریں لیکن ڈاکٹروں میں اس معاملے میں اختلاف رائے ہے۔ بعض کے نزدیک مریض کو اچھا کرنے کی انتہائی کوشش کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اس کے کمال فن سے سماج کو فائدہ پہنچے گا۔ بعض کے نزدیک اسے اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ کیونکہ اس کی زندگی اخلاقی حیثیت سے دوسروں کے لئے مضر ہوگی۔ دونوں فریق فرد کی زندگی کی قدر و قیمت محض سماج کی نسبت سے معین کرتے ہیں اور دونوں اس پر متفق ہیں کہ طبیب کا کام محض مریض کا علاج کرنا نہیں ہے بلکہ اس کے علاج کے اخلاقی نتائج کا بھی وہ ذمہ دار ہے۔ ان دونوں چیزوں میں افلاطون کا اثر صاف ظاہر ہے۔

"بشر اور مافوق البشر" میں شا نے "مافوق البشر" کا جو تصور قائم کیا تھا اس کا پورا خاکہ اس نے "رجوع بہ میتھوسلا" میں کھینچا ہے۔ مافوق البشر کا تدریجی ارتقا اس طرح ہوتا ہے کہ قوت حیات بعض لوگوں کو منتخب کر کے ان کی عمر بڑھاتی ہے۔ پہلے لوگوں کی عمر تین سو سال کی ہوتی ہے۔ پھر رفتہ رفتہ ہزاروں سال تک نوبت پہنچتی ہے۔ ان کا علم اور تجربہ بڑھتا جاتا ہے۔ ان کی عقل اور تدبیر میں وسعت

اور گہرائی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ ان پر کائنات کے بھید جن کے سمجھنے سے ہماری عقل عاجز ہے کھل جاتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں سے زندگی کی گتھیاں جن کا سلجھانا ہمارے نزدیک ناممکن ہے سلجھتی جاتی ہیں۔

اس دور کا آخری ڈراما "سینٹ جون" ہے۔ اس میں شا نے مذہبیت کے جذبے اور الہام کی حقیقت سے بحث کی ہے۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ وہ بچپن ہی میں نہ صرف مذہب عیسوی کا بلکہ مطلق مذہب کا مخالف ہو گیا تھا۔ اس میں کچھ تو اس کے ذاتی تلخ تجربات کو دخل تھا، کچھ زمانے کی ہوا کو صنعتی انقلاب سے تمدنی زندگی میں اور اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کے دلوں میں بہت انتشار پیدا ہو گیا تھا۔ ان میں اضطراب، بے چینی، غور اور شک کا مادہ حد سے زیادہ بڑھ گیا تھا ظاہر ہے کہ ایسی آب و ہوا میں فلسفہ اور مذہب دونوں کا پنپنا بہت مشکل تھا۔

برناڈ شا اُن لوگوں میں سے ہے جو خیالات کے دریا میں دھارے کے ساتھ بہنے پر قناعت نہیں کرتے۔ بلکہ تیر کر کنارے پر جانا چاہتے ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ شک اور نفی میں الجھنے کے بعد اس نے زندگی اور کائنات کے بنیادی مسائل کا ایک عقلی حل تلاش کر لیا لیکن اُسے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ محض عقل کی الجھن دور ہونے سے کام نہیں چلتا۔ انسان کی فطرت جس چیز کے لئے سب سے زیادہ تڑپتی ہے وہ یہ ہے کہ حقیقت کائنات سے روحانی اتحاد کا رشتہ قائم کرے۔ اور اپنی زندگی کو اس کے منشا کا پابند بنا دے۔ اس معاملے میں اسے

عقل سے کوئی مدد نہیں ملتی۔ کیونکہ وہ تو کائنات کا محض ایک بے جان معنوی تصور قائم کرتی ہے جس سے انسان کو کسی گہرے روحانی اتحاد کا احساس نہیں ہوتا ہے جس کے قوانین کی پابندی پر کوئی اندرونی تحریک اسے نہیں ابھارتی۔ یہاں اس کی ضرورت ہے کہ انسان باطنی مشاہدے اور وجدان سے کام لے کر حیات و کائنات کا صرف علم نہیں بلکہ عرفان حاصل کرے۔ یعنی اس میں اس طرح ڈوب جائے کہ اسے سرچشمۂ حقیقت سے یگانگی کا احساس ہونے لگے۔ اور اس کے قوانین خود اپنی فطرت کے قوانین معلوم ہونے لگیں۔ یہ انسان کی ذہنی نشوونما کی آخری سیڑھی ہے اور اسی کو مذہبیت کہتے ہیں۔ یہ جبھی ہو سکتا ہے کہ انسان کے خیال و عمل، اس کے ارادے اور جذبات میں ہم آہنگی ہو یعنی اس کی سیرت میں وحدت پیدا ہو چکی ہو۔ جب برنارڈ شا تہذیب نفس کی اس منزل سے گذر چکا تو وہ خود بخود مذہبیت کی سرحد میں داخل ہو گیا۔ نوعمری کی خام کاری میں اس نے مذہب کو بے حقیقت سمجھ کر رد کر دیا تھا۔ زندگی کے گہرے مشاہدے کے بعد سب سے برتر حقیقت سمجھ کر قبول کر لیا۔ سینٹ جون میں اسی کا اعتراف ہے۔

لیکن مذہب کے متعلق دو نقطۂ نظر ہو سکتے ہیں جو بظاہر بالکل متضاد ہیں ایک کی رو سے حقیقت اور قدرت کا سرچشمہ جسے خدا کہتے ہیں۔ زمان و مکان کی سرحد سے باہر ہے۔ انسان خود اپنی کوشش سے اس کا عرفان حاصل نہیں کر سکتا بلکہ اس کی طرف سے بعض مخصوص بندوں پر وحی آتی ہے۔ اور بعض کو الہام ہوتا ہے جس سے

انسانوں پر حیات و کائنات کے آخری بھید کھلتے ہیں۔ انھیں ان کی زندگی کا مقصد اور اس کے حاصل کرنے کے وزائع بتلائے جاتے ہیں۔ دوسرے کی رو سے خدا اسی زمان و مکان میں موجود ہے اور انسان باطنی مشاہدے اور وجدان کی بدولت بغیر کسی خارجی تحریک کے اس کی اور اس کے قوانین کی معرفت حاصل کرتا ہے، پہلے کو لاہوتی مذہب کہتے ہیں اور دوسرے کو ناسوتی۔ برناڈ شا زمانۂ حال کے اکثر پروٹسٹنٹ لوگوں کی طرح اسی ناسوتی مذہب کا قائل ہے۔ اسی نقطۂ نظر سے اس نے جون کی مذہبیت کا مطالعہ کیا ہے۔ جون کو جو صدائیں سنائی دیتی ہیں انھیں وہ خدا کا پیغام سمجھتی ہے جو اسے اولیاء اللہ کی زبانی پہنچتا ہے۔ برناڈ شا کے نزدیک یہ ندائیں خود جون کے دل میں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ ایک جاہل دیہاتی، بھولی بھالی لڑکی ہے۔ مگر اس میں غیر معمولی روحانی قوت ہے۔ وہ روح کائنات کا بلاواسطہ مشاہدہ کرتی ہے، لیکن چونکہ اس نے قدیم مذہبی روایات کی فضا میں پرورش پائی ہے اس کے دل میں اولیاء اللہ اور ان کی کرامتوں کا خیال بسا ہوا ہے اور وہ اپنی واردات قلب کو ولیوں کی طرف منسوب کرتی ہے۔ وہ مذہب کے ایک نئے تخیل کی علمبردار ہے۔ جو پندرھویں صدی میں پیدا ہو چلا تھا۔ اور جس سے رومی کلیسا کو سخت خطرہ تھا۔ کیتھولک مذہب کی رو سے کلیسا خلافت الٰہی کا وارث اور دینی اور دنیاوی حکومت کا حامل تھا، بندہ بلاواسطہ خدا تک نہیں پہنچ سکتا۔ اسے چاہیئے کہ کلیسا کے آگے سر تسلیم خم کر دے۔ اس کی اطاعت کو خدا کی اطاعت اور اس کے احکام کو قانون الٰہی سمجھے۔ جون اس

اصول کی منکر ہے۔ اس کا یہ دعوٰی کہ اس کے پاس خدا کا پیغام اولیار کی زبانی آتا ہے یہ معنی رکھتا ہے کہ بندے اور خدا کے درمیان کلیسا کے واسطے کی ضرورت نہیں۔ یہ کلیسا کی دینی حکومت سے بغاوت ہے۔ پھر اس کا یہ کہنا کہ خدا نے اسے انگریزوں کو فرانس سے نکال دینے پر مامور کیا ہے کیونکہ اس کی یہ مرضی نہیں ہے کہ کسی ملک پر غیر ملک کے لوگ حکومت کریں کلیسا کے لئے ایک اور خطرہ کا پیش خیمہ ہے۔ کیونکہ اس میں قومیت کا خیال مضمر ہے۔ یعنی یہ کہ ہر ملک کے رہنے والے ایک روحانی اتحاد رکھتے ہیں۔ اور ان کا حاکم صرف ان کا ہم قوم ہو سکتا ہے۔ یہ کلیسا کی دنیاوی حکومت کے خلاف بغاوت ہے جون کو خود اس کا احساس نہیں مگر کلیسا والے اسے خوب سمجھتے ہیں۔ انھیں کی کوششوں سے جادوگری کے الزام میں انگریزوں کے ہاتھ گرفتار ہو کر اسی الزام میں جلادی جاتی ہے۔

غرض برناڈشا کے نزدیک جون لوتھر کی پیش رو اور پرٹسٹنٹ مذہب کی ہراول ہے۔ اس کا فیصلہ کہ اس نے جون کی جو تصویر پیش کی ہے وہ صحیح ہے یا نہیں ان لوگوں کا کام ہے جنھیں پندرھویں صدی کی تاریخ پر پورا عبور ہو۔ مگر اس میں شبہ نہیں کہ برناڈشا نے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ مذہبوں کے بنیادی فرق کو اور اس انقلاب کو جو تیرھویں صدی میں رونما ہو رہا تھا خوب دکھایا ہے۔ اس نے دونوں میں سے کسی ایک کو صاف الفاظ میں دوسرے پر ترجیح نہیں دی ہے۔ اس کے انداز تحریر سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خود پروٹسٹنٹ مذہب کا پیرو

ہے اور اسے روحانی ارتقا کا بلند تر زینہ سمجھتا ہے۔ البتہ اس کا عقیدہ عام پروٹسٹنٹ عقیدے سے اس بارے میں مختلف ہے کہ وہ خدا کو دنیا کے باہر نہیں بلکہ دنیا کے اندر مانتا ہے۔

شاؔ نے اس ناٹک میں قرون وسطیٰ اور عہد جدید کے عام تمدن کا بھی مقابلہ کیا ہے۔ کسی زمانے میں وہ اس کا قائل تھا کہ ہر نیا دور تمدن کو ترقی کے بلند تر زینے پر پہنچا دیتا ہے۔ لیکن اب اس کے خیالات میں اتنا انقلاب ہو گیا ہے کہ وہ قرون وسطیٰ کو ایک حد تک عہد جدید پر ترجیح دیتا ہے خصوصاً اس اعتبار سے کہ اس زمانے میں زندگی کا ایک مکمل اور مرتب نظام موجود تھا۔ جو آجکل مفقود ہے عہد جدید کی بنیاد اس کے خیال میں قرون وسطیٰ کی بنیاد سے زیادہ وسیع اور مضبوط ہے۔ لیکن اس بنیاد پر جو عمارت بن رہی ہے وہ ابھی تک ناقص اور نا تمام ہے۔

برناڈ شا کی عمر اب ۷۰ برس کی ہو چکی ہے۔ اس کی شہرت عالمگیر ہے، اس کی تصانیف مقبول عام ہیں۔ جس سیاسی اور سماجی تحریک کا وہ علمبردار تھا آج انگلستان میں اس کی گرم بازاری ہے۔ جس جماعت کا وہ رفیق تھا وہ آج برسر حکومت ہے۔ کوئی دوسرا ہوتا تو عمر بھر کی ناکامیوں کے بعد اس کامیابی کو غنیمت سمجھتا۔ نصف صدی کی محنت شاقہ کے بعد آرام کا لطف اٹھاتا۔ لیکن برناڈ شا کو سکون و اطمینان سے کیا غرض۔ آرام سے کیا واسطہ۔ وہ جانتا ہے کہ اس کے ہم خیالوں کو جتنی کامیابی ہوئی ہے وہ محض ابتدائی ہے۔ زندگی کی بڑی گتھیاں

ابھی سب سلجھنے کو باقی ہیں۔ وہ بدستور سرگرمی سے اپنے کام میں مشغول ہے۔ یعنی زندگی کو طنز و ظرافت کی مہمیز سے چھیڑ رہا ہے اور تنقید کی باگیں ہاتھ میں لئے اسے ترقی کی سیدھی راہ پر چلانے کی کوشش کر رہا ہے۔

ڈرامہ کیا چیز ہے؟

(۱)

آرٹ کی تعریف :-

قبل اس کے کہ ہم ڈرامہ کی ماہیت سے بحث کریں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آرٹ کی مختصر سی تعریف کر دی جائے۔ آرٹ کا لفظ اب اردو زبان میں کثرت سے استعمال ہونے لگا ہے لیکن اس کا کوئی واضح مفہوم ہم لوگوں کے ذہن میں نہیں ہے۔ اصل میں یہ دو مختلف معنی پر حاوی ہے۔

(۱) وہ تخلیقی قوت جس کے ذریعہ سے انسان مادی اشیا اور ذہنی تصورات کی تشکیل اس طرح کرتا ہے کہ وہ حسین بن جاتی ہیں یعنی ان میں ایک خاص ترکیب تناسب یا توازن پیدا ہو جاتا ہے اور وہ مشاہدۂ جمال کے ذوق کو جو ہماری طبیعت کا فطری خاصہ ہے، تسکین دیتی ہیں۔ مثلاً مصوری یعنی وہ قوت جس کے ذریعہ سے سطح کاغذ پہ دلکش اور خوشنما نقوش بنائے جاتے ہیں۔

(۲) حسین چیزیں جو اس وقت قوت تخلیق کے محسوس مظاہر ہیں تصویر نغمہ شعر وغیرہ۔

دوسرے الفاظ میں آرٹ صنّاع کے کمال کو بھی کہتے ہیں اور ان مصنوعات کو بھی جن میں یہ کمال ظاہر ہوتا ہو۔

غرض آرٹ ایک طرح کی صنعت ہے لیکن اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا اصل مقصد افادی یا اقتصادی نہیں ہوتا بلکہ جمالیاتی ہوتا ہے یعنی وہی ذوق جمال کو تسکین دینا۔ اس لیے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ موضوع صنعت خود حسین ہو بلکہ حسن طرز ادا کی خوبی اور دلکشی سے پیدا ہوتا ہے البتہ یہ شرط ہے موضوع میں تناسب اور ہم آہنگی کے ساتھ تشکیل پانے کی صلاحیت موجود ہو۔ اب چاہے صنّاع اس کی عکسی تصویر پیش کر دے۔ یا اس میں اپنے تخیل سے رنگ آمیزی کرے۔

آرٹ زندگی کی دوسری قدروں یعنی مذہب، اخلاق یا علم و حکمت وغیرہ کے مقابلے میں اپنا ایک مستقل وجود رکھتا ہے لیکن ان سے بے تعلق نہیں ہوتا۔ مثال کے لیے شعر کو لیجئے۔ اس کے ناقص یا کامل ہونے کا معیار مذہب، اخلاق اور علم سے بالکل الگ ہوتا ہے۔ شعر میں ہم جو چیز ڈھونڈھتے ہیں اور جسے شاعری کی جان سمجھتے ہیں وہ روحانی معرفت یا اخلاقی بصیرت یا علمی حقیقت نہیں بلکہ خیالات اور الفاظ کی خوشنمائی ترتیب، ہم آہنگی، روانی اور دلکشی ہے جس کے ذریعے شاعر کا تخلیقِ حسن کا شوق اور شعر فہم کا مشاہدۂ جمال کا ذوق پورا ہوتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ شعر کا موضوع انسانی زندگی اور عالمِ فطرت کا ہر جلوہ ہے اس لیے اس میں کبھی کبھی مذہبی عقیدت کا اظہار یا نیکی کی تلقین یا علمی حقائق کی تعلیم بھی ہوتی ہے لیکن مخصوص شاعرانہ رنگ میں جس میں

خیالات کا وزن اتنا نہیں ہونے پاتا کہ طرزِ ادا کی سبک روی میں خلل پڑے۔

آرٹ سب سے موثر اس وقت ہوتا ہے جب اس کا موضوع انسان کی زندگی، اس کے جذبات، اس کے خیالات، اس کی آرزوئیں اور اس کے کام ہوتے ہیں بعض فنونِ لطیفہ مثلاً موسیقی، نقاشی، سنگتراشی وغیرہ میں ہمیں انسانی زندگی کے کسی ایک پہلو کی جھلک دکھائی دیتی ہے لیکن ادب کے بعض شعبوں مثلاً شعر، ناول ڈراما وغیرہ میں کبھی کبھی زندگی کا مجموعی مرقع نظر آتا ہے جو ہمارے لئے نہایت دلچسپ ہے اور جس کا اثر ہمارے دل پر بہت گہرا اور بہت دیرپا ہوتا ہے۔ یہ مرقع بظاہر ایک شخص یا چند اشخاص کی زندگی کا ہوتا ہے۔ لیکن اس میں کچھ ایسی قوت محرکہ پنہاں ہوتی ہے کہ انسان کا تصور ساری نوعِ انسانی کی زندگی پر پھیل کر اس میں یوں جذب ہو جاتا ہے جیسے سمندر میں کنکری پھینکنے سے لہروں کا ایک دائرہ بنے اور بڑھتے بڑھتے اس کی بے پایاں وسعت میں محو ہو جائے۔ یہ قطرے میں دریا اور جزو میں کل نظر آنا، آرٹ کے اکثر شعبوں میں پایا جاتا ہے۔ لیکن اس کا اظہار پوری طرح ڈرامہ میں ہوتا ہے۔

ڈرامہ بحیثیت آرٹ کے ایک شعبے کے:۔

ڈرامہ یونانی زبان کا لفظ ہے۔ اس کا مصدر (Draw) ہے جس کے معنی ہیں کر کے دکھانا۔ یہ ادب کی اس صنف کا نام ہے جس کے ذریعہ سے انسانی

زندگی کے واقعات محض بیان کیے جانے کی بجائے کر کے دکھائے جا سکیں۔ ڈرامہ میں شاعر کو جو قصہ بیان کرنا ہوتا ہے اسے چند اشخاص کی گفتگو کے پیرائے میں بیان کرتا ہے۔ اور اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ ان اشخاص کا بھیس بدل کر ان کی گفتگو اور ان کے کاموں کو دہرائیں تاکہ دیکھنے والوں کو سارا ماجرا آنکھوں کے سامنے گذرتا نظر آئے۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ بہت دل پذیر اور موثر ہے اور ادب کے کسی اور شعبے کو یہ بات نصیب نہیں ہو سکتی۔

پہلے ڈرامہ شاعری کا ایک جزو سمجھا جاتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ اس نے ایک مستقل ادبی صنف کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اب اس کے لئے نظم کی شرط نہیں رہی بلکہ نظم میں ڈرامہ لکھنے کا رواج بہت کم ہو گیا ہے۔

ڈرامہ اور ناول میں یہ بات مشترک ہے کہ دونوں انسانی زندگی کے مختلف جلوے دکھاتے ہیں۔ لیکن ناول کا اثر صرف تخیلی مشاہدے پر پڑتا ہے اور ڈرامہ کا حسی مشاہدے پر بھی۔ ناول میں مصنف دوسروں کی سرگذشت بیان کرتا ہے مگر ڈرامہ میں وہ خود اشخاص کو گفتگو کرنے دیتا ہے اور اسی گفتگو میں ان کے جذبات ان کے خیالات۔ ان کی سیرت، ان کا عمل غرض ان کی ساری زندگی دکھاتا ہے ناول لکھنے والا آزاد ہے کہ اپنی کہانی کو سو صفحے میں لکھے یا ہزار صفحے میں کیونکہ ناول پڑھنے والے کے لئے وقت کی کوئی پابندی نہیں مگر ڈرامہ لکھنے والے کو یہ اندازہ کرنا پڑتا ہے کہ قصہ ٹھیک اتنا بڑا ہو کہ تین ساڑھے تین گھنٹے میں دکھایا جا سکے۔ اس

سے زیادہ یا اس سے کم نہ ہو۔ ناول میں واقعات چاہے جتنے زمانے پر پھیلا دیئے جائیں اس کے اثر میں کوئی خلل نہیں پڑتا۔ کیونکہ وقت کے طول کو صرف تخیل کے سامنے پیش کرنا ہے۔ مگر ڈرامہ میں قصے کا زمانہ و تنوع کم سے کم رکھنا پڑتا ہے کیونکہ یہاں وقت کے طول کا مشاہدہ کرانا ہے۔ ناول میں ایک شخص کے پیدا ہونے سے لے کر اس کے مرنے تک کے حالات تفصیل سے بیان کیے جا سکتے ہیں، مگر ڈرامہ میں چند دنوں یا چند ساعتوں کے واقعات میں اس کی زندگی کی مکمل تصویر دکھانا پڑتی ہے۔ غرض بمقابلہ ناول کے ڈرامہ میں کہیں زیادہ پابندیاں اور دشواریاں ہیں۔ یہاں بہت محدود ذرائع سے کام لے کر بہت گہرا اثر پیدا کرنا ہے۔ اس لئے نہایت واضح مشاہدے، صحیح قوت انتخاب اور موثر طرز ادا کی ضرورت ہوتی ہے۔ فرض کیجیے کہ کوئی شخص اکبر اعظم پر ایک ڈرامہ لکھتا ہے۔ پہلی شرط یہ ہے کہ وہ اکبر کی سوانح حیات پر اتنا عبور رکھتا ہو اور اس کا تصور اتنا واضح ہو کہ قصہ لکھتے وقت اس بادشاہ کی ساری زندگی متحرک تصویروں کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے سے گذر جائے۔ اب اس کی قوت انتخاب کا کام ہے کہ ان میں سے چند تصویریں چھانٹ لے جو اتنی موثر اور اتنی معنی خیز ہوں کہ دیکھنے والا ان کے بیچ کے خلو کو آسانی سے پُر کر سکے اور اُسے پورا سلسلہ نظر آ جائے۔ ظاہر ہے کہ ان تصویروں کو دکھانے کے لیے اس کے پاس صرف دو ذریعے ہیں، گفتگو اور عمل، انھیں دونوں چیزوں کے ذریعہ سے اسے اکبر اور اس کے زمانہ کے لوگوں

کی سیرت۔ اُن کے جذبات وخیالات۔ اُن کے اغراض و مقاصد۔ اُن کے آپس کے تعلقات، اُن کی باہمی کشمکش، اُن کی کامیابی اور ناکامیابی کا نقشہ کھینچتا ہے اس لئے وہ ایسے الفاظ اور ایسے اعمال اختیار کرے گا جو چشم و گوش کو فوراً متوجہ کر لیں، اور اُن میں سما جائیں۔ دل میں بیٹھ جائیں۔ وہ اس کا بھی خیال رکھے گا کہ گفتگو اور عمل میں صحیح تناسب قائم رہے۔ جہاں تک اسٹیج کے ذرائع اور اثر آفرینی کے اصول اجازت دیتے ہیں۔ وہ واقعات کو عمل کے ذریعہ سے دکھائے گا لیکن جب ان کا دکھانا ناممکن اور نامناسب ہو تو ان کا ذکر گفتگو میں لے آنے پر اکتفا کرے گا غرض اس کی کوشش یہ ہوگی کہ اس کے ناٹک کا پڑھنے والا دو گھنٹے کے مطالعے میں اور اس کا تماشا دیکھنے والا تین چار گھنٹے کے مشاہدے میں اکبر اور اس کے عہد کی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر دیکھ لے۔ لیکن یہ واضح رہے کہ ڈرامہ کو آرٹ کے معیار پر پہنچانے کے لئے ابھی ایک شرط باقی ہے۔ جو سب سے زیادہ ضروری ہے۔ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ قطرے میں دریا، جز میں کل دکھانا یعنی انفرادیت میں عمومیت پیدا کرنا ڈرامہ کا اہم ترین مقصد ہے۔ اس لئے جس ناٹک کا ذکر اوپر کی مثال میں ہے وہ کامیاب اس وقت کہلائے گا جب اُس میں اکبر اور اس کے ساتھیوں کے حالات اس طرح دکھائے جائیں کہ دیکھنے والے پر زندگی کے گہرے راز جو اکبر میں اور نوع انسانی کے ہر فرد میں مشترک ہیں کھل جائیں۔

اب تک ہم نے ڈرامہ پر بحیثیت آرٹ کے ایک شعبے کے نظر ڈالی ہے اور یہی اس کی اصلیت ہے۔ جیسا ہم پہلے کہہ چکے ہیں اس کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے ذوقِ مشاہدہ کو انسانی زندگی کا دلکش جلوہ دکھا کر تسکین دے۔ اس سے فرضی طور پر کسی خاص اخلاقی، سیاسی، معاشی نظریئے کی تبلیغ یا عام اصلاح اور تعلیم کا کام بھی لیا جا سکتا ہے۔ اور ہمیشہ لیا گیا ہے۔ لیکن اس کا مناسب طریقہ یہ ہے کہ اس ضمنی مقصد کے لیے کھلی ہوئی کوشش نہ کی جائے۔ بلکہ وہ تماشے کے لطف کے ساتھ پردے میں حاصل ہو جائے۔ اگر اصلاحی یا تعلیمی رنگ غالب آگیا تو پھر ڈرامہ، ڈرامہ نہیں رہتا۔ بلکہ ایک اخلاقی قصہ بن جاتا ہے۔ اور خالص آرٹ کے دائرے سے باہر ہو جاتا ہے۔

(۳)

ڈرامہ کے بنیادی عناصر:-

ڈرامہ دو بنیادی عناصر سے مرکب ہے۔ جو مساوی اہمیت رکھتے ہیں:
(۱) قصہ (۲) اشخاص۔

ڈرامہ کے لئے یہ شرط ہے کہ اس کے واقعات بہت موثر اور جاذبِ نظر ہوں۔ ہر چیز کر کے دکھائی جا سکے۔ کوئی جزو ایسا نہ ہو کہ مصنف کو الفاظ میں سمجھانے یا بیان کرنے کی ضرورت ہو۔ قصے کے کچھ اجزا خصوصاً ایسے قصے جن کے دیکھنے سے کراہت ہو عمل کے ذریعے سے نہ دکھلائے جائیں بلکہ اشخاص کی گفتگو میں ان کا

دکھا دیئے تو کوئی خرج نہیں لیکن ایسے حصے ڈرامے میں جتنے کم ہوں اچھا ہے کیونکہ جب کوئی ناٹک تھیٹر میں دکھایا جاتا ہے تو دیکھنے والے سارے قصہ کو آنکھ سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس کا بیان کانوں سے سن کر انھیں اطمینان نہیں ہوتا۔

قصے کو زیادہ دلچسپ اور دل نشین بنانے کے لئے ضروری ہے کہ واقعات کا رخ بالکل سیدھا اور یک رنگ نہ ہو بلکہ ان کا رجحان کم سے کم دو مختلف سمتوں میں ہو، تاکہ دیکھنے والے کو آخری سین تک یہ اشتیاق رہے کہ انجام کیا ہوگا۔ اس اثر کو گہرا کرنے کے لئے ڈرامامیں دو زیادہ قوتوں کی باہمی نزاع اور کشمکش دکھائی جاتی ہے۔ خواہ یہ مجرد قوتیں مثلاً تقدیر و تدبیر، نیکی اور بدی وغیرہ ہوں یا اشخاص اور جماعتیں ہوں۔

سب سے اہم بات جو ہم پہلے کہہ چکے ہیں یہ ہے کہ قصے کے واقعات سے عمومیت ظاہر ہو یعنی دیکھنے والے پر یہ اثر پڑے کہ زندگی کے جو نشیب و فراز قصے کے اشخاص کو پیش آئے ہیں وہ دنیا میں سب کو پیش آیا کرتے ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہو تو ڈرامہ محض تھوڑی دیر کے لئے ہمیں متوجہ کر سکے گا۔ اور ہمارے دل پر اس کا کوئی گہرا نقش نہ بیٹھنے پائے گا۔

اشخاص کی اہمیت ڈرامہ میں ناول سے اور افسانہ کی دوسری اصناف سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ یہاں مرقع کی مرکزی تصویر انسان کی ذات ہے اور خارجی دنیا محض پس منظر کا کام دیتی ہے۔ عالم فطرت کے جلوے دکھائے جاتے

ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کے آئینے کے زنگار کا کام دیں، اور چونکہ ڈرامہ کو فوری اور قوی اثر پیدا کرنے کے لئے ہر نقش میں گہرا رنگ بھرنے کی ضرورت ہے اس لئے اشخاص کی سیرت میں بھی تازگی اور زندگی پیدا کرنے میں خاص اہتمام کرنا پڑتا ہے۔

ڈرامہ نگار کے لئے اشخاص کی اندرونی زندگی کی واضح اور جاذب نظر تصویر کھینچنا جتنا ضروری ہے اتنا ہی مشکل بھی ہے۔ اسے اس کی اجازت نہیں کہ ناول لکھنے والوں کی طرح کسی شخص کی نفسی کیفیات کی تحلیل اپنی طرف سے کر سکے اس کے اشخاص خود اپنی گفتگو اور اپنے عمل سے اپنی سیرت کا اظہار کرتے ہیں اس اظہار کے لئے مناسب موقع پیدا کرنا ایک دوسرے سے مشابہ اور متضاد اشخاص کو اس طرح جمع کرنا کہ ان کی گفتگو سے ہر ایک کے دل کی گہرائی پر روشنی پڑے، ان میں باہمی کشمکش پیدا کرنا تاکہ ان کی خصوصیات اچھی طرح ابھر آئیں۔ یہی ڈرامہ نگاری کا کمال ہے۔

مگر اس سے بھی زیادہ کمال یہ ہے کہ اشخاص میں انفرادیت کے ساتھ ساتھ جو ان کی ناگزیر صفت ہے ایک طرح کی عمومیت پیدا کی جائے۔ شخص یا کیرکٹر کی تعریف ہی یہ ہے کہ وہ اپنی سیرت میں جداگانہ اور مخصوص صفات رکھتا ہو جو اسے دوسروں سے ممتاز کریں۔ ڈرامہ نویس مجبور ہے کہ اکثر صورتوں میں اس شان کو قائم رکھے۔ لیکن اسی کے ساتھ اس سے یہ توقع کی جاتی ہے

کہ وہ اپنے قصے کے اہم اشخاص کو کسی طبقے، کسی جماعت یا پوری نوعِ انسانی کے نمائندوں کی حیثیت سے پیش کرے تاکہ اس کی مثال دوسروں پر بھی صادق آسکے۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لئے مختلف تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔ جن کا ذکر آگے آئے گا۔

اوپر کے صفحوں میں ڈرامہ کے بنیادی عناصر کا عام حیثیت سے ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن ڈرامہ کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں اور ہر قسم میں عناصر ایک خاص صورت اختیار کرتے ہیں۔ اس لئے ان پر کسی قدر تفصیلی بحث کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اقسام ڈرامہ کے ذکر کے سلسلہ میں ان پر جدا جدا نظر ڈالی جائے۔

(۴)

ڈرامہ کی قسمیں:-

ڈرامہ کے قصے کا پڑھنے والوں اور دیکھنے والوں کے احساس و جذبات پر جو عام اثر پڑتا ہے اس کے لحاظ سے اس کی دو قسمیں ہیں (۱) المیہ (۲) فرحیہ

ہم کہہ چکے ہیں کہ ڈرامہ میں جذبات پر بہت گہرا اثر ڈالنا ہوتا ہے تاکہ تھوڑی سی دیر میں دیکھنے والے کا احساس و مشاہدہ کافی لطف اندوز ہوسکے۔ جس طرح انسان کے سارے جذبات میں احساس کی دو بنیادی کیفیتوں، راحت و الم میں سے کوئی کیفیت ضرور موجود ہوتی ہے۔ اُسی

طرح ڈرامہ کے پڑھنے یا دیکھنے سے جو جذبات پیدا ہوتے ہیں ان میں بھی راحت یا الم کا رنگ ضرور ہوتا ہے۔ کبھی ڈرامہ زندگی کا المناک پہلو دکھاتا ہے اور دیکھنے والے کے دل پر لطف مشاہدہ کے ساتھ حسرت والم کی کیفیت طاری کر دیتا ہے۔ کبھی فرحناک پہلو کا منظر دکھاتا ہے اور انسان کو محظوظ ہی نہیں بلکہ مسرور بھی کرتا ہے۔ یوں تو ہر ڈرامہ میں یہ دونوں رنگ موجود ہوتے ہیں لیکن کسی میں ایک غالب ہوتا ہے اور کسی میں دوسرا جس ڈرامے میں الم کا رنگ زیادہ گہرا ہو وہ المیہ کہلاتا ہے۔ جس میں راحت کا ہو اُسے فرحیہ کہتے ہیں۔ بعض وقت المناک اور فرحناک عناصر کا پلہ برابر ہوتا ہے۔ ایسے ڈرامہ کو ہم المفرحیہ کہہ سکتے ہیں اور اسے ایک تیسری قسم قرار دے سکتے ہیں۔ لیکن زیادہ رواج ڈرامہ کی دو ہی قسموں نے پایا ہے اس لئے ہم صرف انھیں کا ذکر کریں گے۔

المیہ ۔ جو شخص مشاہدۂ نفس سے کام لیتا ہے وہ جانتا ہے کہ الم کا جذبہ راحت سے زیادہ قوی، گہرا اور دیرپا ہوتا ہے۔ راحت و مسرت سے انسان کے جسم و روح پر ایک مستی سی چھا جاتی ہے، ایک نشہ سا مسلط ہو جاتا ہے۔ اس لئے اس کا احساس کسی قدر کند ہو جاتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انتہائی خوشی کے عالم میں انسان کو اپنی کچھ خبر نہیں رہتی۔ اور جب یہ کیفیت گذر جاتی ہے تو اسے ہوش آتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتنا خوش تھا۔ بہ خلاف اس کے

الم، حس اور ادراک کو اس قدر تیز کر دیتا ہے کہ انسان کو اس کی ہر خلش، ہر کسک صاف محسوس ہوتی ہے۔ جب تک ہم کسی جسمانی یا روحانی کرب میں مبتلا رہتے ہیں اس کا احساس ہمارے دل پر چھایا رہتا ہے، کسی دوسرے احساس کو ابھرنے نہیں دیتا۔ اس لئے ڈرامے کی دو خاص قسموں میں سے المیہ اثر کے لحاظ سے فرحیہ سے بہت بڑھا ہوا ہے۔ چنانچہ پہلے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ ڈرامہ کا اصل آرٹ المیئے میں ظاہر ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ خیال مبالغے پر مبنی تھا۔ اور جدید زمانے میں غالباً شکسپیر کے فرحیوں کے دیکھنے کے بعد اہل نظر اسے بدلنے پر مجبور ہوئے لیکن اس میں اب بھی کسی کو کلام نہیں ہو سکتا کہ دنیا کی ہر زبان میں بہترین ناٹک تقریباً سب کے سب المیئے ہیں۔

المیئے کے پڑھنے یا دیکھنے سے جو کیفیت لوگوں کے قلب میں پیدا ہوتی ہے اس میں سب سے نمایاں حسرت و الم کے جذبات ہیں لیکن ان کے ساتھ خوف و عبرت، ہمدردی اور تعریف بھی ملی جلی ہوتی ہے۔ جو ڈرامہ محض رنج و مصیبت کی تصویر ہے جس کے دیکھنے سے سوائے غم و اندوہ، افسوس اور رقت کے کوئی اثر دل پر نہ ہو وہ المیہ نہیں بلکہ میلو ڈرامہ (رقت انگیز ڈرامہ) کہلاتا ہے کسی شرابی کا شرابخوری کی بدولت تباہ ہو جانا، کسی جواری کا قمار بازی کے پیچھے گھر بار لٹا دینا۔ ایسے واقعات ہیں جنہیں دیکھ کر رنج ہوتا ہے، تکلیف پہنچتی ہے لیکن سوائے ان لوگوں کے جن کی طبیعت میں غیر معمولی درد ہو کسی کو ان

بدنصیبوں سے ہمدردی نہیں ہوتی۔ اس لئے یہ واقعات میلوڈرامہ کے ہو سکتے ہیں مگر المیئے کے نہیں۔ کسی بیمار کے جسمانی یا دماغی آلام، کسی مفلس کی فاقہ کشی کی مصیبت دیکھنے والوں کے دل میں افسوس کے ساتھ ہمدردی کے جذبات بھی پیدا کرتی ہے لیکن بجائے خود تعریف کی مستحق نہیں۔ اس لیئے جو قصہ محض ان چیزوں کے ذکر پر مبنی ہو اس میں المیئے کا رنگ پیدا نہ ہوگا۔ المیئے کی شان یہ ہے کہ اس کا ہیرو بلند ہمت اور بلند سیرت ہو اس پر کوئی ایسی مصیبت پڑے جو دل میں رعب اور دہشت پیدا کرتی ہو۔ جس میں خود ہیرو کا قصور نہ ہو یا ہو بھی تو نیک نیتی سے۔ وہ ہمت اور شجاعت سے اس مصیبت کا مقابلہ کرے۔ مگر آخر میں مغلوب ہو کر ہلاک یا تباہ ہو جائے۔ مثال کے لئے شکسپیر کا المیہ آتھیلو لیجیے۔ آتھیلو ایک عربی نسل کا سپاہی ہے جو وینس کی جمہوری ریاست میں سپہ سالاری کی خدمت پر مامور ہے۔ وینس کے ایک امیر کی لڑکی ڈیسڈیمونا اس پر عاشق ہو جاتی ہے۔ اور آتھیلو بھی اس کی محبت میں وارفتہ ہو جاتا ہے۔ باوجود ڈیسڈیمونا کے باپ کی مخالفت کے وینس کے فرمانروا ڈیوک کے حکم سے دونوں کی شادی ہو جاتی ہے۔ آتھیلو کا ایک بدنفس ماتحت ایاگو کچھ کینہ پروری سے اور کچھ مقتضائے طبیعت سے اس کے دل میں یہ شبہ پیدا کر دیتا ہے کہ ڈیسڈیمونا ایک اور فوجی افسر کیسیو سے ناجائز محبت رکھتی ہے۔ ایاگو کی شیطانی چالوں سے آتھیلو کا یہ شبہ یقین کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے وہ ڈیسڈیمونا کو قتل کر دیتا ہے اور اس

کے بعد خود بھی جان دے دیتا ہے۔

اس ڈرامے کو پڑھئے تو آپ دیکھیں گے کہ آتھیلو کی بہادری، بلند حوصلگی، عالی ظرفی، سادگی اور ڈیسڈیمونا کا حسن، اس کا بھولا پن، اس کی محبت، عصمت وعفت، وفاداری، ہمارے دل کو ابتدا سے موہ لیتی ہیں۔ اور ہم ہیرو اور ہیروئن سے سچی محبت اور ان کا سچا احترام کرنے لگتے ہیں۔ پھر رقابت کا جذبہ جو آتھیلو کے سینے میں جہنم کی آگ کی طرح بھڑکتا ہے اور اس کے جسم و روح کو جلائے ڈالتا ہے ہماری طبیعت میں ایسی گہری دہشت پیدا کرتا ہے جو شاید سخت سے سخت جسمانی اذیت کا منظر دیکھ کر بھی نہ پیدا ہوتی۔ آتھیلو جس جوانمردی اور عالی ظرفی سے اس جذبے کو دبانے کی کوشش کرتا ہے اُسے دیکھ کر ہم بے اختیار اس کی تعریف کرتے ہیں۔ مگر آخر میں جب ہم پر یہ دردناک حقیقت کھلتی ہے کہ اس دنیا میں اتھیلو کا سا ہیرو غصے اور غلط فہمی کا شکار ہوتا ہے، ڈیسڈیمونا کی سی ہیروئن اپنے چہیتے اور چاہنے والے شوہر کے ہاتھوں بے گناہ قتل ہوتی ہے تو ہم رنج والم، افسوس اور ہمدردی کے جوش سے بے تاب ہو جاتے ہیں اور اسی کے ساتھ ساتھ ہم پر ایک پُراسرار رعب چھا جاتا ہے۔ ایک گہری عبرت طاری ہو جاتی ہے اور یہی المیئے کی جان ہے۔

المیہ لکھنے میں یہ اثر مختلف طریقوں سے پیدا کیا جاتا ہے۔ کبھی اس کا ہیرو باوجود اپنی اعلیٰ سیرت کے اپنی خلقی کمزوری یا غلط فہمی کے سبب سے خود

اپنی تباہی کا باعث ہوتا ہے۔ کبھی وہ مافوق الافراد یا مافوق الفطرت قوتوں کے ہاتھ میں کھلونا بن کر ہلاک ہوتا ہے اور کبھی اس کے پیش نظر دو متضاد مقاصد یا نصب العین ہوتے ہیں جن میں سے وہ ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دے سکتا اور اسی کشمکش میں مارا جاتا ہے۔

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ ڈرامہ کا ایک بڑا اہم عنصر عمومیت ہے یعنی قصے کو اس طرح بیان کرنا کہ ایک خاص شخص کی زندگی پر عام انسانی زندگی کا قیاس کیا جا سکے۔ اس مقصد کے حاصل کرنے کے لیے ڈرامہ لکھنے والے بہت سے ذرائع اختیار کرتے ہیں۔ ایک ذریعہ یہ ہے کہ قصے کا ہیرو بادشاہ یا کوئی اور بلند مرتبہ شخص بنایا جائے جس کا انجام ایک پورے ملک یا پوری قوم کی زندگی پر اثر ڈالے اور سارے انسانوں کے لیے سرمایۂ عبرت ہو۔ یا پھر اس کی ذات ایک علامت (symbol) ہو جس سے پوری نوعِ انسانی یا ایک پوری قوم مراد لی جا سکے۔ مثلاً ٹیگور کے ڈرامے پوسٹ آفس کا ہیرو امال مشرقی انسان کی روح کی علامت مجسم ہے۔ اور اس کی تمنائے آزادی نوعِ انسان کی اس ابدی آرزو کی علامت ہے کہ وہ عالمِ مجاز سے نجات پا کر عالمِ حقیقت پر پہنچے۔

دوسرا ذریعہ یہ ہے کہ قصے کے ہیرو پر جو مصیبت آئے اس کا ذمہ دار مافوق الفطرت قوتوں مثلاً تقدیر کو یا دیوتاؤں کو یا شیطانی روحوں کو قرار دیا جائے۔ اس سے قصے کے پڑھنے والوں کو یہ احساس ہوتا ہے کہ ان قوتوں نے

جن کا اثر سب انسانوں پر عام ہے جو ایک شخص کے ساتھ کیا وہی سب کے ساتھ کر سکتی ہیں۔ جدید زمانے میں لوگ ان چیزوں کے قائل نہیں اس لئے ڈرامہ نویس عموماً ان کی جگہ وراثت سے کام لیتے ہیں یعنی کسی شخص کی مصیبتوں کا ذمہ دار اس کے اسلاف کے موروثی اثر کو قرار دیتے ہیں۔ جیسے ابسن کے ڈرامہ کا "خبیث روحیں" کے ہیرو کا جو افسوسناک انجام ہوا جو اس نے اپنے باپ کے ترکے میں پایا تھا۔

تیسرا ذریعہ یہ ہے کہ ڈرامے کے اصل قصّے میں ڈرامہ نویس ایک ضمنی قصّہ بھی داخل کر دیتا ہے۔ اس میں وہی افسوسناک واقعات جو اصل قصے میں پیش آئے تھے کسی قدر اختلاف کے ساتھ دہرائے جاتے ہیں۔ مثلاً شکسپیر کے کنگ لیر میں جو ناشکرگذاری کا برتاؤ لیر کی بیٹیاں لیر کے ساتھ کرتی ہیں وہی گلوسٹر کے بیٹے گلوسٹر کے ساتھ کرتے ہیں۔ اس تکرار کا اثر دیکھنے والوں پر یہ پڑتا ہے کہ نیکی کا بیج بونا اور بدی کا پھل پانا کچھ لیر ہی کے لئے نہ تھا بلکہ دنیا میں سبھی کو یہ دن دیکھنا پڑتا ہے۔

المیئے کے قصے کی یہ عمومیت عبرت کے اثر کو بڑھاتی ہے۔ مگر رنج والم کے اثر کو گھٹا دیتی ہے۔ مصیبت کا کوئی منظر دیکھتے وقت اگر یہ احساس پیدا ہو جائے کہ یہ حالت زندگی میں ہر شخص پر گذرتی ہے تو نیش الم کی کھٹک بہت کچھ کم ہو جاتی ہے۔ اور آرٹ کے نقطۂ نظر سے المیئے میں اس کی بہت ضرورت ہے

آرٹ جو کیفیت دلوں میں پیدا کرنا چاہتا ہے اس میں اس کی گنجائش نہیں کہ کوئی جذبہ خواہ وہ رنج والم ہو یا راحت ومسرت احد سے بڑھ جائے کیونکہ پھر احساس میں جمالیاتی رنگ نہیں رہتا جس کے لئے تناسب اور موزونیت لازمی ہے۔ اگر فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے، نالہ پابند نے نہیں ہے تو وہ فریاد اور نالہ چاہے آرٹ سے بڑھ کر ہو مگر آرٹ نہیں کیونکہ وہ سننے والے کے دل کے تاروں کو چھیڑتا تو ہے مگر اس طرح کہ ان سے ہم آہنگ نغموں کی جگہ بے سُری صدائیں نکلتی ہیں

اسی وجہ سے باکمال المیہ نویس مصیبت اور تکلیف کے مناظر بہت بڑھا کر یا بہت دیر تک نہیں دکھاتے اور جو کچھ دکھاتے بھی ہیں اس کے المناک اثر کو کم کرنے کے لئے یا تو عمومیت سے کام لیتے ہیں جس کا ابھی ذکر ہوا یا بیرونی عظمت اور شجاعت پر زور دے کر ایک تسکین کا پہلو نکالتے ہیں یا طرزِ بیان میں تشبیہ واستعارے کی لطافت وندرت اور دوسری شاعرانہ خوبیاں پیدا کرنے میں غیر معمولی اہتمام کرتے ہیں تاکہ خیال کسی قدر بٹ جائے۔

اس سے ایک نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ المیہ لکھنے کے لئے بہ مقابلہ نثر کے نظم زیادہ مناسب ہے اور یہ بڑی حد تک صحیح ہے۔ عہد قدیم میں المیہ ہمیشہ نظم میں لکھا جاتا تھا۔ جب سے نثر میں لکھنے کا رواج شروع ہوا اسی وقت سے ادب میں المیئے کا معیار بھی کم ہونے لگا۔ چنانچہ نثر میں اعلیٰ درجہ کے فرجیئے بہت کثرت سے ہیں مگر المیئے معدودے چند ہی ہیں۔ ان میں سے غالباً سب سے بلند درجہ

گوئٹے سے فاؤسٹ کا ہے۔ گوئٹے نے اپنے زمانہ کے مذاق سے متاثر ہو کر فاؤسٹ کو نثر میں لکھا لیکن اس میں گیتوں اور سنگیتوں کے نام سے نظم کا حصہ بہت کافی ہے اور خصوصاً زیادہ المناک ٹکڑے سب کے سب نظم میں ہیں۔ اور جتنے اچھے المیے نثر میں ہیں ان کا مقصد زیادہ تر اخلاقی اور اصلاحی ہے۔ جمالیاتی عنصر ان میں بہت کم ہے۔

فرحیہ۔ جس ڈرامے میں واقعات کی عام رفتار اور قصہ کا انجام خوشگوار ہو یعنی جس سے دیکھنے والوں کے دل پر فرحت و مسرت کا اثر ہو اسے فرحیہ کہتے ہیں مگر جس طرح وہ کھیل جو محض رنج و الم کے جذبات ابھارتا ہے وہ المیے کی شان نہیں رکھتا۔ بلکہ ایک کمتر درجہ کی چیز ہے۔ میلو ڈرامہ (رقت آمیز ڈرامہ) کہلاتا ہے۔ اسی طرح وہ کھیل جو محض تفریح اور دل لگی کا باعث ہوتا ہے فرحیے کے معیار سے پست ہوتا ہے۔ اور فارس (نقل) کے نام سے موسوم ہے۔ فرحیے سے راحت و مسرت کے علاوہ دیکھنے والوں کی طبیعت کو اطمینان اور آزادی کی ایک مستقل کیفیت محسوس ہوتی ہے اور زندگی کا بوجھ اس کے دل پر سے ہٹ جاتا ہے۔

عموماً اس کیفیت کا اظہار ہنسی سے ہوتا ہے۔ اس لئے اگر ہم اس پر غور کریں کہ ہنسی عموماً کن چیزوں پر آتی ہے تو ہم فیصلہ کر سکتے ہیں کہ فرحیے کے کیا عناصر ہونا چاہییں۔ نفسیات کے ماہروں کا عام طور پر یہ خیال ہے کہ ہنسی

کی محرک تین چیزیں ہوتی ہیں۔ کسی شخص کی خفت یا ذات، اس کا بھونڈا پن یا بے ڈھنگا پن، اس کا شخصیت سے محروم اور مشین نما ہونا۔ مثلاً جب کسی کا خصوصاً جب کسی خواہ مخواہ مرد آدمی کا پیر پھسلے اور وہ گرے تو ہمیں ہنسی اس لئے آتی ہے کہ یہ افتاد اس شخص کی خفت کا باعث ہے۔ دوسرے اس لئے کہ گرتے وقت اور گرنے کے بعد اس کی قطع بے تکی ہو جاتی ہے۔ چہرے کی عجیب برزخ ہو جاتی ہے۔ منہ پھیل کر رہ جاتا ہے۔ ٹانگیں اوپر اٹھ جاتی ہیں۔ تیسرے اس لئے کہ اس کی بے بسی دیکھ کر ایک لمحہ کے لئے گویا ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ حضرت اشرف المخلوقات ہیں۔ جن سے ہمیں ہمدردی کرنا چاہیئے۔ بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ گوشت اور چربی کا ایک تودہ ہے جسے تکلیف کا کوئی احساس نہیں۔

فرانسیسی فلسفی برگسان نے ہنسی کے محرکات کی تحلیل جو کی ہے وہ زیادہ مکمل ہے۔ وہ کہتا ہے۔ ہنسی کے لئے تین شرطیں ہیں (۱) اس کا موضوع شکل صورت، وضع قطع یا طرزِ معاشرت میں سوسائٹی کے عام رنگ سے مختلف ہو۔ (۲) جس حالت میں وہ پایا جائے اس میں اس کی شخصیت چھپ جائے اور وہ مشین یا کٹھ پتلی کی طرح معلوم ہو۔ (۳) دیکھنے والے کو اس وقت اس کے انسانی جذبات کا احساس نہ ہو۔ مثلاً اوپر کی مثال میں موٹا ہونا سوسائٹی کی عام روش سے ہٹی ہوئی چیز ہے، پھر پھسل کر گرنے میں ہر شخص کٹھ پتلی کی طرح مجبور ہوتا ہے۔ اور پھر موٹے آدمی کی بے بسی کا تو کیا پوچھنا ہے۔ رہی تیسری شرط

تو ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں بیچارے الفزبہ کے جذبات کا کیسے احساس ہوتا ہے۔

لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ایک چیز ہنسی کی محرک ہوتی ہے جس کا برگسان نے ذکر نہیں کیا۔ اور وہ تہذیب اور ثقاہت کے تکلفات سے آزادی کا احساس ہے۔ مثلاً ایک مجمع میں جہاں سب مقطع اور ثقہ لوگ بیٹھے ہیں اور انسان وہاں بات کرنے بلکہ سانس لینے میں بھی تکلیف محسوس کرتا ہو کوئی شخص کوئی موٹی سی گالی بک دے یا پھکڑ مذاق کر بیٹھے تو حالانکہ خوش مذاق لوگوں کے لئے گالی یا بیہودہ مذاق بجائے خود کوئی ہنسی کی چیز نہیں مگر ایسے موقع پر انھیں بے اختیار ہنسی آجائے گی۔

ہنسی کی اس نفسیاتی تحلیل کو نظر میں رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ فرجیئے میں وہ کیفیت جس پر ہنسی آتی ہے پانچ طرح سے پیدا ہو سکتی ہے۔

(۱) ایک تو کسی شخص کی بے تکی جسمانی صفات سے مثلاً ناک کا بڑا ہونا۔

(۲) اس کی انوکھی ذہنی اور روحانی صفات سے، مثلاً سچ مچ کا مراق یا خبط یا کسی معمولی صفت میں اس قدر مبالغہ جو مراق کی حد تک پہنچ جائے۔

(۳) اس کی نرالی عادتوں اور حرکتوں سے مثلاً کندھے اچکانا، منہ چڑھانا۔

(۴) کسی مضحک حالت کے دکھانے سے۔

(۵) مضحک الفاظ اور فقرے استعمال کرنے سے۔

فرحیہ نگار ان سب ترکیبوں سے کام لیتا ہے لیکن ان کے استعمال میں تناسب کو مدنظر رکھتا ہے۔ جس ناٹک میں محض بے تکی جسمانی صفات یا نرالی عادتیں اور حرکتیں دکھائی جائیں وہ فرحیہ نہیں رہتا بلکہ نقل (فارس) بن جاتا ہے۔ فرحیے میں یہ چیزیں اس حد تک کھپتی ہیں جہاں تک یہ ذہنی اور روحانی بے آہنگی کی علامت ہوں۔ البتہ انوکھی ذہنی صفات کو نمایاں کرنا مضحک حالتوں کا پیدا کرنا مضحک الفاظ اور فقرے استعمال کرنا فرحیے کا اصل جوہر ہے۔

یہاں تک ہم نے فرحیے کے عناصر مضمون کے لحاظ سے بیان کئے، اب دیکھنا یہ ہے کہ ہنسنے ہنسانے کے لیے طرزِ ادا کیا اختیار کیا جاتا ہے۔

انسان اپنی خوش طبعی کا اظہار ان تین طرزوں میں سے کسی طرز سے کرتا ہے، مذاق یا دل لگی، ظرافت، طنز۔

مذاق یا دل لگی اسے کہتے ہیں کہ آدمی اپنی فطری شگفتہ طبعی سے ہر بات میں ہنسی کا پہلو ڈھونڈے۔ خود ہنسے اور جس پر ہنسے اسے بھی ہنسلئے، اس کی بنیاد ہمدردی، یار باشی، کشادہ دلی پر ہوتی ہے۔ مذاق کرنے والے کا مقصد کسی کو خفیف کرنا نہیں بلکہ سب کو خوش کرنا ہوتا ہے۔ وہ جس طرح دوسروں پر چوٹ کرتا ہے اسی طرح اپنے آپ پر بھی فقرے کستا ہے، اس کی طبیعت میں یا اس کی باتوں میں کوئی خاص نفاست یا باریکی نہیں ہوتی لیکن وہ تناسب کا کسی قدر احساس رکھتا ہے اس کی نظر بے ڈول یا بے تکی چیز پر فوراً پڑتی ہے۔ وہ بے ساختہ ہنس پڑتا ہے۔ اور

اس کے ہنسنے پر دوسروں کو ہنسی آجاتی ہے۔ مذاق کرنے والا اگر متانت اور خودداری سے بالکل خالی ہو۔ اس کی باتوں میں بازاری پن کی جھلک اور خوشامد یا مطلب برآری کا پہلو ہو تو وہ مسخرا اور اس کا مذاق مسخراپن کہلاتا ہے۔

وہ مذاق جو پستی کی طرف جھکنے کی بجائے بلندی کی طرف ابھرتا ہے جس میں نفاست، ندرت، ستھراپن پایا جاتا ہے اسے ظرافت کہتے ہیں۔

ظرافت کی بنیاد شوقِ طبعی، نکتہ سنجی اور ذہنی رعونت پر ہوتی ہے، ظریف آدمی کا احساسِ تناسب اتنا نازک ہوتا ہے کہ وہ ذرا سا بے تکا پن بھی برداشت نہیں کرسکتا۔ جب وہ بے ڈول چیزوں اور بے تکے لوگوں کو دیکھتا ہے تو اس کے دل میں ہمدردی کی جگہ ایک طرح کی حقارت پیدا ہوتی ہے۔ وہ دل لگی باز کی طرح کھلے دل سے اور کھلے الفاظ میں مذاق نہیں کرتا۔ بلکہ برتری کے احساس کے ساتھ اپنے آپ کو لئے دیئے ہوئے لطیف اشاروں اور کنایوں میں چوٹیں کرتا ہے۔ اور اسے اس کی پروا نہیں ہوتی کہ اس سے دوسروں کے جذبات کو ٹھیس لگے گی۔ اس کا مقصد کم ہنسنا اور زیادہ تر بے وقوفوں اور سادہ لوحوں کو بنانا اور خفیف کرنا ہوتا ہے۔

اگر ظرافت حد سے زیادہ تلخ اور ترش ہو جائے تو وہ طنز کے درجے پر پہنچ جاتی ہے۔ طنز کرنے والا عموماً اکل کھرا اور مردم بیزار ہوتا ہے۔ اس کی نظر حماقت اور بے تکے پن کے علاوہ اخلاقی کمزوریوں پر بھی ہوتی ہے۔ ان چیزوں کو دیکھ کر اسے تکلیف ہوتی

ہے اور وہ ان کی پردہ دری کر کے دوسروں کو بھی تکلیف پہنچانا چاہتا ہے۔ اس کی ہنسی زہرخند کی شان رکھتی ہے اور اس کی ہنسی ظرافت اور غصے میں ڈوبی ہوتی ہے۔

ان میں سے فرحیئے کا مخصوص طرز اداامذاق اور دل لگی ہے۔ ظرافت کا استعمال محدود ہے۔ اس کی باریکی اور شوخی سے کام لیا جاتا ہے۔ لیکن رعونت کا انداز اختیار نہیں کیا جاتا۔ اکثر اعلیٰ درجے کے فرحیہ نگار مثلاً شکسپیئر جن لوگوں کا مضحکہ اڑاتے ہیں ان کی تحقیر نہیں کرتے بلکہ ان سے ایک حد تک محبت رکھتے ہیں۔ شکسپیر کی ہنسی میں تلخی نہیں ہوتی، اس کی پھبتیوں میں نشتر نہیں ہوتا۔ اس کے سب سے مشہور مضحک کیرکٹر فالسٹاف کی حماقت، لالچ، شیخی پر ہم جی کھول کر ہنستے ہیں، لیکن جب وہ اپنے کیے کی سزا پاتا ہے تو ہمیں اس پر رحم آجاتا ہے، مولیر جو غالباً فرحیہ نگاری کا سب سے بڑا استاد ہے، شکسپیر سے زیادہ سخت گیر ہے۔ لیکن اس کا دل بھی رعونت تحقیر کے جذبات سے خالی ہے، وہ جن لوگوں کا خاکہ اڑاتا ہے انھیں اپنے سے کم درجہ کا مخلوق نہیں بلکہ اپنی طرح انسان سمجھتا ہے۔

بقیہ دو طرز یعنی مسخرا پن اور طنز، فرحیئے کے لیے مناسب نہیں، مسخرے پن پر ہنسی ضرور آتی ہے لیکن خوشی کی جو کیفیت اس سے پیدا ہوتی ہے وہ سطحی اور عارضی ہوتی ہے اس سے تھوڑی دیر دل بہلتا ہے لیکن زندگی کی دشواریوں میں کوئی مستقل سہولت حاصل نہیں ہوتی۔ اس طرز کا محل استعمال نقل (فارس) ہے۔ جو عوام میں بہت مقبول ہے لیکن خوش مذاق لوگوں کی نظر میں زیادہ وقعت

نہیں رکھتی۔

طنز کی گنجائش فرحیے میں اور کم ہے۔ فرحیے کی سبک روی اس کی تلخی اور ترشی کا بار نہیں اٹھا سکتی۔ طنز کی جان غم و غصہ اور نفرت کے جذبات ہیں جو مذاق کے ہلکے سے پردے میں چھپے ہوتے ہیں، تنقید اور تضحیک کے لئے یہ بہت اچھا آلہ ہے۔ لیکن فرحیے ہیں جس کا اصل مقصد تفریح اور خوش وقتی ہے۔ اس کی آشفتہ نوائی سارے عیش کو تلخ کر دیتی ہے۔

ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ ہنسی زیادہ تر ان لوگوں پر آتی ہے جن میں شخصیت نہ ہو بلکہ کٹھ پتلی کی طرح کسی بیرونی قوت کے اشارے پر حرکت کرتے ہوں اس لئے فرحیے میں جس کا دار و مدار ہی اس پر ہے کہ ہر شخص کو مضحک حالت میں دکھایا جائے عموماً کوئی نمایاں شخصیت رکھنے والا کیرکٹر یعنی ہیرو نہیں ہوتا۔ اگر کسی کیرکٹر کو خاص طرح سے مضحک بنایا جائے تو اس کی شخصی حیثیت پر زور نہیں دیا جاتا۔ بلکہ اس سے کسی جماعت یا طبقے کی مثال (Type) کا کام لیا جاتا ہے۔ مثلاً مولیر کے ڈراموں میں جہاں کہیں ایک طبیب یا ایک کنجوس آدمی۔ اکثر فرحیوں میں اصل قصے کے ساتھ ایک یا زیادہ ضمنی قصے بھی ہوتے ہیں جن کے اشخاص کی اہمیت قریب قریب مساوی ہوتی ہے اس طرح فرحیے میں عمومیت کا رنگ جس کے لئے المیے میں خاص اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ عمومیت پیدا کرنے کی اور ترکیبیں مثلاً مافوق الفطرت قوموں کا ذکر فرحیے میں کام نہیں دیتا

کیونکہ ان سے خوف اور دہشت کا اثر پڑتا ہے ۔ اور یہ فرجیڈی کی منشاء کے خلاف ہے۔

(۶)

ڈرامے کی نشو و نما عہد قدیم سے عہدِ جدید تک :-

انسانی زندگی کی تمثیلیں ناٹک کے ذریعہ دکھانے کی رسم اکثر قوموں میں قدیم زمانہ سے پائی جاتی ہے لیکن اسے ادبی اور شاعرانہ حیثیت پہلے پہل چینیوں، یونانیوں اور ہندوؤں نے دی۔ ان تینوں قوموں نے ایک دوسرے سے متاثر ہوئے بغیر الگ الگ اس صنعتِ شاعری کو ایجاد کیا۔ یونانیوں میں اس رسم کی بنیاد اس طرح پڑی کہ ان کے یہاں ابتدا سے ڈایونی سیس دیوتا[1] کے پوجا کے سلسلے میں مذہبی روایات ناٹک کی شکل میں دکھائی جاتی تھیں۔ جب یونانی تمدن نے ترقی کی تو شعراء اس رسم کے لئے خاص ڈرامے تیار کرنے لگے عام دستور یہ تھا کہ اس موقع پر ایک فرجیہ اور تین المیئے دکھائے جاتے تھے جو ڈرامہ نگار چوٹی کے سمجھے جاتے تھے ان کے ڈرامے اس کام کے لئے منتخب ہوتے تھے۔ یونانی زبان کے اکثر بہترین ڈرامے اسی تقریب سے لکھے گئے۔

---

[1] اس دیوتا کے متعلق ابتداء میں یہ عقیدہ تھا کہ وہ سارے نباتات کے اُگنے اور بڑھنے کا کفیل ہے لیکن آگے چل کر اس کا کام محض یہ سمجھا جانے لگا کہ انگور میں شراب پیدا کرے۔ اسی کو (Bacchus) کہتے ہیں۔

یونانیوں میں ڈرامہ کے اصول وضوابط سب سے پہلے ارسطو نے اپنی شعریات (Poetics) میں مرتب کیے، ارسطو کی خصوصیت یہ ہے کہ یونانیوں کے ذہن نے اپنی فطری تخلیقی رو میں علم وادب اور فنون لطیفہ کے جو نمونے پیدا کئے تھے اس نے ان کا غور وفکر سے مطالعہ کیا۔ اور ان کے اہم عناصر دریافت کر کے علمی قوانین بنادیئے تاکہ آئندہ نسلیں اپنے بزرگوں کے تجربوں سے فائدہ اٹھائیں اور بنے بنائے راستوں پر چل کر کم وقت میں زیادہ ترقی کر سکیں اس کے عہد میں باکمال شعراء صرف المیئے لکھتے تھے۔ اچھے فرحیئے یا تو اس سے پہلے لکھے گئے یا اس کے بعد۔ کچھ اس وجہ سے اور کچھ اپنی فطری سنجیدگی اور خشک مزاجی کی بدولت اس نے اعلیٰ ڈرامہ صرف المیئے کو قرار دیا۔ اور فرحیہ کو ادنیٰ درجہ کی چیز سمجھ کر اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی۔ اس کے عہد میں اسٹیج بالکل ابتدائی حالت میں تھی۔ فنی (Technical) ذرائع بہت محدود تھے۔ پردوں کے بدلنے میں بڑی دقت ہوتی تھی۔ اس لیے اس نے یہ اصول قرار دیا کہ ڈرامے میں صرف ایک قصہ ہو، ہر قصے کا محل وقوع ابتدا سے آخر تک ایک ہو اور زمانۂ وقوع جہاں تک ممکن ہو مختصر دکھایا جائے۔ یہ سہ گونہ وحدت کا قانون کہلاتا ہے ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ارسطو کا نظریہ یونانی حالات کا پابند تھا اور اس نے جو اصول بنائے تھے وہ ہمیشہ کے لیے نہ تھے۔

مگر جب یونانیوں کے تمدن کا زوال ہوا اور ان کی وراثت اہل روما کو

ملی تو انہوں نے اپنی فطری تقلید پرستی کی بدولت فنون لطیفہ میں یونانیوں کے بنائے ہوئے اصولوں کو دوامی قانون سمجھا۔ جس کی مخالفت ان کے نزدیک کسی طرح جائز نہ تھی، ہوریس نے ارسطو کے ضوابط کی تشریح کی اور ان کی پابندی کو ہر ڈرامہ نگار کے لئے لازمی قرار دے دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رومیوں کے ڈرامے کی آزاد نشوونما رک گئی اور وہ زیادہ ترقی نہ کر سکا۔ قرونِ وسطیٰ میں کلیسا کی مذہبی سختیوں کے سبب سے ڈرامہ کو اور تنزل ہوا۔ اس زمانہ میں زندگی پر مذہب اور کلیسا کا رنگ چھایا ہوا تھا اس لئے ڈرامہ بھی اسی رنگ میں رنگ گیا۔ لوگ اپنے ذوقِ تمثیل کو مذہبی سوانگ سے پورا کرتے تھے جس میں مسیحؑ کی ولادت اور شہادت، اولیاء کی زندگی کے سیدھے سادے قصے ہوتے تھے۔ مگر اصولِ فن میں بدستور یونانیوں کی تقلید ہوتی تھی۔ عہدِ جدید میں سب سے پہلے شکسپیر نے جو قدیم علوم سے بالکل ناآشنا تھا اپنی فطری تخلیق کی بدولت ڈرامہ کو فرسودہ قوانین کی پابندی سے آزاد کر کے آسمان تک پہنچا دیا۔ مگر سولھویں صدی کے نقاد اب تک پرانے ضوابط کے قائل تھے اور شکسپیر کے ڈراموں کو بے اصول سمجھ کر رد کر دیتے تھے۔ جو لوگ اس بادشاہِ سخن کے قائل تھے انھوں نے بھی اصولِ فن میں کسی طرح کی تبدیلی گوارا نہیں کی وہاں اتنا کیا کہ شکسپیر کو مستثنیٰ قرار دے دیا۔ ڈرامے کی تنقید میں یہ قدامت پرستی اٹھارھویں صدی تک جاری رہی۔ البتہ سترھویں صدی میں ڈرائیڈن اور اٹھارھویں صدی میں ڈاکٹر جانسن نے لوگوں کو اس طرف توجہ دلائی کہ ارسطو کے اصول بہت سی باتوں میں

اس کے عہد کے حالات کے پابند تھے۔ اور جب وہ حالات بدل گئے تو ان اصولوں کی پابندی بھی لازمی نہیں رہی۔ ان نقادوں نے اس بات پر زور دیا کہ شکسپیر کی کامیابی کا راز یہی ہے کہ اس کی تخلیق نے فرسودہ ضوابط کی زنجیروں کو توڑ کر اپنے دائرۂ عمل کو وسیع کر لیا۔ اٹھارھویں صدی کے آخر میں رومانی تحریک کے بانی ہرڈر نے تو فن تنقید ہیں کا یا پلٹ ہی کر دی۔ اس کا بنیادی اصول یہ تھا کہ ہر قوم اور ہر دور کی ایک مخصوص شاعرانہ روح ہوتی ہے جو اپنے اظہار کے لئے خود راہ نکالتی ہے۔ اس کے خیال میں ادب اور شاعری کو دوامی قواعد و ضوابط کا پابند بنانا گویا ان کی روح کو طوق اور سلاسل میں جکڑ رکھنا ہے، رومانی دور کے ڈراموں میں جو جدتیں پیدا کی گئیں انھیں دیکھ کر سولھویں اور سترھویں صدی کے نقاد آپے سے باہر ہو جاتے ہیں، سہ گونہ وحدت کا قانون بالکل پس پشت ڈال دیا گیا۔ ڈرامہ کے طول میں کسی طرح کی پابندی نہ رہی۔ المیئے کا موضوع بجائے بادشاہوں کی زندگی کے عوام کی زندگی بن گئی۔

شکسپیر کے عہد اور رومانی دور کے ڈرامے میں قدیم یونا رومی ڈرامہ یا قرونِ وسطیٰ کے فن تمثیل کے مقابلے میں جو تبدیلیاں ہوئیں وہ محض قانون صورت اور اصول فن کے لحاظ سے نہ تھیں بلکہ عہدِ جدید میں شاعری کی اور اصناف کی طرح ڈرامے کا مزاج ہی بدل گیا۔ یہ تغیر اصل میں انسان کے نفسی انقلاب کا نتیجہ تھا۔ یونان کے سقراطی دور اور روما کے شہنشاہی دور کا

انسان ایک ایسے تمدن کا حامل تھا جو بڑھاپے کی منزل میں پہنچ چکا تھا۔ اس کے خیالات میں پختگی تھی اور سادگی جو پختگی کا لازمی نتیجہ ہے۔ یہی پختگی اور یہی سادگی اس زمانے کے فلسفے میں آرٹ اور خصوصاً ڈرامہ میں پائی جاتی ہے، قرونِ وسطیٰ میں مسیحی مذہب نے رومی اور المانی قوموں میں پہنچ کر ایک نئے تمدن کی بنیاد ڈالی جسے ہم مغربی تمدن کہہ سکتے ہیں، صدیوں تک یہ تمدن بچپن کی حالت میں رہا۔ لوگوں کے دلوں پر بھولے پن، عقیدت اور تقلید کا رنگ غالب تھا جس کا اثر اس عہد کے طرزِ تعمیر، شاعری، ڈراما سبھی چیزوں پر پڑا۔ شکسپیر کے زمانے میں اس تمدن نے جوانی میں قدم رکھا تھا۔ اس کے ہمعصروں کے جذبات میں تلاطم برپا تھا ان کے تخیل میں ہیجان پیدا ہو گیا تھا۔ کیونکہ اس کے نفس میں نئی نئی امنگیں اور آرزوئیں پیدا ہو رہی تھیں یا بقول افلاطون کے ان کا مرغِ روح پر پرواز پیدا کر رہا تھا۔ اس سیلابِ تخیل، طوفانِ آرزو، جوشِ جوانی کو راہ پر لگانے کے اٹھارھویں صدی کی نئی روشنی کی تحریک نے عقلیت کے پشتے تیار کئے۔ لیکن یہ دریا ان کے روکے نہ رکا۔ اٹھارھویں صدی کی شاعری اور ڈرامہ میں لیسنگ اور اس کے ہمعصروں کی کوششوں سے کچھ دن پختگی، سنجیدگی، ضبط کا چلن رہا لیکن رومانی تحریک نے وضعِ احتیاط سے اکتا کر عقل کا گریبان چاک کر دیا۔ اور جذبات پرستی کا دور دورہ ہو گیا۔ قلبِ انسانی کی گہرائی سے احساس اور تخیل کے چشمے ابل پڑے اور بحرِ زخار کی طرح پھیل گئے۔

مگر انسانی تمدن اور انسانی روح کو پھیلنے کے بعد اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ آپ کو سمیٹے، جوانی کی شوریدہ سری اور مطلق العنانی تھوڑے دن رہتی ہے پھر خود بخود احساس ہوتا ہے کہ بس اب سنبھلنے کا وقت ہے۔ یہ صورت مغربی تمدن کو انیسویں صدی کے نصف اول میں پیش آئی۔ رومانی دور کی جذبات پرستی نے تخیل کو بڑی وسعت دی تھی اور احساس کو بہت تیز کر دیا تھا لیکن بہت جلد یہ معلوم ہو گیا کہ محض تخیل احساس اور جذبات کی بنا پر مکمل تمدنی زندگی کی تعمیر نہیں ہو سکتی۔ اہلِ نظر تنقید اور غور سے کام لینے لگے اور ایک با اصول اور مستحکم عقیدۂ زندگی تلاش کرنے لگے۔ اس جستجو کا پہلا علمبردار شاعری اور ڈرامہ میں شاعر گوئٹے ہے۔ گوئٹے ابتدائی عمر میں رومانی شاعر تھا۔ لیکن مدت تک زمانے کے نشیب و فراز دیکھنے کے بعد اس کے عقائد بہت کچھ تبدیل ہو گئے، اور وہ زندگی کا ایک برتر اور بہتر نصب العین تلاش کرنے لگا۔

لیکن گوئٹے انقلاب کا قائل نہیں تھا۔ بلکہ ارتقا کو مانتا تھا۔ وہ تاریخ کے ہر دور کو تمدنی نشو و نما کے سلسلے کی ایک کڑی سمجھتا تھا اور کسی کڑی کو توڑنا اسے گوارا نہ تھا۔ رومانی خیالات کا اس پر بڑا گہرا اثر تھا اور ان کی خامیوں سے واقف ہو جانے کے بعد اس نے انھیں بالکل رد نہیں کیا بلکہ ان کے ایک اہم عنصر کو اپنے فلسفۂ زندگی میں جذب کر لیا۔ اس کے نزدیک رومانیوں کی جذبات پرستی، انفرادیت بے اصولی بے راہ روی سطحی اور عارضی چیز تھی لیکن ان کی باطنیت بڑی گہری حقیقت

پر مبنی تھی۔ اس باطنیت کو اس نے لے لیا لیکن یوں نہیں کہ حواس ظاہری اور عقل کو معطل کر کے نامعلوم قوتوں کے آگے سر جھکا دیتا بلکہ اس طرح کہ انسانی زندگی کو اس نے ایک مجازی چیز قرار دیا جو عقل و ادراک کے مرحلوں سے گذرتی ہے اور ایک منزل پر پہنچ کر حقیقت کے آغوش میں چلی جاتی ہے۔ اس کے آگے جو کچھ ہوتا ہے اس کی کسی کو خبر نہیں اور نہ ہو سکتی ہے۔

مگر گوئٹے کے بعد انیسویں صدی کے نصف دوم میں یورپ کی زندگی اور خیالات میں بڑا انقلاب ہو گیا۔ سائنس کی ترقی اور اس کے استعمال سے صنعت کو بے حد فروغ ہوا۔ بڑے بڑے کارخانے کھل گئے۔ دیہات کی آبادی کھنچ کر شہروں میں آ گئی، زندگی کی ضروریات بڑھ گئیں اور ان کے پورا ہونے میں دقت ہونے لگی۔ کارخانے کے مزدور جب دفعتاً ایک نئی فضا میں آئے تو ان کی سماجی زندگی کا شیرازہ بالکل بکھر گیا۔ ان معاشی اور سماجی پیچیدگیوں کے سبب سے لوگوں میں ایک عام بے چینی پیدا ہوئی اور یہ محسوس ہونے لگا کہ نئے مادی حالات سے مطابقت پیدا کرنے کے لئے حکومت و سیاست، مذہب و اخلاق ہر چیز میں انقلاب کی ضرورت ہے۔

قدرتی بات تھی کہ اس زمانے میں روزمرہ زندگی کے واقعات نے لوگوں کو اس قدر متوجہ کر لیا کہ زندگی کی حقیقت اور اس کے آغاز و انجام پر غور کرنے کی فرصت نہیں رہی، ادھر نظری فلسفے پر ثبوتیت کا رنگ چھا گیا

یعنی علم کا تنہا معیار تجربہ اور مشاہدہ قرار پایا۔ اور تخیل، وجدان اور باطنی احساسات ناقابل اعتبار سمجھ کر ترک کر دیئے گئے، ادھر علمی فلسفے میں افادیت دخیل ہو گئی۔ زندگی کا اعلیٰ مقصد حصول راحت ٹھیرا اور اس کے حصول کا ذریعہ سائنس۔

عام خیال یہ تھا کہ زندگی کی تشکیل اور تہذیب کو مذہبی عقائد یا فلسفیانہ تخیلات پر نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ بلکہ تجربے اور مشاہدے کے ذریعہ سے اس کا ایک صحیح علم مرتب کرنا چاہیئے۔ اس علم کا نام عمرانیات (Sociology) رکھا گیا اور یہ سارے علوم کا سرتاج سمجھا جانے لگا۔

اس انقلاب کا اثر ناول نویسی اور ڈرامہ پر بھی بہت گہرا پڑا۔ ان فنون کا مقصد اب تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ انسان کے ذوق جمال اور ذوق مشاہدہ کو پورا کریں ان سے زندگی کی تنقید یا اصلاح کا کام اگر لیا جاتا تھا تو محض ضمنی طور پر اب ان کا سب سے بڑا فرض یہ قرار دیا گیا کہ فرسودہ اصولوں اور عقیدوں کی چھان پھٹک کریں اور زندگی کے لئے نصب العین پیش کریں۔ عمرانیات کے جو مسئلے اس زمانہ میں عام طور پر چھڑے ہوئے تھے مثلاً فرد کی جسمانی اور روحانی آزادی عورتوں اور مردوں کی مساوات، مروجہ اخلاق کی تنقید وغیرہ وہی ناولوں اور ڈراموں کے موضوع بن گئے۔

بے قید تخیل اور بے رعب جذبات پر اب بڑی قدغن ہونے لگی۔ ایسی باتیں جن میں واقعیت کا رنگ نہ ہو بالکل ترک کر دی گئیں۔ مافوق الفطرت

عناصر جیسے دیوتا، تقدیر، جن، پری وغیرہ۔ جن سے پہلے ڈرامہ میں بہت کام لیا جاتا تھا، اب صرف بچوں کی کہانیوں تک محدود رہ گئے۔ ان سے جو تمثیلی اثر پیدا ہوتا تھا وہ اب زندگی کی ظاہری قوتوں مثلاً وراثت، قوتِ حیات اور نفسیاتی عناصر سے پیدا کیا جانے لگا۔ یوں بھی صنعتی ترقی نے اسٹیج پر ہر طرح کے مناظر دکھانے میں اتنی آسانی پیدا کر دی تھی کہ ڈرامہ کے زور اور اس کی دلچسپی میں کوئی کمی نہیں ہونے پائی۔

یہ نئی روح ناروے کے ڈرامہ نگار ابسن کی تصانیف میں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ اس لئے وہی نئے ڈرامے کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ ابسن یہ محسوس کرتا تھا کہ مغربی سماج کے اصول و قواعد اور اخلاق و رسوم فرسودہ ہو چکے ہیں، ان میں اتنی جان نہیں کہ ہر نئے زمانہ کے ساتھ چل سکیں۔ اور نئی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کر سکیں۔ لوگ محض قدامت پرستی کے سبب سے ان سے اب تک مانوس ہیں۔ اور وہ ان میں اتنی بصیرت پیدا کرنا چاہتا تھا کہ پرانے خیالات اور رسم و رواج کی کمزوریوں کو سمجھ لیں۔ اور اتنی ہمت کہ ان زنجیروں کو توڑ کر پھینک دیں۔ جب وہ اصلاح کے جوش میں اپنے عہد کے اصول اخلاق پر پے در پے حملہ کرتا ہے تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ دوسرے سے اجتماعی اخلاق ہی کا قائل نہیں اور اس کے نزدیک فردِ انسانی پر باہر سے یعنی مذہب یا تمدن کی طرف سے کسی طرح کی قیود عائد نہیں کرنا چاہیئں۔

بلکہ اسے اس کی حالت پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ تاکہ اس کی جبلتیں اور صلاحیتیں
آزادی سے نشو ونما پا سکیں۔ لیکن اس کی تصانیف کو غور سے دیکھیئے تو
معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس حد تک نراجی نہیں ہے۔ اس کا منشاء اصل میں یہ
ہے کہ اخلاقی اصول اور رسوم جو انسان کی مادی اور روحانی ترقی میں مدد
دینے کے لئے وضع کیئے گئے ہیں اسی حد تک قابل عمل ہیں جب تک وہ زمانے
کے حالات، فرد کے فطری رجحانات اور اس کی مخصوص ضرورتوں سے نہ ٹکرائیں
جہاں یہ تصادم پیدا ہو تو جیتے جاگتے انسان کی راحت وعافیت کو مقدم سمجھنا
چاہیئے۔ اور بے رنگ اور بے جان اصولوں کی پروا نہ کرنا چاہیئے۔ اگر یہ کشمکش
اکثر پیدا ہونے لگے تو سمجھنا چاہیئے کہ اب ہمارا مروجہ اخلاق زندگی کا ساتھ نہیں
دے سکتا۔ اور نظر ثانی کا محتاج ہے۔

ابسن کا کمال یہ ہے کہ باوجود تنقیدی اور مصلحانہ طرز اختیار کرنے
کے وہ آرٹ کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیتا۔ اس کے اصلاحی جوش اور اس کی
انقلاب پسندانہ شورش نے اس کی شاعری کو کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچایا
بلکہ اس کے کام میں اور زیادہ زور اور اس کے اندازِ بیان میں اور زیادہ
سوز وگداز پیدا کر دیا۔ وہ اپنے عہد کی معاشرت کا نقاد ہے نئی سماجی
تحریک کا علمبردار ہے مگر اسی کے ساتھ وہ شاعر ہے۔ اور اس کے یہاں روحانی
رنگ صاف نظر آتا ہے۔ آگے چل کر یہ رنگ ہلکا ہو گیا مگر پھیکا نہیں پڑنے پایا

آغازِ صدی کے رومانیوں میں اور ابسن میں اتنا فرق ہے کہ اُن لوگوں کی نظر کو جذبات پرستی نے دھندلا کر دیا تھا اور انھیں انسانی زندگی گویا کہر میں چھپی ہوئی نظر آتی تھی۔ مگر ابسن کو بس اتنا نشہ تھا کہ اس کا احساس تیز ہو گیا تھا اور ادراک میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اس میں وہی داخلیت تھی اور وہی انفرادیت مگر تنقید اور تحلیل کے ساتھ سموئی ہوئی۔ یہ تحلیل منطقی تحلیل نہ تھی جو زندگی کے پھول کو بے جان سمجھ کر اس کی پتی پتی الگ کر کے دیکھتی ہے، بلکہ نفسیاتی تحلیل جو اس کے اندر سما کر اس کے رنگ و بو، اس کی تازگی اور خوش نمائی کا جائزہ لیتی ہے۔ اور اس کے خونِ دل اور چاک جگر کا بھید پاتی ہے۔

ابسن نے "دشمنِ مردم" میں فرد اور جماعت کے تعلقات سے بحث کی ہے "گڑیا کا گھر" اور "سمندر کی خاتون" میں مرد اور عورت کے تعلقات پر تبصرہ کیا ہے لیکن "یہ بحث" اور "یہ تبصرہ" "خشک علمی مذاکرے نہیں ہیں۔ بلکہ ان میں آرٹ کی سبک دستی نے دلکشی اور دلربائی پیدا کر دی ہے۔ "دشمنِ مردم" جماعت کے خلاف، فرد کا نعرۂ جنگ، "سمندر کی خاتون" اور اس سے بھی بڑھ کر "گڑیا کا گھر" مرد کے مقابلے میں عورت کا اعلانِ آزادی ہے۔ مگر ان میں سے کسی میں مناظرے کی درشتی اور تلخی، شاعری کی نرمی اور حلاوت پر غالب نہیں آئی۔

آخری عمر میں ابسن کے شاعرانہ تخیل نے واقعیت نگاری میں استعاریت کا رنگ پیدا کر دیا۔ اس کا عمدہ اس کا مشہور ڈرامہ "ماہرِ فنِ تعمیر" ہے۔ قصہ

یہ ہے کہ ایک ذکی الطبع ماہر فن تعمیر سولینس کچھ خود غرضی اور کچھ رشک کے سبب سے اپنے نوجوان نائب راگز کی ترقی کو روکنا چاہتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ اگر راگز اس کی ملازمت ترک کر کے اپنا کاروبار الگ جاری کر دے گا تو اس کے گاہک ٹوٹ کر راگز کی طرف چلے جائیں گے۔ اور اس میں اس کا بڑا نقصان ہے۔ علاوہ اس کے اسے یہ گوارا نہیں کہ شباب کا بڑھتا ہوا زور بڑھاپے کی گھٹتی ہوئی قوت پر فتح پائے۔ اس لئے ایک طرف تو راگز کے بنائے ہوئے نقشوں میں خواہ مخواہ عیب نکال کر اس کی ہمت کو پست کرتا ہے اور دوسری طرف راگز کی منگیتر کے بھولے دل کو اپنے دام الفت میں گرفتار کر لیتا ہے تاکہ نہ وہ خود اس کی نوکری چھوڑے اور نہ راگز کو چھوڑنے دے مگر شباب ایک نوجوان سیلانی لڑکی ہلڈا کی شکل میں آتا ہے اور اس کے دل کو پُراسرار طریقے سے تسخیر کر لیتا ہے۔ ہلڈا اسے اس پر آمادہ کرتی ہے کہ اپنی بنائی ہوئی عمارت کے مینار پر جا کر چڑھے۔ سولینس لکڑی کے ڈھانچے پر جو معماروں نے مینار کے گرد کھڑا کر دیا ہے، چڑھتا ہے۔ مگر آخری زینے پر پہنچ کر اس کا سر چکرا جاتا ہے اور وہ اس بلندی سے زمین پر گر کر مر جاتا ہے۔ اس طرح پیری کی شکست ہوتی ہے۔ مگر بڑی شاندار شکست۔ ابسن کو اس ڈرامے میں یہ دکھانا مقصود ہے کہ موجودہ نسل کا آئندہ نسل کی اٹھان کو روکنا گویا قانون فطرت کا مقابلہ کرنا ہے اس کا انجام ناکامیابی ہے۔ مگر یہ ناکامیابی پیری کے لئے باعث ذلت نہیں۔

اس ڈرامے کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ڈرامہ کے جدید دور میں رومانیت روح معدوم نہیں ہوئی بلکہ نئے روپ میں استعاریت (Symbolism) کے نام سے تخیل کی آگ کو ہوا دیتی رہی۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ رومانیت تو عجائب پسندی کی دھن میں واقعیت کے قوانین سے صریحی انحراف کرتی ہے جذبات پرستی کے جوش میں اعتدال کے اصول کو کھلم کھلا توڑتی ہے مگر استعاریت عقل اور عادت کے پردے کو قائم رکھتی ہے۔ اور اس کے پیچھے سے رموز و اسرار کی جھلک دکھاتی ہے۔ یہ طرزِ بیان جو ابسن کے یہاں صرف آخری دور میں نظر آتا ہے۔ اسٹرنڈبرگ، میٹرلنک، روستان کے یہاں عام ہے۔ آئرلینڈ کے ڈرامہ نگاروں، خصوصاً ٹیٹس کی تمثیلوں میں یہ استعاریت اور گہری ہو کر باطنیت بن گئی ہے۔

روستان، میٹرلنک اور ہاؤپٹمان کی بعض تمثیلوں اور خود ابسن کے نوجوانی کے ڈراموں میں رومانیت اپنی اصلی حالت میں بھی نظر آتی ہے۔ مگر یہ ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری کرنیں ہیں۔ جن سے شامِ مغرب کی سنجیدگی اور افسردگی کم نہیں ہوئی۔

زمانے کا عام رجحان، جیسا ہم پہلے کہہ چکے ہیں واقعیت نگاری اور اخلاق و معاشرت کی تنقید کی طرف تھا۔ ڈرامے عموماً اس قسم کے موضوعوں پر لکھے جاتے تھے۔ جیسے شادی اور اس کے بعد زندگی

طلاق کا مسئلہ، مرد اور عورت کے جنسی تعلقات، عشق و محبت، عزت و وقار اور غیرت و حمیت کے موجودہ نصب العین کی تنقید سرمایہ داروں اور مزدوروں کی کشمکش وغیرہ وغیرہ۔

خوف تھا کہ ان خشک اور سنجیدہ مسائل پر تنقیدی بحث کرنے سے ڈرامے میں آرٹ کا عنصر کم ہو جائے گا۔ لیکن اس دور کے تمثیل نگاروں کا کمال تھا کہ انھوں نے اپنی تصانیف میں فن کی خوبی اور دلکشی کو قائم رکھا۔ ابسن کے علاوہ اس کے ہمعصر اسٹرنڈبرگ جرمنی کے ہاؤپٹمان اور زوڈرمان، آسٹریا کے اشنٹلر، انگلستان کے گالسوردی کے قلم میں یہ جادو تھا کہ انھوں نے زندگی کی عکسی تصویر میں بھی نقاشی کا لطف پیدا کر دیا۔

لیکن فرانس کے زولا اور بریو کی تصانیف کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ واقعیت نگاری اور سماجی تنقید کو آرٹ بنا دینا ہر ایک کا کام نہیں ہے۔ زولا کی فحش اور بے رنگ اور بریو کی خشک اور پھیکی تمثیلیں نہ صرف آرٹ سے خالی ہیں بلکہ شہوانی جذبات اور خبیث امراض کی بے حجابانہ نمائش سے ذوق سلیم کو اس قدر آزردہ کر دیتی ہیں کہ تنقیدی اور اصلاحی مقاصد میں بھی ان کی کامیابی بہت محدود ہے۔ بات یہ ہے کہ سماجی تنقید اور مصلحانہ

تبلیغ کو کامیابی کے انتہائی درجہ پر پہنچانے کے لئے جن عناصر کی ضرورت ہے یعنی اخلاقی خلوص اور جوش، سوزِ درد اور طنز و ظرافت، ان کی زولا اور بریو میں بہت کمی تھی۔ دوسرے ڈرامہ نگاروں میں جن کا ہم ذکر کر چکے ہیں یہ چیزیں موجود تھیں۔ مگر اسی حد تک کہ آرٹ کی سبک روی میں خلل نہ پڑے۔ اخلاقی مقاصد کے آگے آرٹ کی پروا نہ کرنا اور اس کے باوجود لوگوں کے قلوب کو تسخیر کر لینا صرف دو شخصوں کے حصہ میں آیا جن میں ایک روس کا ناول نویس ٹالسٹائی تھا۔ دوسرا انگلستان کا ڈرامہ نگار برنارڈ شا، ٹالسٹائی نے سوزِ درد سے، برنارڈ شا نے طنز و ظرافت سے یورپ کی ادبی دنیا میں قیامت برپا کر دی۔ ان دونوں کے فلسفہ زندگی میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ لیکن یہ بات دونوں میں مشترک ہے کہ ان کے اصلاحی جوش اور خلوص نے آرٹ کے قدر دانوں کی نظروں میں چکا چوند ڈال دی۔

حصّہ دُوم

(طنز و مزاح)

مجذوب کی بڑ

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف

آج پھر کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

اس مرتبہ گرمی کی چھٹیوں میں مجھے کئی سال بعد وطن جانے کا اتفاق ہوا کہتے ہوئے شرم آتی ہے مگر کہنا پڑتا ہے کہ مجھے اپنا گاؤں ملک سلیمان سے بہتر معلوم ہوا اور نہ وہاں کے کانٹوں میں سنبل و ریحاں سے زیادہ دل کشی محسوس ہوئی۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ میں بچپن سے اپنے والد کے ساتھ رہا اور وہ ملازمت کے سلسلے میں شہر شہر پھرتے رہے اس لئے میرے دل میں حب وطن کا جذبہ دب کر رہ گیا۔ یا یہ ہو کہ مجھے خلیل آباد میں کبھی وہ محبت نصیب نہیں ہوئی جس کا پرتو مٹی، پتھر اور درختوں کو زندگی اور کشش بخشتا ہے اور وطن کو وطن بناتا ہے۔ یہ دوسری بات زیادہ قرین قیاس ہے۔ کیونکہ میرے دل میں حب وطن نہ سہی مگر اس سے ملتی جلتی ایک چیز ضرور موجود ہے۔ میں جس کالج میں تعلیم پاتا ہوں اس سے مجھے عزیز دوست اور شفیق استادوں کی بدولت بے حد انس ہے۔ جب میں وہاں سے کہیں جاتا ہوں تو دل میں دردِ جدائی

کی کسک لیے ہوئے اور جب لوٹ کر آتا ہوں تو جوشِ مسرت میں ڈوبا ہوا۔ اگر خلیل آباد سے مجھے کوئی قلبی رشتہ محسوس نہیں ہوتا۔ میں دو برس کا تھا کہ میری والدہ اور پھوپھی کا انتقال ہو گیا۔ اور اسی سال میرے چچا وطن کی سکونت ترک کر کے بمبئی چلے گئے۔ خلیل آباد میں چند دور کے عزیزوں کے سوا کوئی باقی نہیں رہا۔ اس لئے میں کبھی تعطیل کے دنوں میں وہاں جاتا ہوں تو محض ایک فرض سمجھ کر۔ جب تک وہاں رہتا ہوں صبر کی نیکی روزانہ میرے نامۂ اعمال میں لکھی جاتی ہے۔ اور جب وہاں سے رخصت ہوتا ہوں تو میرا شمار شکر گذاروں میں ہوتا ہے۔

اس بار خلیل آباد میں میرے ہمسنوں میں سے کوئی موجود نہ تھا۔ اس لئے مجھے وہاں کا قیام اور بھی کھل گیا۔ صبح سے شام تک میرا وقت اس طرح سے گذرتا تھا کہ کبھی اپنے خاندانی کتبخانے میں جا کر کرم خوردہ کتابوں کی گرد جھاڑی اور ورق گردانی کی، کبھی زنانے مکان میں جا کر عورتوں کے آپس کے جھگڑے اور ہمسایوں کی شکایتیں سنیں، کبھی کھیتوں کی طرف چلا گیا کبھی آم کے باغ میں جا کر بیٹھ گیا۔ ممکن ہے کہ فلسفیانہ طبیعت والوں کو تنہائی کی زندگی میں غور و فکر کا بہت اچھا موقع ملتا ہو اور نظر ہوشیار کو درختوں کے پتوں میں معرفتِ کردگار کے دفتر نظر آتے ہوں لیکن میرے جیسے لوگ جو تنہائی میں اونگھتے ہیں اور پتوں کی دفتری زبان سے ناواقف ہیں اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ مجھے تو پہلے ہی دن سے فکر تھی کہ کوئی انسان ملے جس سے باتیں کر کے دو گھڑی

دل بہلا سکوں۔ مگر ہمارے گھر میں کیا سارے گاؤں میں کوئی ایسا شخص نہ تھا جسے سوائے کھیتی، مویشی، پٹواری وغیرہ کے کسی چیز سے دل چسپی ہو۔ مجھے گاؤں کے ہر آدمی سے وحشت تھی خصوصاً ایک صاحب سے تو ڈر سا لگتا تھا۔ ان بزرگ کا نام مجھے معلوم نہیں مگر یہ مجذوب کہلاتے ہیں اور ہمارے گھر کے قریب ایک مسجد میں رہتے ہیں، یہ مجھے اکثر راہ میں ملا کرتے تھے۔ کبھی کبھی مسجد میں جھاڑو دیتے ہوئے، کبھی کسی درخت کے تلے بیٹھے ہوئے، کبھی کھیتوں کے بیچ میں مینڈ پر لیٹے ہوئے۔ مگر ان کی بے تصنع ہیئت اور ان کا بے تکلف لباس دیکھ کر میری ہمت نہیں پڑتی تھی کہ ان کے قریب جاؤں یا ان سے بات کروں۔ ایک دن کا اتفاق ہوا کہ میں سیر کرنے نکلا اور بستی سے باہر جا کر ریل کی پٹڑی کے پاس ایک آم کے باغ میں تالاب کے کنارے جا بیٹھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے قریب ہی ایک بڑے سے پیڑ کی آڑ میں حضرت مجذوب سو رہے ہیں، میں سر جھکائے تالاب کی موجوں کا شمار کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں سر جو اٹھایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میاں مجذوب پاس کھڑے ہیں۔ پہلے تو میں نے ارادہ کیا کیا کہ اٹھ کر غیر معمولی تیزی سے قطع مسافت طے کرتا ہوا چل دوں۔ لیکن خیال ہوا کہ شاید کوئی دیکھ لے اور اس فعل کو بھاگنا سمجھے اس لئے میں اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ مگر دل میں دعا مانگتا جاتا تھا کہ خدا کرے خود ان حضرت کے دل میں اس وقت ذوقِ سفر لطفِ مقام پر غالب آجائے۔

مگر دعا کا اثر الٹا ہوا، مجذوب صاحب اور قریب آئے اور مجھ سے کوئی ایک گز کے فاصلہ پر مزے میں پیر پھیلا کر بیٹھ گئے۔ میں سہم کر تھوڑا سا پیچھے کھسکا، اس حرکت سے وہ میری طرف متوجہ ہو گئے اور غصے کے لہجے میں پوچھنے لگے "تو تیرنا جانتا ہے؟" مجھے واحد حاضر کی ضمیر زیادہ مرغوب نہیں مگر اس وقت میں نے اسے سہہ لیا اور آہستہ سے جواب دیا "جی نہیں"۔ "تو پھر تو اس تالاب میں کیوں نہیں کود پڑتا؟" یہ مجذوبانہ منطق مجھے بہت مہلک معلوم ہوئی۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا مگر اس خوف سے کہ کہیں یہ اس سلسلے میں کوئی عملی دلیل نہ دے بیٹھیں میں سنبھل کر بیٹھ گیا کہ ضرورت ہو تو بے اجازت رخصت ہو کر گھر کی راہ لوں۔

مجذوب صاحب نے میرے جواب کا انتظار نہیں کیا بلکہ سلسلۂ گفتگو کو جاری رکھا۔ "کیا تو دنیا سے نرالا ہے۔ سب یہی کرتے ہیں۔ ہر مسلمان یہی کرتا ہے۔ مسلمان مسلمان سب برابر ہیں۔ کوئی غریب ہے کوئی امیر ہے، کوئی عالم ہے کوئی جاہل ہے۔ مگر ہیں سب مسلمان، سب بے صبر، سب غافل، سب ناعاقبت اندیش، سب من کے موجی، سب جذبات کے غلام۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ وہ مسلمان جو اپنے نفس پر، اپنے دل پر، اپنی زبان پر، اپنے ارادوں پر، اپنی خواہشات پر، اپنے خیالات پر قابو نہیں رکھتے، رہنما بن کر قوم کی رہنمائی کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں، وہ مسلمان جو سچے علم و فضل سے، مطالعۂ فطرت سے، مشاہدۂ زندگی سے، حق کی محبت سے بیگانۂ محض ہوتے ہیں، عالم دین بن کر تعلیم و تلقین

کے مسند پر بیٹھ جاتے ہیں؛ وہ مسلمان جو لذتِ بے خودی سے، کیفِ تسلیم سے ذوقِ درد سے، ہمدردی اور خدمت کے جذبات سے ناآشنا ہوتے ہیں، یہ پیر روشن ضمیر بن کر رشد و ہدایت کا باب کھول دیتے ہیں۔ اگر تو نے اس کا مشاہدہ کیا ہے تو پھر تو جو تیرنا نہیں جانتا اس تالاب میں کیوں نہیں کود پڑتا؟...... کیا تو نہیں جانتا کہ مسلمان مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں مگر ذرائع سے بے نیاز ہیں۔ ثمر حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن بونے جوتنے سے بے پرواہ ہیں۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ مسلمان ایک طلسمی دنیا میں رہتے ہیں جہاں قول کے معنی فعل، ارادے کے معنی عمل، دعوے کے معنی دلیل، خواہش کے معنی واقعہ سمجھے جاتے ہیں۔ جہاں آنکھ صرف ان چیزوں کو دیکھتی ہے جو اسے پسند آئیں۔ کان صرف ان باتوں کو سنتا ہے جو اسے مرغوب ہوں۔ اور ذہن صرف ان معروضات کا ادراک کرتا ہے جو اسے گوارہ ہوں۔ اگر تجھے یہ علم ہے تو پھر کیوں بیکار عقل سے کام لیتا ہے۔ اور کیوں اس تالاب میں کود نہیں پڑتا؟...... معلوم ہوتا ہے تو باوجود مسلمان ہونے کے مسلمانوں کی اصلی حالت سے واقف نہیں۔ سن میں تجھے سناتا ہوں، دیکھ میں تجھے دکھاتا ہوں، یہ پیکرِ خیالی جو تیری چشمِ باطن کے سامنے ہے، ہندوستان کا مسلمان ہے۔ اس نے دنیا میں آنکھ کھولی تو دیکھا کہ اس کے پاس کچھ نہیں ہے اور سنا کہ اس کے بزرگوں کے پاس سب کچھ تھا۔ اس کے بزرگ ہندوستان پر حکومت کرتے تھے قوت و سطوت، جاہ و حشمت، مال و دولت کے مالک تھے۔ زراعت، تجارت،

لین دین، یہ چیزیں ان کے پاس نہ تھیں اور ان کی انھیں ضرورت بھی نہ تھی۔ سلامت روی، مسکنت، تحمل، جفاکشی کی صفات یہ لوگ نہیں رکھتے تھے اور ان کے یہ شایان شان بھی نہ تھیں۔ دفعتہً ہوا بدلی، زمانہ پلٹا، ہندوستان میں انقلاب ہوگیا۔ مسلمانوں کے ہاتھ سے حکومت جاتی رہی اور اس کے ساتھ وہ باتیں بھی جو حکومت کے ساتھ وابستہ ہیں۔ قصرِ زندگی کی بنیادیں پہلے ہی سے ان کی نہ تھیں۔ اب اس کی دیواریں، اس کی چھتیں، اس کے کنگرے اس کے گنبد بھی چھن گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیچارے مسلمان کا کہیں ٹھکانا نہ رہا۔ سر پہ سائے کا تو کیا ذکر ہے، پیر تلے سے زمین بھی نکل گئی۔ اب یہ اللہ کا بندہ ہوا میں معلّق ہوکر رہ گیا۔ اس کی زندگی خیالی دنیا میں بسر ہونے لگی۔ کون سی خیالی دنیا، وہ نہیں جو ایمان و یقین، وسعتِ نظر اور قوتِ عمل بخشتی ہے بلکہ وہ جو حواس ظاہری و باطنی کو نیم بیداری کی حالت میں رکھتی ہے۔ جو جسم و جان پر ایک کابوس مسلط کر دیتی ہے۔ وہ نہیں جو انسان کو ابھار کر مشاہدہ و عرفان کی بلندی پر لے جاتی ہے بلکہ وہ جو اس سے گرا کر جمود و غفلت کے گڑھے میں ڈال دیتی ہے۔ اسے زندگی کی حقیقتوں سے وحشت ہونے لگی وہ واہمہ کی بنائی ہوئی تصویروں سے دل بہلانے لگا۔ کاہلی کا نام اس نے قناعت رکھ لیا، بے عملی کا توکل، بے بسی کا صبر، بے حسی کا زہد، . . . . یہ غنودگی، یہ غفلت اس پر ہمیشہ طاری نہیں رہتی بلکہ اکثر وہ چونکتا ہے، سر اٹھاتا ہے، اِدھر اُدھر

دیکھتا ہے، کبھی کبھی وہ اٹھتا ہے، دوڑتا ہے اور اتنا دوڑتا ہے کہ تھک کر گر پڑتا ہے لیکن کیا چونکنے کے بعد اسے زندگی کی حقیقتیں نظر آتی ہیں، کیا دوڑنے کے بعد وہ منزلِ مقصود سے قریب تر ہو جاتا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں، یہ چونکنا محض خوابِ پریشاں کا نتیجہ ہے اور یہ دوڑنا محض وحشت کی دلیل ..... یہ حقیقت سے بے خودی، یہ واہمہ کی غلامی، یہ غفلت اور وحشت کا تضاد مسلمان کی زندگی کے ہر شعبہ سے نمایاں ہے۔ مذہب کو اس نے زندگی کے واقعات سے دنیا کے حالات سے، زمانے کی رفتار سے جدا کر لیا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ دینداری نام ہے ہر زندہ قوت سے ڈرنے کا، ہر تغیر کی طرف سے آنکھ بند کر لینے کا۔ ہر نئی چیز سے نفرت کرنے کا، وہ خود ناتمام اور نیم گرم عقیدہ رکھتا ہے، بے توجہی اور بے دلی سے عبادت کرتا ہے۔ مگر جب کسی دوسرا عقیدہ رکھنے والے یا دوسرے طریقے سے عبادت کرنے والے کو دیکھتا ہے تو بادل کی طرح اٹھتا ہے، گرجتا ہے اور برس پڑتا ہے۔ شاعر کو اس نے سچے مشاہدات، واردات اور جذبات سے بے تعلق کر کے بے رنگ حسن، بے کیف عشق، بے ثمر وصل اور بے تمکین ہجر کے دائرے میں گھیر لیا ہے۔ اس کے نزدیک شاعری حقیقت کو تخیل کی آنکھ سے دیکھنے اور جذبات میں خوشنما حرکت اور ہم آہنگی پیدا کرنے کو نہیں کہتے۔ بلکہ خارجی اور عینی دنیا سے منہ موڑ کر اپنے نفس کی اندھیری کوٹھری میں بھٹکنے، ادھر ادھر ٹٹولنے اور کچھ نہ پا کر کفِ افسوس ملنے کو۔ اس کے خیال

میں شاعر وہ نہیں جس کا دل کائنات کے درد سے دکھتا ہے اور جس کا ذہن حسن ازلی اور عشقِ ابدی کی سومیائی میں اس درد کی دوا ڈھونڈتا ہے بلکہ وہ ہے جو اپنے ہاتھوں ادنیٰ خواہشات اور جذبات کی ولدل میں پھنس جاتا ہے۔ اور بجائے اس کے کہ باہر نکلنے کی کوشش کرے، روتا ہے، چلاتا ہے، تڑپتا ہے۔ اس نے اقتصاد و سیاست کی طرف سے ابتدا میں ایسی غفلت برتی کہ وہ مال و زر سے بالکل خالی اور قوت و سطوت سے قطعاً محروم ہو گیا۔ اور اب جو ذرا سنبھلا ہے تو اس نے ان چیزوں کو جن میں فکر و عمل کی ضرورت ہے جذبات کا کھیل بنا دیا ہے اپنے بوتے کھڑا نہیں ہو سکتا، دوسروں کا سہارا ڈھونڈتا ہے، آج ایک کا کل دوسرے کا پھر جب اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں کوئی کسی کا نہیں تو طیش میں اپنے آپ سے لڑتا ہے۔ جھنجھلاہٹ میں اپنی بوٹیاں چباتا ہے . . . . اگر اس خیالی تصویر پر تیری نظر نہ جمی ہو تو مجھے دیکھ میں تیرے سامنے کھڑا ہوں، ایک دن تھا کہ میں بھی انسان تھا، میں بھی مسلمان تھا، میں نے بھی دوسرے مسلمانوں کی طرح اس عرصۂ جد و جہد سے، اس جہان گیر و دار سے الگ ایک طلسمی دنیا میں پرورش پائی تھی۔ مذہب کے پردے میں کاہلی، بے عملی، بے بسی، بے حسی سیکھی تھی۔ شاعری کے نام سے نفس پرستی حقیقت فراموشی کی تعلیم پائی تھی۔ سیاست و اقتصاد کے دھوکے میں شیخ چلی کے سے منصوبے باندھنے اور آخر میں مایوس ہو کر تقدیر سے، دنیا سے اور

اپنے آپ سے لڑنے کی مشق کی تھی۔ میری زندگی بھی غفلت اور وحشت، جمود اور اضطراب کا تضاد تھی۔ مگر میرا تخیل دوسروں سے زیادہ قوی تھا اور میرا دل و دماغ دوسروں سے زیادہ کمزور، نتیجہ یہ ہوا کہ میرے قوائے ذہنی میں باہمی ربط کے رشتے ٹوٹ گئے۔ میری محدود خیال زندگی کا سلسلہ بھی میری آنکھوں کے سامنے الگ الگ کڑیوں میں بکھر گیا جن کو ملانے کی میں کوشش کیا کرتا ہوں مگر بہت کم کامیاب ہوتا ہوں۔ لوگ مجھے دیوانہ سمجھتے ہیں، مگر چونکہ میری پچھلی زندگی میں مذہبیت غالب تھی اور اب بھی اس کا شائبہ موجود ہے اس لئے اخلاقاً مجذوب کہتے ہیں۔ بعضوں کا خیال ہے کہ مجھ پر حقیقت کے بھید اور معرفت کے اسرار کھل گئے ہیں، انھیں برداشت کرنے کی تاب۔ انسانوں کے مربوط ادراک، احساس اور عمل کے لئے تڑپتا ہوں۔ مگر کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ دوسرے مسلمانوں کی حالت مجھ سے کچھ بہتر ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں، وہ سب میری طرح مجذوب ہیں اگر فرق ہے تو بس اتنا کہ میں کھلا ہوا مجذوب ہوں وہ چھپے ہوئے مجذوب ہیں، میں نے زندگی کی بازی میں ہار مان لی اور وہ ہاری ہوئی بازی کھیل رہے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ خیر مجھے اس وقت سب سے غرض نہیں۔ میں تو تجھ سے وہ بھید کہنا چاہتا ہوں جو میں نے سب کچھ کھو کے پایا ہے۔ میرے ذہن کی تاریکی میں اس وقت جو عارضی روشنی آگئی ہے اسے غنیمت سمجھ اور میری بات غور سے سن۔ تو ابھی نوجوان ہے اور زندگی

کے گھنے اور تاریک جنگل میں قدم رکھا ہے جس میں سیدھی راہ چھوڑ کر میں بھٹک گیا ہوں تیرے پاس ابھی عقل کا چراغ موجود ہے جس میں عقیدے کا تیل جلتا ہے تیری رگوں میں ابھی شوق اور ولولے کا خون دوڑ رہا ہے۔ اور تیرے پیروں میں رہ نوردی کی قوت موجزن ہے۔ اگر تو منزلِ مقصود تک پہنچنا چاہتا ہے تو پہلے منزل کو متعین کر لے۔ پہلا قدم اٹھانے سے پہلے بیٹھ کر اچھی طرح سوچ لے کہ تجھے کہاں جانا ہے۔ اس آسمانی چراغ کی روشنی میں جو تیرے پاس ہے، اس جنگل کو ملک کے بھیجے ہوئے نقشہ کا خوب مطالعہ کر لے اور منزل رسیدہ مسافروں کے سفرناموں کو غور سے پڑھ لے جب یہ کر چکے تو استقلال اور استقامت کو اپنا رفیق راہ بنا۔ اور خدا کا نام لے کر اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں داخل ہو جا، اگر راہ میں تیرے پیر بھٹک جائیں تو قدم اور تیزی سے بڑھا۔ اگر تجھ پر نیند غالب ہو تو آنکھیں اور اچھی طرح کھول لے۔ اگر روشنی چھپ جائے اور اندھیرا چھا جائے تو اپنے چراغ کی بتی کو اور اکسا لے، جب تجھے دوسرے رہ نورد نظر آئیں تو ان سے گریز نہ کر، کیونکہ وہ تیرے رفیق سفر ہیں، ان کی مدد کرنا تیرا فرض ہے اور ان سے مدد لینا تیرا حق ہے لیکن سہارا لینا ہو تو اس کا لے جو سیدھے راستہ پر چل رہا ہے۔ سہارا دینا ہو تو اسے دے جو سیدھے راستہ پر چلنا چاہتا ہے۔۔۔۔۔ اگر تجھے یہ باتیں منظور ہیں تو جا خدا تیرا حافظ ورنہ اٹھ اور اس تالاب میں کود پڑ۔ اگر تیرا بھی وہی انجام

ہونا ہے جو میرا ہوا تو بہتر ہے کہ تو اپنے وجود سے دنیا کو پاک کر دے۔"

میں تصویر حیرت بنا ہوا مجذوب صاحب کی گفتگو سن رہا تھا۔ ان کے آخری الفاظ سن کر میں چونک پڑا مگر قبل اس کے کہ میں کچھ جواب دوں وہ اٹھے اور بستی کی طرف روانہ ہو گئے۔ خدا جانے انھیں مجھ پر رحم آگیا یا ان کے دل میں میری طرف سے کچھ امید پیدا ہو گئی۔

عینک فروش

ڈاک گاڑی اپنی پوری رفتار سے چل رہی تھی۔ مجھے معمولی سواری کی رفتار سے بھی وحشت ہوتی ہے اور ڈاک گاڑی کی تیزی سے تو اختلاج ہونے لگتا ہے، اکثر یہ خیال آتا ہے کہ اگر خدانخواستہ میرے سفر کی سمت غلط ہو تو جتنی تیز یہ گاڑی چلے گی اتنا ہی میں منزل مقصود سے دور ہو جاؤں گا۔ پھر سوچتا ہوں کہ یہی صورت زندگی کے سفر کی ہے۔ سست قدم راہ رو اگر غلط راہ بھی اختیار کر لے تو دن بھر میں منزل سے دور نہ ہٹے گا۔ لیکن وہ مسافر جو برق رفتار مرکب پر سوار ہے۔ راہ سے بے راہ ہو جائے تو دم بھر میں خدا جانے کہاں جا پہنچے گا۔ عقل کہتی ہے کہ یہ منطق غلط ہے۔ تیز چلنے والا تیزی سے واپس بھی آسکتا ہے مگر جو شخص قدم گن گن کر رکھتا ہے اسے آدھی دور سے لوٹنا پڑے تو جانے میں جتنی دیر لگی تھی اتنی ہی آنے میں لگے گی۔ کس کی مجال ہے کہ ریاضی کی اس مساوات سے انکار کرے۔ مگر یہ بتائیے کہ پچھلے مہینے جب میں دلی سے لاہور جانا چاہتا تھا اور غلطی سے بمبئی کی ڈاک میں بیٹھ کر جھانسی جا پہنچا جہاں آٹھ گھنٹے تک واپسی کے لئے پسنجر بھی نہ ملی اس وقت یہ مساوات کہاں چلی گئی تھی۔ اس وقت

میں ریاضی سے سر پھوڑتا یا منطق کو لے کر جاٹتا۔ ریاضی اور منطق کی صحت مسلّم مگر زندگی میں ان کا استعمال اتنا سہل نہیں جتنا لوگ سمجھتے ہیں، غرض مجھے ڈاک گاڑی کی رفتار سے ڈر لگتا ہے، میرا سر چکراتا ہے، طبیعت بے قابو ہو جاتی ہے بات بات پر غصہ آتا ہے، ہر شخص سے لڑنے کو جی چاہتا ہے، اس کے لئے منطقی دلیل یا ریاضی کی مساوات کی کوئی ضرورت نہیں۔

میں ڈیوڑھے درجے کے ایک چھوٹے سے ڈبّے میں بیٹھا تھا جس میں آمنے سامنے صرف دو بنچیں تھیں۔ میرے علاوہ تین مسافر اور تھے۔ ان میں سے ایک پہلی نظر میں سوتے معلوم ہوتے تھے۔ دوسری نظر میں اس سے بھی زیادہ سوتے اور تیسری نظر میں یہ انکشاف ہوتا تھا کہ گو ان کی آنکھیں کھلی ہیں اور منہ بھی کھلا ہے مگر وہ سو رہے ہیں، یہ بزرگ میرے سامنے کی پوری بنچ پر پھیلے ہوئے بیٹھے تھے۔ اور جب کبھی میں نظر اٹھاتا تھا مجبوراً ان کے چہرے کی زیارت ہوتی تھی۔ مجھے ان کے مٹاپے سے اور ان کے یوں بے ساختہ سونے سے بڑی کوفت ہوتی تھی اور جب یہ سوتے سوتے جوش میں آکر خرّاٹے بھی لینے لگتے تھے تب تو بے ساختہ جی چاہتا تھا کہ بقیہ دو مسافروں کی مدد سے انھیں اٹھا کر کھڑکی سے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ دروازے سے باہر پھینک دوں۔

میں بنچ کے ایک سرے پر تھا اور میرے داہنے ہاتھ پر ایک نوجوان

بیٹھے تھے جن کے چہرے سے کسی گہرے صدمے کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ ان کے لب خشک تھے۔ چہرے کا رنگ زرد تھا۔ اور آنکھوں کی بے حالی سے دل کی بے چینی ٹپک رہی تھی۔ بینچ کے دوسرے سرے پر ایک پیر مرد نیم دیسی نیم انگریزی وضع کے تشریف فرما تھے۔ جنھیں میں نے اکثر ریل میں سفر کرتے دیکھا تھا۔ ان کے ساتھ ایک چمڑے کا ہینڈ بیگ تھا جس پر ان کا نام اور پتہ لکھا ہوا تھا۔ میں نے اس سے پہلے کئی بار اسے پڑھنے کی کوشش کی مگر چونکہ یہ کھٹکا رہتا تھا کہ وہ میرے اس خلاف تہذیب تجسس کو نہ دیکھ لیں اس لئے کبھی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ آج موقع پا کر میں نے اتنا معلوم کر لیا کہ وہ عینک کے ایک مشہور کارخانے کے ایجنٹ ہیں۔ نام دوسری طرف تھا اسے نہ پڑھ سکا۔

میں خود ریل میں باتیں نہیں کرتا۔ اور چاہتا ہوں کہ کوئی نہ کرے۔ اسی لئے حتی الامکان خالی درجے میں بیٹھا کرتا ہوں۔ مگر ڈیوڑھے درجہ میں خالی ڈبہ تقدیر ہی سے ملتا ہے۔ آج میرے ساتھ تین مسافر تھے۔ مگر بظاہر ان میں سے کسی سے یہ اندیشہ نہ تھا کہ زیادہ باتیں کرے گا۔ سامنے کی بینچ والے خواہ مخواہ مرد آدمی کا شمار تو اس وقت حیوان ناطق کی ذیل میں تھا ہی نہیں، رہے وہ دونوں حضرات جو میری بینچ پر تھے' ان میں سے نوجوان تو بیچارے حزن و ملال کی تصویر بنے ہوتے تھے اور پیر مرد عینک فروش کسی کتاب کے

مطالعے میں غرق تھے۔ اس لئے میں اطمینان سے بیٹھا گاڑی لڑنے، پل ٹوٹنے آدمیوں کے گرنے، کچلنے، مرنے کے تصور سے اپنے دل کو دہلانے اور پریشان کرنے کا سامان کر رہا تھا۔

گاڑی ۔۔۔۔ اسٹیشن پر رکی۔ باہر کی چہل پہل کے اثر سے ہمارے چھوٹے سے حلقے میں بھی کچھ حرکت پیدا ہوئی، ہمارے نوجوان رفیق گھبرا کر اس انداز سے اٹھے گویا یہیں اترنا چاہتے ہیں مگر جب انہوں نے کھڑکی کے پاس جاکر اسٹیشن کا نام پڑھا تو کسی قدر مایوسی کے ساتھ آکر اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ موٹے مسافر نے بھی گاڑی ٹھہرتے ہی آنکھ کھولی اور بیٹھے ہی بیٹھے اسٹیشن کی طرف مڑ کر گردن کھڑکی میں سے نکالی۔ انہوں نے اس کریہہ آواز سے جو شاید نزع کے وقت انجن کے گلے سے نکلتی ہوگی سودے والے کو بلایا۔ اور تھوڑی دیر میں ان کی بنچ کے ایک کونے میں مٹھائی، پوری، کباب، دہی بڑے، ککڑی، امرود، الم غلم کا ایک ڈھیر لگ گیا۔ میں سمجھا کہ شاید انہیں کئی دن تک مسلسل سفر کرنا ہے اس لئے انہوں نے یہ ذخیرہ جمع کرلیا ہے۔ لیکن جب انہوں نے نیت باندھ کر کھانا شروع کیا تو میرے دیکھتے ہی دیکھتے چند منٹ میں وہ سارا سامان رسدان کے صندوق شکم میں جاکر غائب ہوگیا۔ کھانے سے فارغ ہوکر انہوں نے ایک بڑا سا لوٹا اٹھایا اور منہ سے لگا کر ایک سانس میں خالی کردیا۔ پھر آستین سے منہ پونچھا، ڈکار لی گاڑی کی دیوار کے سہارے سے پھیل کر بیٹھ گئے۔ آنکھیں بند کرلیں اور چشم زدن

میں جہاں سے آئے تھے وہیں پہنچ گئے۔

میں اس روح فرسا نظارے کو دیکھ کر دل میں کڑھ رہا تھا کہ گاڑی چلی، اور پیرمرد نے جو اب تک برابر مطالعے میں مصروف تھے دفعتہً کتاب بند کر دی اور نوجوان مسافر کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگے: "آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں" یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مجھے یہ بات بیحد ناگوار ہوئی۔ مغربی تہذیب میں اگر مجھے کوئی اصول پسند ہے تو یہ کہ جس شخص سے تعارف نہ ہوا اس سے بے ضرورت گفتگو کرنا جائز نہیں۔ میرا جی چاہا کہ ان سے پوچھوں آپ کو ایک اجنبی سے اس طرح سوال کرنے کا کیا حق ہے مگر خیال ہوا کہیں وہ نہ کہہ بیٹھیں کہ آپ کو دخل در معقولات کا کیا حق ہے۔ اس لیے میں خاموش ہو رہا لیکن دل میں دعا مانگتا تھا کہ وہ نوجوان پیرمرد کی اس جسارت پر ناپسندیدگی کا اظہار کریں۔ مگر نوجوان نے ڈوبی ہوئی آواز میں صرف اتنا کہا "کیا عرض کروں کہاں جا رہا ہوں" اب مجھے یقین ہو گیا کہ یہ گفتگو کا سلسلہ چلا اور دیر تک چلا۔ غصہ تو مجھے ضرور آیا مگر اسی کے ساتھ یہ اشتیاق بھی تھا کہ نوجوان کی اس شکستہ دلی اور مایوسی کی وجہ معلوم ہو۔ بظاہر تو میں منہ پھیر کر کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا مگر کان ان دونوں کی گفتگو پر لگے تھے۔

"آپ بہت اداس معلوم ہوتے ہیں۔"

"جی ہاں، کچھ ایسی پریشانیاں ہیں۔"

"آخر معلوم تو ہو وہ کون سی ایسی بات ہے جس نے آپ کو شگفتگی کے موسم میں پژمردہ کر دیا ہے۔ میری اس بے تکلفی کو معاف کیجئے میں بے فائدہ دوسروں کے حالات کا تجسس نہیں کرتا۔ آپ سے یہ سوال اس لئے پوچھتا ہوں کہ شاید آپ کی کچھ مدد کر سکوں۔

"میں آپ کی اس بزرگانہ شفقت کا شکر گذار ہوں مگر میری مدد دنیا میں کوئی نہیں کر سکتا۔"

"آپ کیوں میرا حوصلہ پست کرتے ہیں اپنی سی کوشش تو کرنے دیجئے۔"

"جب آپ کی کوشش ناکام ہو گی تو حوصلہ اور زیادہ پست ہو گا۔"

"نہیں ایسا نہیں، راہ سعی میں پیروں کا تھک جانا اس سے اچھا ہے کہ آرزوئے سعی میں دل ڈوب جائے۔"

"شاید ہو مگر میرا تجربہ اس کے خلاف ہے۔ میں تو اسی سعی ناکام کا کشتہ ہوں اور اب سعی، کوشش، عمل کے نام سے کانپتا ہوں۔ آپ نے دریافت کیا تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ میں وہاں جاتا ہوں جہاں انسان دنیا کے شور و شر سے امین، زندگی کی کشمکش سے محفوظ امن و عافیت سے دن گذار سکتا ہے۔ جہاں نہ اسے بھائیوں کی غفلت، جہالت، پستی، نکبت کے منظر آنکھوں سے دیکھنا پڑیں گے اور نہ ان کی نامہربانی، ناشکر گذاری، احسان فراموشی، کینہ پروری کے زخم سینے پر کھانا پڑیں گے، جہاں نہ وہ

اپنی قوم کے تنزل کے احساس سے تڑپے گا اور نہ اس کی اصلاح کی کوشش کرکے پچھتائیگا میں آبادی سے دور پہاڑوں پر جا رہا ہوں کہ وحدت کی ہومیائی سے ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑوں، خلوت کے دامن میں بکھری ہوئی طبیعت کو سمیٹوں، باہر کی دنیا سے آنکھ بند کرلوں۔ اور اندر کی دنیا کو آنکھ کھول کر دیکھوں۔"

"مگر یہ تو معلوم ہو کہ ہماری دنیا نے آپ کا کیا بگاڑا ہے۔ جو آپ اس سے اس قدر بیزار ہیں؟"۔

"سنیئے صاحب میرے لئے دنیا ہندوستان ہے اور یہی ہو سکتا تھا یہی وہ زمین ہے جس میں میری زندگی کی جڑیں پھیلی ہوئی ہیں، اور یہیں میرا شجرِ حیات پنپ سکتا تھا۔ اب آپ یہ پوچھیئے کہ ہندوستان نے میرا کیا بگاڑا ہے اس کا میں جواب دیتا ہوں مگر میرا دل یہ کہانی کہتے دکھتا ہے اور آپ کا دل اسے سن کر دکھے گا، آہ اس بدنصیب ملک نے مجھ سے وہ دولت چھین لی جو زندگی کا سہارا ہے۔ یعنی عقیدہ اور امید اور مجھے وہ چیز دے دی جو موت کا پیام ہے یعنی انکار اور مایوسی، جب میں نے اپنے آپ کو دل و جان سے اس کی خدمت کے لئے وقف کیا تھا۔ اس وقت میرا سینہ عقیدے کے نور سے معمور تھا۔ اور میرا دل امید کے ولولے سے لبریز۔ مجھے یقین تھا کہ ہندوستان والوں میں ایمان ہے، خلوص ہے، درد ہے، قابلیت ہے، ذہانت ہے، جفاکشی ہے، صبر ہے، استقلال ہے۔ صرف ہمت، عزم اور جوش کی کمی ہے

مجھے امید تھی کہ یہ چیزیں ذرا سی کوشش سے پیدا ہو جائیں گی جس طرح مستوں کیلئے ایک الاپ، دیوانوں کے لیے ایک ہو، عقلمندوں کے لیے ایک اشارہ کافی ہے۔ اسی طرح ہندوستانیوں کے لیے صرف ایک ترانۂ امید، ایک نعرۂ مستانہ چاہیئے۔ یہ آواز کانوں میں پہنچتے ہی وہ اُٹھ کھڑے ہوں گے، غلامی کا طوق اتار کر پھینک دیں گے، جہالت کی بیڑیاں توڑ کر رکھ دیں گے، اور پھر ہندوستان میں ایک عظیم الشان تمدن کی بنیاد پڑے گی جو ساری دنیا کے لیے باعث حیرت اور قابلِ تقلید ہو گا۔ یہ تھا میرا عقیدہ، یہ تھی میری امید۔

مگر افسوس کیا سمجھا تھا اور کیا نکلا۔ تصور اور واقعے میں اتنی نسبت بھی تو نہ تھی جتنی چیز میں اور اس کے سائے میں ہوتی ہے۔ میں اور مجھ جیسے دوسرے تکلیفیں اٹھا کر کڑیاں جھیل کر سارے ملک میں پھرے کہ سوتوں کو جگائیں، رہ نوردوں کو رہنماؤں کا پیام پہنچائیں۔ کچھ سونے والے اٹھے، کچھ مسافروں نے آگے قدم بڑھایا، ہمارا دل خوش ہوا، ہماری ہمت بڑھ گئی۔ مگر یہ اطمینان عارضی تھا، کیونکہ راہ کی دشواریوں نے چلنے والوں کے چھکے چھڑا دیئے۔ اور اس پر ستم یہ ہوا کہ کچھ رہنما راہزن نکلے۔ اور کچھ راہ سے نابلد، ان میں سے بعض اپنے پیرووں کو لوٹ کر چل دیئے اور بعض ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے۔ اور اس پر جھگڑنے لگے کہ داہنی کو مڑیں یا بائیں کو آگے

بڑھیں یا پیچھے ہٹیں۔ یہ نتیجہ ہوا سالہا سال کی کوشش کا۔ یہ پھل ملا مدتوں کی ریاضت کا۔ میں تو یہ دیکھ کر دل چھوٹ گیا، ہاتھ پیر شل ہو گئے، زبان بند ہو گئی۔ افسردگی دل و دماغ پر مسلط ہو گئی۔ مایوسی رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ میں نے سمجھ لیا کہ یہ ہندوستان ہمیشہ غفلت کی نیند سوتا رہے گا، غلامی کی ذلت اٹھاتا رہے گا، مجھ میں یہ جانکاہ نظارہ دیکھنے کی تاب نہیں اس لئے میں آبادی سے منہ موڑ کر کوہ و بیاباں کی طرف جا رہا ہوں۔ تاکہ کم سے کم اپنی روح کو اس ندامت اور پستی سے بچاؤں، اور تزکیۂ نفس و تصفیۂ قلب کے ذریعہ سے معرفت اور نجات حاصل کروں۔"

مجھے خوشی تھی کہ نوجوان کی آنکھوں سے فریبِ ہستی کا پردہ اٹھ گیا ہے لیکن یہ افسوس تھا کہ اس پر بجائے طیش کے یاس کا غلبہ ہو گیا ہے میں تو اسے یہ رائے دیتا کہ دنیا سے پیچھا چھڑانے کی جگہ دنیا کے پیچھے پڑ جائیے، سست قدم رہ نوردوں کو ملامت کرے اور جھوٹے رہنماؤں کی قلعی کھولے۔ بہر حال میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ پیر مرد پر اس گفتگو کا کیا اثر ہوا۔ اس لئے میں نے ذرا سا مڑ کر کنکھیوں سے ان کے چہرے کو دیکھا۔ میرا خیال ہے کہ ایک لمحے تک مجھے ہمدردی کے، افسوس کے، دکھ کے آثار نظر آئے۔ مگر فوراً ہی یہ کیفیت جاتی رہی اور وہی سکون و اطمینان اور خفیف سا تبسم جو پہلے تھا پھر نظر آنے لگا۔ انہوں نے نوجوان سے مخاطب ہو کر کہا:۔

"میں نے آپ کی داستان بہت غور سے سنی اور میرے دل پر اس کا بڑا گہرا اثر ہوا۔ مگر ایک بات میری سمجھ میں نہ آئی۔ جب آپ کا جذبۂ محبت سچا تھا تو آپ نے انجام کی فکر کیوں کی۔ پروانہ جس کی فطرت میں جلنا ہے کامیابی اور ناکامی سے غرض نہیں رکھتا۔ شمع جس کی سرشت میں گھلنا ہے، یاس اور امید کی پابند نہیں ہوتی۔ مستی میں یہ ہوشیاری کیسی؟ دیوانگی میں یہ تدبیر کیوں آپ کی طرف سے سعی اور خدا کی طرف سے اتمام، آپ نے اپنا کام کرنے کرتے خدا کے کام کی فکر اپنے سر کیوں لے لی؟"

"جناب انسان کو جس نے عشق دیا ہے اسی نے عقل بھی دی ہے اور تدبر تعقل، تفکر کی تاکید بھی کی ہے۔ انسان نہ پروانہ ہے کہ حسن سوزندہ کی ایک جھلک دیکھ کر دیوانہ وار جل مرے اور نہ شمع کہ عشقِ سوزاں کی ایک ادا پر گھل گھل کر مر مٹے۔ اس کی مستی ہوشیاری کے سہارے چلتی ہے۔ اس کی دیوانگی دانائی کے پیروں پر اُڑتی ہے۔ عشق انسان کے دل میں شوقِ منزل پیدا کرتا ہے اور ذوقِ سفر، عقل اسے راہ سجھاتی ہے اور اس کے لئے زادِ راہ فراہم کرتی ہے۔ میرا جذبۂ محبت تو خیر جیسا کچھ ہے میں جانتا ہوں لیکن میری عقل کہتی ہے کہ ملک وقوم کے بننے کی کوئی امید نہیں تو اپنی روح کو بچا اور اس کی بالیدگی کا سامان کر۔"

"الحمد للہ کہ آپ عقل کے قائل ہیں اور اسے عشق کا دست و بازو سمجھتے ہیں۔ ورنہ ہمارے اہلِ حال کے یہاں تو عقل بیچاری راندۂ درگاہ ہے اس لئے کہ وہ عشق

کی ضد سمجھی جاتی ہے۔ آپ نے جو کچھ ابھی فرمایا اس کے سبب سے گفتگو میں بڑی آسانی ہو گئی۔ عقل کا قدم درمیان رہے تو باہمی مفاہمت ممکن ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ آپ کی ہنگامۂ زندگی سے مایوسی اور گوشۂ خلوت کی طلب عقل پر مبنی ہے یا محض جذبات کے ردِ عمل کا نتیجہ ہے۔ پہلے اس یاس کو لیجئے۔ آپ کی باتوں سے یہ معلوم ہوا کہ آپ کو مایوسی خدانخواستہ نظامِ عالم اور قانونِ زندگی سے نہیں ہے۔ بلکہ انسانوں سے ہے، اپنے ملک کے انسانوں سے ہے اپنے ملک کے انسانوں سے آپ کو یہ بدگمانی نہیں کہ دنیا میں سعی اور عمل، خلوص و ایثار، پامردی اور استقلال کا پھل نہیں ملتا۔ بلکہ یہ گمان ہے کہ آپ کی قوم ان چیزوں سے محروم ہے۔ آپ کے دل میں یہ وسوسہ نہیں کہ رحمت ایزدی مستحقوں کو نہیں پہچانتی یا جان بوجھ کر ان سے روگردانی کرتی ہے بلکہ یہ خدشہ ہے کہ آپ کے بھائی اس رحمت کے مستحق نہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ اس اتھاہ مایوسی سے بچے ہوئے ہیں جو روح کے لئے دائمی موت ہے۔ مگر یہ دوسری قسم کی مایوسی یعنی اپنے ملک اور اپنی قوم کی طرف سے ناامیدی جو آپ کے سر پر منڈلا رہی ہے یہ بھی کچھ کم مہلک نہیں، اگر سچی ہو، مگر مجھے یقین ہے کہ یہ سچی اور پائیدار مایوسی نہیں بلکہ ایک عارضی افسردگی ہے جو جوش کی حد سے بڑھ جانے کے بعد پیدا ہوتی ہے اگر آپ تاریخ عالم کا مطالعہ کریں تو معلوم ہو کہ قوموں کی زندگی کے اتار چڑھاؤ کا اندازہ مہینوں اور برسوں سے نہیں، قرنوں اور صدیوں سے کیا جاتا ہے، ہندوستان

بلکہ ایشیا کی پچھلی نصف صدی کی تاریخ آپ کو یہ بتائے گی کہ اکثر قوموں میں خصوصاً مسلمانوں میں ایک عام بیداری پیدا ہوئی ہے۔ دُنیا کے اہلِ الرائے اس پر متفق ہیں کہ لوگ خوابِ غفلت سے چونک اُٹھے ہیں۔ ان کی رگوں میں زندگی کا خون جو اب تک منجمد تھا پھر گردش کر رہا ہے۔ انھوں نے راہِ عمل پر چلنا بلکہ دوڑنا شروع کر دیا ہے، ٹھوکریں کھاتے ہیں مگر پھر سنبھل جاتے ہیں۔ تھک کر بیٹھتے ہیں مگر پھر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں کوئی اس کا دعوےٰ نہیں کر سکتا کہ اسے انجام کا یقینی علم ہے بڑے سے بڑا دانشمند علامات پر حکم لگاتا ہے اور علامات سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ترقی کی لہر جو اُٹھی ہے یہ اب رُکنے والی نہیں، یہ لوگ جو اس راہ پر گامزن ہیں بہت بھٹکیں گے، بہت نشیب و فراز دیکھیں گے مگر کسی نہ کسی دن منزل پر ضرور پہنچیں گے۔ مسلسل کوشش کبھی رائگاں نہیں جاتی، زندگی کا یہ قانون ہے، دُنیا کا یہ دستور ہے، خدا کا یہ وعدہ ہے۔

آپ جس تحریک کی ناکامی کو رو رہے ہیں، وہ ایک بڑے سلسلے کی کڑی تھی۔ اس کا لوہا کمزور تھا جب زندگی کے جھٹکے پڑے تو ٹوٹ گئی۔ اس پر فریاد کرنا نادانی ہے اور اس سلسلے کو ناتمام چھوڑنا بزدلی ہے۔ لوہے کو کچھ دن آگ میں تپنے اور ہتھوڑے کی چوٹ کھانے

دیکھیے کہ وہ فولاد بن جائے، پھر کڑی پڑ جائے گی سلسلہ بڑھتا چلا جائے گا
اور توڑنے والوں کے چھکے چھوٹ جائیں گے۔"

"خدا آپ کو جزائے خیر دے۔ آپ تو اس وقت میرے حق میں مسیحا ہو گئے
آپ کی باتوں کا جو اثر دل پر ہوا ہے اس کا پورا اندازہ تو بعد میں ہو گا مگر اس
وقت معلوم ہو رہا ہے کہ جیسے تیز بخار بعد مدت کے اترا ہو۔ مایوسی کی کیفیت
میرے دل سے تقریباً بالکل جاتی رہی اور امید کا ایک ہلکا سا رنگ چھا گیا۔
مگر یہ تو فرمائیے کہ میں اب کیا کروں؟ جو قصد کر چکا ہوں اسے چھوڑنے کو جی
نہیں چاہتا۔ مگر یہ خیال ہوتا ہے کہ صحرا نوردی کی ایک مدت معین کر لوں اور اسے
پورا کر کے واپس آؤں۔ آپ فرماتے ہیں کہ لوہے کو فولاد بننا چاہیے لیکن لوہا اگر
زنگ آلودہ ہو تو اس پر صیقل کرنے کی ضرورت ہے اور اس کی صورت یہی
نظر آتی ہے کہ انسان کچھ دن تنہائی میں ریاضت کرے۔ دنیا کی آلائشوں میں
رہ کر تو یہ کثافت دور نہیں ہوتی۔"

"آپ کا یہ حسن ظن جو میرے حق میں اور خود اپنے حق میں ہے صحیح نہیں
آپ کا بخار اگر اترا ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ خود آپ کی طبیعت میں مرض
کو دفع کرنے کی قوت موجود تھی۔ اور ایک ذرا سا سہارا ڈھونڈتی تھی۔ آپ کی
مایوسی اگر دور ہوئی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے نیچے امید کی نہ ابھرنے کو مستعد
تھی اور ایک ہلکی سی چھیڑ کی منتظر تھی۔ ۔ ۔ ۔ میں نے طبیب کا کام نہیں کیا بلکہ

ایک معمولی تیمار دار کا۔ اب رہا آپ کا یہ خیال کہ آپ تنہائی کی زندگی میں محض اپنی قوت سے تزکیۂ نفس کے ہفتخواں کو طے کر لیں گے یہ بہت بڑا دھوکا ہے جس منزل کو آپ ابتدائی منزل سمجھتے ہیں یہ آخری منزل ہے۔ خلوت کے سکون کا انعام اسی کو ملتا ہے جو جلوت کی سعی کے امتحان میں پورا اتر چکا ہو۔ لوہے کا زنگ وہی زندگی کی آگ دور کر سکتی ہے جو اسے فولاد بناتی ہے۔ اس کے بعد کہیں وہ وقت آتا ہے کہ فولاد جلا پلتے پاتے شیشہ بنے، جو خام کار ابتدا میں تنہائی اختیار کرتے ہیں ان کے دل کا زنگ دور نہیں ہوتا۔ بلکہ ہوائے نفس سے اور گہرا ہو جاتا ہے وہ ادنیٰ خواہشات و جذبات کی مستی کو نشہ، غرور نفسانی کو تمکین، روحانی خودی کو خدا سمجھنے لگتے ہیں، خدا تک پہنچنے کا کوئی چھوٹا سا راستہ نہیں۔ ہر سالک کو زندگی اور دنیا کی سنگلاخ راہوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ بے شک اس راہ میں راہزن بھی ہیں مگر اسی کے ساتھ رہنما بھی ہیں، ہر انسان اپنا اور دوسروں کا راہزن ہو سکتا ہے مگر راہنما بھی ہو سکتا ہے۔ یہی خیر و شر کا امکان زندگی ہے۔ یہی دنیا ہے ما کمزور دل اس دگدے سے کانپتے ہیں مگر مضبوط دل اس میں یکسوئی ڈھونڈھ نکالتے ہیں۔ آپ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ آپ کو کیا کرنا چاہیئے۔ میں مفصل جواب دیتا مگر وقت کم ہے۔ یہ اسٹیشن جو آنے والا ہے اسی پر مجھ کو اترنا ہے۔ وہ دیکھیئے سگنل گذر گیا۔ اب صرف چند منٹ باقی ہیں اس لئے میں آپ کے سوال کے جواب میں ایک شاعر کے چند شعر پڑھتا ہوں جس نے زندگی کے راز کو سمجھا بھی اور اپنی زبان

میں سمجھا بھی دیا۔" سنئے ؎

کاٹئے دن زندگی کے ان یگانوں کی طرح
جو سدا رہتے ہیں چوکس پاسبانوں کی طرح

سعی سے اکتاتے اور محنت سے کنیاتے نہیں
جھیلتے ہیں سختیوں کو سخت جانوں کی طرح

رسم و عادت پر ہیں کرتے عقل کو فرماں روا
نفس پر رکھتے ہیں کوڑا حکمرانوں کی طرح

شادمانی میں گذرنے اپنے آپے سے نہیں
غم میں رہتے ہیں شگفتہ شادمانوں کی طرح

رکھتے ہیں تمکیں جوانی میں بڑھاپے سے سوا
رہتے ہیں چونچال پیری میں جوانوں کی طرح

پاتے ہیں اپنوں میں غیروں سے سوا بیگانگی
پر بھلا تکتے ہیں اک کا یگانوں کی طرح

آس کھیتی کے پنپنے کی انھیں ہو یا نہ ہو!
ہیں اسے پانی دیئے جاتے کسانوں کی طرح

کام سے کام اپنے ان کو گو ہو عالم نکتہ چیں
رہتے ہیں بتیس دانتوں میں زبانوں کی طرح

طعن سن سن احمقوں کے ہنستے ہیں دیوانہ وار
دن بسر کرتے ہیں دیوانوں میں سیانوں کی طرح

لیجئے وہ اسٹیشن آگیا۔ اب میں جاتا ہوں خدا حافظ، میں آپ سے یہ نہیں پوچھتا کہ آپ نے اپنا قصد بدلا یا نہیں کیونکہ جب میں نے آپ کو خدا کی حفاظت میں دے دیا تو پوچھنے کی ضرورت کیا اور میں پوچھنے والا کون، آیئے مصافحہ کر لیجئے، خدا حافظ۔"

یہ کہہ کر پیر مرد نے اپنا ہینڈ بیگ سنبھالا اور گاڑی سے اتر کر چل دیئے مجھے بھی اس اسٹیشن پر اتر کر گاڑی بدلنا تھی۔ میری گاڑی سامنے کھڑی تھی۔

صرف پلیٹ فارم درمیان میں تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ذرا ٹھہر کر کسی طرح
کرلوں کہ نوجوان کا ارادہ اب کیا ہے مگر اتنے میں میری گاڑی نے سیٹی د
میں مجبوراً اترا اور دوڑ کر بد حواسی میں ایک دوسرے درجہ کے ڈبہ میں گھس گ
چلتے چلتے میں نے دیکھا کہ نوجوان سر جھکائے گہری فکر میں ڈوبا ہوا بیٹھا
اور موٹے مسافر کھڑکی سے سر نکالے اپنے لحن شادی میں جانے والے کو
رہے ہیں۔

منگواتے تھے۔ مولوی صاحب کوئی اخبار خریدتے نہیں تھے مگر اسکول کے دار المطالعہ میں جتنے اردو اخبار آتے تھے سب کو پڑھا کرتے تھے۔ بابو صاحب کو کتب بینی کا شوق نہ تھا۔ اخبار کے علاوہ اگر وہ کچھ پڑھتے تھے تو اپنے صوبہ کی سول لسٹ۔ مولوی صاحب کے مطالعہ میں کوئی نہ کوئی موٹی سی عربی کی کتاب ضرور رہا کرتی تھی۔ بابو صاحب کو سوائے اصلاح معاشرت کے کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی۔ مولوی صاحب کو علاوہ دینیات کے علمی اور سیاسی مسائل سے بھی شغف تھا۔ اور انھیں بھی وہ دینیات کا جزو سمجھتے تھے۔ بابو صاحب اپنے آپ کو آزاد خیال اور مولوی صاحب کو تنگ نظر اور متعصب سمجھتے تھے۔ مولوی صاحب اپنے آپ کو مسلمان اور بابو صاحب کو ملحد کہتے تھے۔

باوجود ان اختلافات کے بابو صاحب اور مولوی صاحب میں بڑی گہری دوستی تھی، دونوں ایک ہی مکان میں رہتے تھے جس میں زنانے کے دو الگ حصے تھے۔ مگر مردانہ مشترک تھا۔ مردانے میں غسلخانے، پاخانے اور نوکروں کی کوٹھری کے علاوہ چار بڑے کمرے تھے جن میں سے ایک بابو صاحب کی نشستگاہ کا کام دیتا تھا، اس میں دری بچھی تھی اور چند بید کی کرسیاں اور چند مونڈھے، دوسرا بابو صاحب کے مطالعہ کا کمرہ تھا جس میں ایک میز تھی اور دو کرسیاں، میز پر لکھنے کا سامان، دفتر کی مسلیں، تار اور منی آرڈر وغیرہ کے فارم، سول لسٹ اور ریل کا ٹائم ٹیبل، سب چیزیں قرینے سے رکھی رہتی تھیں، تیسرے کمرے میں مولوی صاحب رہتے تھے۔ اس میں آدھے کمرے

دو عینکیں

بابو صاحب علی گڑھ کے گریجویٹ تھے اور کچہری میں منصرم تھے، مولوی صاحب اپنے استاد مرحوم کے شاگرد تھے اور گورنمنٹ اسکول میں ہیڈ مولوی تھے، بابو صاحب دُبلے پتلے آدمی تھے، ڈاڑھی منڈاتے تھے۔ موچھیں اتنی بڑی رکھتے تھے کہ دودھ کی بالائی ان میں اٹک کر رہ جاتی تھی۔ مولوی صاحب فربہ اندام تھے، ان کی ڈاڑھی عرض میں زنخداں تک محدود تھی مگر طول میں بہت دور تک پہنچی تھی۔ موچھیں صاف رہتی تھیں، یخنی، حریرہ، ہریسہ، الغرض کسی چیز کے پینے میں دقت نہ ہوتی تھی۔ بابو صاحب گھر پر قمیص اور ڈھیلا پاجامہ پہنا کرتے تھے۔ اور دفتر میں سوٹ سے مشابہ جو ایک چیز چھاؤنی کا درزی انھیں سی کر دیا کرتا تھا۔ مولوی صاحب گھر پر اور مدرسہ میں ہر جگہ نیچا کرتہ اور اونچی اتار پہنتے تھے۔ جو ان کی بیوی سیتی تھیں۔ بابو صاحب ولایتی چشمہ لگاتے تھے، جس کی کمانی پر سونے کا ملمع تھا۔ مولوی صاحب بہت موٹے شیشے کی عینک استعمال کرتے تھے جس میں بٹا ہوا دھاگا کمانی کا کام دیتا تھا۔

بابو صاحب پہلے لیڈر کے خریدار تھے۔ مگر جب پانیر کا چندہ کم ہوگیا، پانیر

میں چٹائی پر ایک بوسیدہ چاندنی بچھی ہوئی تھی صدر میں ایک میلا سا گاؤ تکیہ رکھا تھا اس کے آگے چار پانچ آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ چھوڑ کر سو سوا سو کتابیں بے ترتیبی سے پھیلی ہوئی تھیں کمرے کے بقیہ نصف حصے میں نماز کی چوکی تھی اور ایک تخت جس پر مولوی صاحب کے کپڑے اور گھر کی بہت سی چیزیں جن کے رکھنے کا کہیں ٹھکانا نہ تھا، پڑی رہتی تھیں چوتھے کمرے میں بابو صاحب کا لڑکا اور مولوی صاحب کا لڑکا جو ہم عمر تھے اور گورنمنٹ اسکول میں ایک ہی جماعت میں پڑھتے تھے اور رہا کرتے تھے۔

مولوی صاحب دونوں لڑکوں کے ساتھ مدرسے سے ساڑھے چار بجے واپس آیا کرتے تھے اور ساڑھے پانچ بجے تک عصر کی نماز سے اور سہ پہر کے ناشتہ سے فارغ ہو جاتے تھے۔ اس وقت بابو صاحب اپنے دفتر سے لوٹتے تھے بابو صاحب کا معدہ کمزور تھا اس لئے وہ سہ پہر کو ناشتہ نہیں کرتے تھے، دفتر سے لوٹ کر وہ منہ ہاتھ دھوتے تھے اور پھر اپنے نشست کے کمرے میں یا گرمی کے دن ہوں تو صحن میں ایک تکیہ دار مونڈھے کے سامنے ایک تپائی رکھ کر دراز ہو جاتے تھے، مولوی صاحب بھی آ بیٹھتے تھے اور محلے کے بعض احباب بھی جمع ہو جاتے تھے، مغرب تک یہیں نشست رہتی تھی مختلف مسائل پر گفتگو ہوتی تھی جس میں مولوی صاحب بہت زیادہ اور بابو صاحب بہت کم حصہ لیتے تھے اس کے بعد مولوی صاحب اور دوسرے حضرات جو نماز کے پابند تھے محلے کی مسجد میں مغرب کی نماز پڑھنے چلے جاتے تھے اور بابو صاحب اور یاران بے نماز بدستور باتیں کرتے

رہتے تھے. مولوی صاحب کے مسجد سے واپس آنے پر سب احباب رخصت ہوجاتے تھے اور مولوی صاحب اور بابو صاحب اور دونوں لڑکے سب مل کر کھانا کھاتے تھے، کھانا کھا کر بابو صاحب اپنے مطالعہ کے کمرے میں مطالعہ کرتے تھے عشا کی نماز مولوی صاحب گھر پر پڑھتے تھے۔ اور نماز سے فارغ ہو کر گھر میں آرام کرنے چلے جاتے تھے۔ بابو صاحب کو بارہ بجے کے قریب سونا نصیب ہوتا تھا۔ مولوی صاحب صبح کو تڑکے اُٹھتے تھے۔ نماز اور تلاوت قرآن سے فارغ ہو کر ٹہلنے جاتے تھے۔ وہاں سے واپس آکر دونوں لڑکوں اور بعض طالب علموں کو عربی و فارسی اور دینیات کی کتابیں پڑھاتے تھے۔ بابو صاحب ساڑھے سات بجے بیدار ہوتے تھے۔ اور ناشتہ کرتے ہی جج صاحب کے گھر چلے جاتے تھے۔ کیونکہ دفتر کے وقت سے پہلے انھیں وہاں بھی کام کرنا پڑتا تھا۔

یوں تو بابو صاحب اور مولوی صاحب میں روز شام کو باتیں ہوتی تھیں۔ لیکن چونکہ بابو صاحب ذرا محتاط اور خود دار آدمی تھے۔ اسلئے اور لوگوں کی موجودگی میں اپنے اصلی خیالات ظاہر کرنا وہ خلافِ مصلحت اور خلافِ شان سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ مولوی صاحب کا مزاج بہت تیز تھا۔ اور جب ان سے اور کسی شخص سے مجمع میں گفتگو ہوتی تھی تو ذرا سی دیر میں گفتگو مناظرہ بن جاتی تھی۔ اور مناظرہ مجادلے کی صورت اختیار کرلیتا تھا۔ برخلاف اس کے جب وہ کسی سے تنہائی میں باتیں کرتے

تھے تو ان کا رویہ اوّل سے آخر تک عدم تشدد کا رہتا تھا۔ اس لئے بابو صاحب ان سے اگر کبھی کھل کر باتیں کرتے تھے تو اتوار سے پہلی رات کو جب ان دونوں کے سوا کوئی تیسرا نہیں ہوتا تھا۔ اس رات عموماً دونوں صاحب کام نہیں کرتے تھے اور اکثر کھانے کے بعد دو ایک گھنٹے تبادلہ خیالات میں صرف کرتے تھے۔ موضوع بحث عموماً معاشرت کے مسائل ہوتے تھے کیونکہ بابو صاحب کسی اور مبحث سے ذوق نہیں رکھتے تھے۔

اس تبادلۂ خیالات کی عجیب شان ہوتی تھی۔ دوران گفتگو میں مولوی صاحب ٹکٹکی باندھ کر چھت کی طرف دیکھتے تھے۔ اور ان کی آنکھوں کی چمک سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُن کی نظر نامحدود فضا سے گزر کر آسمانی بلندیوں کی سیر کر رہی ہیں اور بابو صاحب بڑے گہرے غور و فکر کے انداز سے فرش پر نظر جما دیتے تھے۔ گویا طبقات ارض کے نیچے تحت الثریٰ کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ دونوں عجب محویت کے عالم میں باری باری سے گفتگو کرتے تھے۔ اور بیچ بیچ میں بابو صاحب اپنے رومال سے اور مولوی صاحب اپنے کرتے کے دامن سے عینک صاف کرتے جاتے تھے۔ اس حالت میں کوئی اُنھیں دیکھتا تو یقیناً یہ سمجھتا کہ ان دونوں حضرات کے پیش نظر یہ زندگی اور یہ دنیا نہیں ہے۔ بلکہ ان میں سے ہر ایک اپنی عینک کی مدد سے کسی اور طلسمی عالم کا نظارہ کر رہا ہے۔ اور دوسرے کے سامنے اپنے منظر کا نقشہ کھینچ رہا ہے۔ ان دونوں

کے طرزِ گفتگو سے اس خیال کو اور تقویت ہوئی تھی۔ مثلاً بابو صاحب حکیمانہ شان سے پیشانی پر شکنیں ڈال کر فرمایا کرتے تھے "مجھے یہ نظر آرہا ہے کہ ایشیا جہالت اور تعصب کی زنجیروں کو توڑ کر آزاد ہو گیا ہے اور اصلاح و ترقی کی شاہراہ پر تیزی سے قدم بڑھا رہا ہے۔ قدامت پرستی اور تنگ نظری قصۂ پارینہ ہو گئی ہے۔ روشن خیالی کا دور دورہ ہے۔ تہذیب و تمدن کا چاند جو مغرب سے طلوع ہوا تھا مشرق کی تاریکی کو آہستہ آہستہ دُور کر رہا ہے۔ اس کی چاندنی کا دریا دو طرف سے بڑھ رہا ہے۔ امریکہ کی طرف سے اور یورپ کی طرف سے اور ظلمتِ شرق اس سیلاب میں غرق ہوتی جاتی ہے۔ جاپان اس نور سے منور ہو چکا ہے اور چین اب منور ہو رہا ہے، ترکی اور مصر اس کی تابانی سے جگمگا اٹھے ہیں۔ ایران، شام اور عراق وسط ایشیا اور افغانستان کی نظریں اس کی درخشانی سے خیرہ ہو رہی ہیں۔ ہندوستان پر اس کی کرنیں مدت سے پڑ رہی ہیں اور اس کی روشنی سارے ملک میں پھیل چکی ہے لیکن چونکہ یہاں کی فضا میں غیر معمولی تاریکی ہے۔ اس لئے یہ چاندنی اب تک دھندلی ہوئی ہے۔ جیسے جیسے دن گزرتے جائیں گے اندھیرا چھٹتا جائے گا۔ اور چاند کی روشنی اجلی ہوتی جائے گی"۔ مولوی صاحب یہ سنکر تھوڑی دیر خاموش رہتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کے چہرے پر عارفانہ جبروت کے آثار ظاہر ہوتے تھے۔ اور ان کی زبان یوں شعلہ فشانی کرتی تھی "میں یہ

دیکھ رہا ہوں کہ ایشیا یورپ کی تقلید میں آنکھ بند کرکے ہلاکت کے غار میں گرنے کو تیار ہے۔ عقل شیطانی کے غرور میں ڈوبا ہوا ہے علم انسانی کے نشے میں بدمست وہ خدا کے بتائے ہوئے قوانین کو پامال کر رہا ہے اور بہائم کی طرح شرم و حیا کی رسیاں تڑا کر ہوائے نفس کے میدان میں بھاگا چلا جاتا ہے۔ کفر و الحاد کی ایک آگ بھڑک اٹھی ہے۔ جو ایمان اور عقیدے کے خرمن کو پھونکے ڈالتی ہے۔ اس کی چمک کو نور کہنا نور کی توہین ہے۔ چین و جاپان روم و روس۔ ایران و افغانستان سب کی آنکھوں میں چکاچوند ڈال دی ہے۔ اور اُس کی آنچ نے سب کے منہ کو جھلس دیا ہے۔ اس کے شعلے ہندوستان میں زمین کے اندر اندر پھیل رہے ہیں۔ اور ایک دن سارے ملک کو جلا کر خاک کر دیں گے۔ وہ خدا جس نے ابراہیم پر آگ کو گلزار کر دیا تھا، اگر چاہے تو اس بدنصیب ملک کو بچا سکتا ہے۔ اور اپنے برگزیدہ بندوں کو یہ قوت دے سکتا ہے کہ دہریت کی آگ کو اپنے پیروں سے کچل کر بجھا دیں ؎

بابو صاحب یہ سنکر ذہنی تفوق کے احساس سے مسکراتے تھے اور کہتے تھے "دنیا میں جہالت کی قوتیں ہمیشہ مذہب کے نام سے ترقی اور اصلاح کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنا چاہتی ہیں۔ مگر

کبھی کامیاب نہیں ہوتیں۔ مجھے وہ دن نظر آرہا ہے۔ جب لوگوں کی آنکھوں سے توہمات کے پردے اُٹھ گئے ہیں اور وہ دیکھ رہے ہیں کہ اُن کے دینی پیشواؤں نے انھیں صدیوں تک گمراہی میں مبتلا رکھا۔ اپنی کوتاہ بینی اور بزدلی سے انھیں خدا کی بہترین نعمتوں سے فائدہ نہ اُٹھانے دیا۔ دھوکے کا طلسم ٹوٹنے کے بعد یہ فریب خوردہ بھیڑیں شیریں بن گئی ہیں۔ اور فریب دینے والوں کو غضب ناک تیور سے گھور رہی ہیں۔ اس کے بعد جو کچھ ہوتا ہے اُسے دیکھ کر دل ہلتا ہے۔ اور اُسے بیان کرتے ہوئے زبان کانپتی ہے۔"

اب مولوی صاحب کا چہرہ روحانی طیش سے سرخ ہو جاتا تھا۔ اور اُن کی آواز سارے کمرے میں گونجتی ہوئی سنائی دیتی تھی ــــ "روزِ ازل سے شیطان اور اس کے ترقی یافتہ پیرو اصلاح کے بہانے سے احکامِ خداوندی سے سرکشی کرتے آئے ہیں۔ مگر ان کا انجام دائمی ذلت اور ابدی ہلاکت کے سوا کچھ نہیں۔ میں وہ دن دیکھ رہا ہوں جب لوگوں کے اعمال میزانِ عدل میں تولے جا رہے ہیں۔ اور انھیں بقدرِ استحقاق جزا اور سزا مل رہی ہے۔ بندوں کو خدا کی راہ سے ہٹانے والے ان کے دلوں میں نافرمانی اور غرور کا بیج بونے والے کیفرِ کردار کو پہنچ رہے ہیں۔ جہنم کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کی زبانیں ایندھن

مانگ رہی ہیں۔ اس کے بعد جو آنکھوں کے سامنے گزرتا ہے اس سے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ اور روح لرزتی ہے"

اس نقطے پر پہنچکر گفتگو عام مباحث سے ہٹ کر ذاتی مسائل پر آجاتی تھی۔ دونوں حضرات بہ تقاضائے دوستی ایک دوسرے کے عیوب اور نقائص گنانے لگتے تھے۔ اور حق گوئی میں اس قدر اہتمام کرتے تھے۔ کہ حق کی تلخی کام و دہن کے لئے اور اس کی بو شام جان کے لئے ناقابلِ برداشت ہوتی جاتی تھی۔

ایک بار جمعے کے دن مولوی صاحب نے اپنے لڑکے کو مارا۔ کیونکہ اُس نے نہانے میں دیر کر دی اور نمازِ جمعہ میں شامل نہ ہو سکا۔ اور اتفاق سے بابو صاحب نے بھی اُسی دن اسکول دیر سے پہنچنے کے قصور میں اپنے نورِ عین کی گوشمالی کی۔ سنیچر کے دن صبح کو دونوں لڑکوں نے آپس میں صلاح کر کے ان پدرانہ مظالم کا انتقام اس طرح لیا کہ مولوی صاحب اور بابو صاحب دونوں کی عینکیں خدا جانے کہاں چھپا دیں۔ کہ لاکھ ڈھونڈھا مگر نہ ملیں۔ عینک نہ ہونے سے دونوں کو دن بھر بڑی دقتوں کا سامنا ہوا۔ مولوی صاحب لڑکے سے درسی کتابوں کا آموختہ نہ سن سکے۔ اور انھیں اس پر قناعت کرنا پڑی۔ کہ صرف و نحو کے پیچیدہ

مسائل زبانی سمجھائیں اور لڑکوں کی سمجھ میں کچھ نہ آئے تو تمھی سے انکی تشریح کریں۔ اُدھر بابو صاحب کو مسلیں ایک محرر سے پڑھوا کر سننا پڑیں۔ جس میں بہت وقت ضائع ہوا، اور جج صاحب کے سامنے کاغذات پر دستخط کرانے وہ اس دن نہ جا سکے۔ شام کو واپسی کے بعد دونوں صاحبوں نے پھر عینکیں تلاش کیں۔ مگر کہیں پتہ نہ چلا۔ مجبوراً یہ فیصلہ کیا کہ اگلے دن تعطیل ہے۔ بازار جا کر دوسری عینکیں خرید لائیں گے۔

کھانے کے بعد حسبِ معمول دونوں حضرات بابو صاحب کی نشستگاہ میں جلوہ افروز ہوئے۔ اور پھر وہی ہفتہ وار باتیں چھڑ گئیں۔ پہلے تو کچھ یونہی سی ردوبدل ہوتی رہی۔ پھر رفتہ رفتہ دونوں گرمانے لگے اور اپنی اپنی جگہ سنبھل کر بیٹھ گئے۔ بابو صاحب کی نظر فرش پر جم گئی۔ اور انھوں نے چہرے کو فلسفیانہ ساز و سامان سے آراستہ کرکے اُسی پرانے انداز میں گفتگو کرنا چاہی۔ مگر خدا جانے عادت کا اثر تھا یا کوئی اس سے زیادہ گہرا بھید کہ پہلا لفظ منہ سے نکالتے ہی بابو صاحب کا رومال والا ہاتھ عینک کو تلاش کرتا ہوا آنکھ تک پہنچا۔ اور جب عینک نہ ملی تو گھبراہٹ طاری ہوگئی۔ انکے ہاتھ پیر کانپنے لگے۔ ان کی زبان رُکنے لگی: "مجھے یہ نظر آتا ہے......

مجھے .... یہ .... مجھے کچھ نظر نہیں آتا .... اندھیرا
.... ہے .... ہر طرف .... اندھیرا۔"

بابو صاحب کی یہ حالت دیکھ کر مولوی صاحب بھی سراسیمہ ہو گئے۔ اُن کے کرتے کا دامن اٹھا اور آنکھ کی طرف بڑھا۔ مگر وہاں عینک کہاں تھی۔ ان کی زبان بھی لغزش کرنے لگی "میں یہ دیکھتا ہوں ۔میں .... دیکھتا ...... میں .... مجھے .... کچھ .... دکھائی نہیں۔ دیتا ..... کچھ ہے ۔مگر۔ خدا۔ جانے کیا۔"

کامیابی

سلیم، بی، اے کے امتحان سے فارغ ہو کر سیدھا گھر آیا۔ گھر کے نام سے دل میں سکون، آرام، محبت کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ مگر سلیم کا گھر ٹھیکے پر بنا ہوا کرایہ کا مکان تھا۔ جس کے مستقل مکین دو تھے۔ ایک سلیم کے محرور المزاج والد دوسرے ان کا مخبوط الحواس نوکر۔ ان میں سے والد بزرگوار حج اور زیارات کو گئے ہوئے تھے۔ البتہ نوکر نقد موجود تھا۔ سلیم کو اس مکان کے نام سے وحشت ہوتی تھی مگر کرتا کیا اس کے سوا اور کوئی ٹھکانا ہی نہیں تھا۔ وہ غریب باپ کا غیور بیٹا تھا۔ اس کے دوست کم تھے اور وہ بھی اسی کی طرح غریب تھے۔ ان میں سے کسی کو یہ مقدرت نہ تھی کہ اسے زیادہ دن اپنے یہاں مہمان رکھ سکتے۔ اور اگر ہوتی بھی تو وہ اسے خود کیسے گوارا کرتا۔ غرض امتحان کا آخری پرچہ کرتے ہی، اس نے بستر باندھا اور آغازِ مئی کی دھوپ میں تپتا اور لُو میں جُھلستا ہوا وہ اپنے مامن پہنچا۔ میاں بدھو نے بڑی

گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا شربت پلایا پنکھا جھلا اور ایک ایک لفظ کے کئی جملوں میں اس کی خیریت پوچھی۔ جب کبھی وہ تعطیل میں گھر آتا، میاں بدھو ازراہِ محبت یہ کہا کرتے تھے کہ تم دبلے ہو گئے ہو۔ اس کی وجہ یہ سمجھتے تھے کہ کالج میں ان کے ہاتھ کا پکایا ہوا کھانا نہیں ملتا۔ اور دوسری یہ کہ "مولوی صاحب" یا میاں جی "بچے" کو ٹھونکتے بہت ہیں۔

دو رات دن تو سلیم کو سونے میں گزر گئے۔ نیم خوابی کی حالت میں وہ منہ ہاتھ دھونے اور کھانا کھانے کو اٹھتا تھا اور پھر سو جاتا تھا۔ تیسرے دن سے "کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی" کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس شہر میں اس کے والد تھوڑے ہی دن پہلے آئے تھے۔ اس لئے اس کا جاننے والا دو چار آدمیوں کے سوا کوئی نہ تھا۔ اس کے ایک رشتے کے خالو تحصیل میں سیاہہ نویس تھے۔ ان کے گھر روز شام کو جایا کرتا تھا۔ خالہ سے اپنی والدہ مرحومہ کی تعریف اور اپنے والد مدظلہ کی برائیاں سنتا تھا۔ خالو کے سیاہے کی میزان جوڑتا تھا۔ ان کے بڑے لڑکے کو سبق پڑھاتا تھا اور چھوٹے بچے کو کھلانے کی کوشش کرتا تھا۔ ایک پرانے ہم سبق کے یہاں چلا جاتا تھا جو اپنے خاندان کی لڑائیوں کے

قصّے سنایا کرتے تھے۔ اور کبھی ایک نئے واقف کار کے یہاں جو اپنے نوکر کی نمک حرامی کی شکایت کیا کرتے تھے۔ ان کے علاوہ اسکے شناساؤں میں ایک مرزا صاحب اور تھے۔ ان کی صحبت کسی قدر دلچسپ تھی۔ مگر ایک تو ان کا گھر دُور تھا۔ دوسرے وہ اس قدر قوی ہیکل اور ورزشی آدمی تھے کہ سلیم کو ان کے سامنے اپنے نحیف جثہ پر شرم آتی تھی مصیبت اور یہ تھی کہ اوپر سے وہ اور نصیحت کے رَدّے جماتے تھے۔ خیر یہاں تک بھی غنیمت تھا۔ وہ تلقین سے آگے بڑھ کر تعلیم شروع کر دیتے تھے۔ اور سلیم کو ان کے ساتھ جسم کو عجیب عجیب مضحک طریقوں سے توڑنے مروڑنے کی مشق کرنی پڑتی تھی جس سے اس کا کچومر نکل جاتا تھا۔ اور کئی کئی دن بدن میں درد رہتا تھا۔ اس لئے ان سے ملنے سے اس کی طبیعت رُکتی تھی۔ زیادہ وقت وہ کتب بینی اور خیالی پلاؤ پکانے میں صرف کرتا تھا۔

اسی طرح دو مہینے گزر گئے۔ اب امتحان کا نتیجہ نکلنے والا تھا۔ اور سلیم اس کے انتظار میں بے چین رہتا تھا۔ وہ بڑا ذہین اور محنتی طالب علم تھا۔ انٹرنس اور ایف اے اول درجے میں پاس کیا تھا۔ بی۔ اے میں بھی اس کے پرچے بہت اچھے ہوئے تھے اور قاعدے سے اُسے اوّل درجہ ملنا چاہیئے تھا۔ مگر ممتحنوں کی نسبت اس نے

سنا تھا کہ وہ امتحان کے پرچے ایسے دیکھتے ہیں جیسے دیوان حافظ میں فال دیکھی جاتی ہے۔ اس لئے نتیجہ کی طرف سے اسے پورا اطمینان نہیں تھا۔ نوجوانی کا ناہموار تخیل اور تلاطم اُسے امید و یاس کی اٹھتی گرتی لہروں میں بہائے لئے جا رہا تھا۔ مگر انتظار یونہی کیا کم سخت ہے پھر جب اس کے ساتھ بے اطمینانی بھی شامل ہو جائے تو اس کی شدت کا کیا پوچھنا۔ سلیم کے ایک دوست نے جو الہ آباد میں رہتے تھے وعدہ کیا تھا کہ جب نتیجہ معلوم ہوگا تو اسے تار دیں گے۔ کئی روز سے وہ سوتے جاگتے ہر وقت تار کی فکر میں رہا کرتا تھا۔ خدا جانے کتنے چکر اس نے تار گھر کے لگائے۔ اس کے والد اُسی ڈاک خانے میں ملازم تھے جس کے ساتھ یہ تار گھر تھا۔ اس لئے تار بابو اُسے پہچانتے تھے۔ پھر بھی اُسے یہ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ اس کے نام کا کوئی تار آیا ہے۔ وہ سامنے سڑک پر بے پروائی کے انداز سے ٹہلتا رہتا تھا اور جب کوئی چپراسی سرخ بائیسکل پر نکلتا تو اس کی طرف کنکھیوں سے دیکھتا تھا کہ شاید اس کے پاس میرا تار ہو اور یہ مجھے مخاطب کرے۔ دیر تک انتظار کرنے کے بعد وہ بڑی حسرت سے اپنے دل میں کہتا تھا کہ تار پر تار چلا آتا ہے۔ پر میرے نام کا ایک بھی نہیں۔ تار آتا ہے پر نہیں آتا۔

آج صبح سے اس نے نقشہ بدل دیا تھا۔ بجائے تار گھر کے سامنے سعی کرنے کے وہ معتکف ہو کر گھر پر بیٹھ گیا اور کتب بینی میں وقت گزارنے لگا۔ مگر دل اسی طرف لگا ہوا تھا۔ ایک بجے کے قریب وہ کھانا کھانے بیٹھا۔ کھانے میں صرف ماش کی دال اور روٹی تھی۔ اسلئے کہ گوشت بقول بدھو کے بلّی کھا گئی تھی۔ یہ حادثہ اکثر پیش آیا کرتا تھا۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ بلّی گوشت اُسی دن کھاتی تھی جس دن میاں بدھو کی افیم ختم ہو جائے۔ بدگمانی بری چیز ہے۔ اس لئے ہم یہ تاویل کرتے ہیں کہ افیون ان کے ہوش کی کنجی تھی۔ جس دن چُسکی نہ ہو اُس دن وہ غافل ہو جاتے تھے اور حریف جو ہر وقت گھات میں رہتا تھا اپنا کام کر جاتا تھا۔ گوشت کے نہ ہونے کی تلافی میاں بدھو نے یہ کی تھی کہ دال کو بگھار کر اوپر سے کتری ہوئی ادرک، پیاز۔ ہری مرچ کی تہ جما دی تھی۔ بدھو کھانا رکھ کر بیٹھے تھے اور سلیم نے نوالہ توڑنے کو ہاتھ بڑھایا تھا کہ باہر سے آواز آئی "تار لے جاؤ"۔ تڑپ کر اُٹھنا جھپٹ کر دروازے پر پہنچنا، سنبھل کر اپنے اضطراب کو چھپانا، تار لے کر رسید کے فارم پر دستخط کرنا، چپراسی سے نہ کچھ کہنا نہ سننا، کمرے میں آ کر لفافہ چاک کرنا۔ یہ سب بے خبری کے عالم میں چند لمحے کے اندر ہو گیا۔ "اوّل درجہ مبارک باد" یہ چار لفظ آنکھوں

کے رستے دماغ میں پہنچے اور بجلی کی رو کی طرح رگ و پے میں دوڑ گئے۔ خوشی کا ایک ہیجان تھا جس نے قوتِ خیال کو قریب قریب معطل کر دیا تھا۔ مگر تار والے کی آواز نے یہ طلسم توڑ دیا "ہمارا انعام مل جائے بابو صاحب" سلیم چونک پڑا اس نے اُٹھ کر جیب سے ایک روپیہ نکالا اور چپکے سے چپراسی کے ہاتھ میں دے دیا۔ چپراسی نے سلام کیا۔ اور بائیسکل پر بیٹھ کر ہوا ہوگیا۔ اندر آکر سلیم کی نظر کھانے پر پڑی۔ مگر اب اس کی اشتہا کافور ہو چکی تھی۔ اور صرف ایک خواہش دل پر مسلط تھی کہ اپنی کامیابی کی خوش خبری کسی کو سنائے۔ اور اس سے داد لے۔ اس نے سوچا کہ بدھو غالباً چسکی پینے گیا ہے۔ اور کوئی دم میں آیا ہی چاہتا ہے۔ اس کے آنے کے بعد کھانا کھائے بغیر چھٹکارا مشکل ہو جائے گا۔ اس نے جلدی سے ٹوپی سر پر رکھی۔ شیروانی پہن اور بٹن لگاتا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا۔

سڑک پر پہنچ کر خیال آیا کہ جوتا نہیں بدلا ہے۔ مگر اب واپس جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس لئے دو سال کی پرانی گرگابی پہنے سٹر پٹر کرتا خالہ کے گھر کی طرف چل کھڑا ہوا۔

راہ میں تصور نے اس کی بیوی کی تصویر نظر کے سامنے پیش کردی۔ یہ نیک بخت ابھی تعین کی اکثر قیود سے آزاد تھی۔ مگر یہ مسلّم تھا کہ وہ حسنِ صورت اور حسنِ سیرت کی تمام صفات سے آراستہ ہے۔ ایک مدت سے وہ تنہائی کی گھڑیوں میں سلیم کی ہمدم اور ہمساز رہا کرتی تھی۔ پھر یہ کیوں کر ممکن تھا کہ اس یادگار موقعہ پر اُسے مبارک باد دینے نہ آتی۔ لیجئے وہ آگئی، سرمہ سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے۔ اس کا حسین چہرہ فخر و مسرت سے دمک رہا ہے۔ حجاب کی سرخی عارضِ تاباں پہ دوڑی ہوئی ہے۔ سرمہ آلود آنکھوں میں خوشی کے آنسو جھلک رہے ہیں۔

کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا
تری طرح کوئی تیغِ نظر کو آب تو دے

دونوں کی نظریں ایک لمحے کے لئے ملتی ہیں اور پھر شرم سے جھک جاتی ہیں۔ سلیم ہمہ تن گوش ہے کہ وہ کچھ کہے۔ اسے انتظار ہے کہ یہ پہل کرے۔ دونوں کو بہت کچھ کہنا ہے۔ مگر سوچتے ہیں یہ کہ آخر بات کیوں کر کریں.......... خالہ کا گھر آگیا۔ سلیم کو اس واقعے نے جھنجھوڑ کر اس خوابِ شیریں سے بیدار کر دیا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا خالہ کے گھر میں داخل ہوا۔ وہ معظمہ سامنے دالان

میں بچے کو لئے بیٹھی تھیں۔ سلیم کو دیکھتے ہی کہنے لگیں "سلیم بیٹا اس وقت خدا نے تمھیں بھیجا ہے۔ اس کی کارسازی کے صدقے۔ ننھا رات سے بخار میں تپ رہا ہے۔ محمود نے جا کر ڈاکٹر سے نسخہ لکھوایا اور دوا کے انتظار میں کھڑا رہا۔ مگر اتنا ہجوم تھا کہ اسکول کا وقت آگیا اور اس کی باری نہیں آئی۔ وہ نسخہ یہاں پھینک کتابیں لے اسکول چل دیا۔ اب میں دوا کس سے منگواتی۔ نعیمبا تو جب سے بوڑھی ہوئی ہیں۔ انھیں مردوں میں جاتے شرم آتی ہے۔ بیٹا ذرا تم ہی تکلیف کرو۔ اور یہ نسخہ لے کر دوا لا دو۔ اور ہاں لوٹتے میں عطار کی دوکان سے آدھ پاؤ بید مشک کا عرق اور تولہ بھر کھٹے میٹھے انار کا شربت لیتے آنا۔ مجھے صبح سے دھڑکن نے ستا رکھا ہے۔"

سلیم نے بچے کے پاس جا کر اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ تو آگ کی طرح پھک رہا تھا۔ مگر خالہ کو تسکین دینے کے لئے اس نے کہا "بخار تو اب کم معلوم ہوتا ہے۔ میں ابھی دوا لاتا ہوں۔ خدا نے چاہا تو پیتے ہی اتر جائے گا۔" نسخہ لے کر وہ اسپتال میں گیا جو قریب تھا۔ کمپونڈر بنچ پر پاؤں پھیلائے سو رہا تھا۔ اس کے اُٹھنے اور دوا کے لینے میں کچھ دیر لگی۔ عطار کے یہاں سے

یہاں سے اس نے عرق اور شربت لیا۔ سیب کا مربّہ اور چاندی کے ورق خالہ کے لئے اور پیپرمنٹ کی ٹکیاں ننھے کے لئے خریدیں۔ گھر آیا تو خالہ نے بہت سی دعائیں دیں۔ اگر اختلاج سے بے چین نہ ہوتیں تو بلائیں بھی لیتیں، دونوں مریضوں کو دوا پلا کر وہ کچھ دیر ننھے کے پاس بیٹھا اس کے پاؤں سہلاتا رہا، خالہ اپنی اور بچے کی بیماری اور اپنے شوہر کی لا پروائی اور بے مہری کا دکھڑا روتی رہیں، تھوڑی دیر میں بچے کو نیند آگئی۔ اور خالہ بھی باتیں کرتے کرتے اونگھنے لگیں اس لئے وہ شام کا وعدہ کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کے دل پر افسردگی سی چھا گئی تھی۔ مگر کامیابی کا نشہ ایسا نہ تھا کہ اتنی جلدی اتر جاتا۔ یہاں سے وہ اپنے پرانے ہم سبق کے یہاں پہنچا، دیکھا کہ وہ اپنی بیٹھک میں منہ ڈھانپے پلنگ پر لیٹے ہوئے ہیں۔ سلیم سمجھا کہ سو رہے ہیں مگر وہ اس کے پیروں کی آہٹ سے اٹھ بیٹھے اور مری ہوئی آواز میں کہنے لگے۔ "تم خوب آگئے ہو تو سہ پہر کو تمہارے ہاں آنے کا ارادہ کر رہا تھا۔" سلیم نے دیکھا ان کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا ہے۔ آنکھوں سے وحشت برس رہی ہے، ہونٹ خشک ہیں اس نے گھبرا کر پوچھا۔ "خیر تو ہے آپ کچھ پریشان معلوم ہوتے ہیں۔" کہنے لگے "سلیم کیا بتاؤں میں تو زندگی سے عاجز آگیا ہوں اس روز روز

کی مصیبت سے تو موت ہزار درجہ بہتر ہے۔ والد کے انتقال کے بعد گھر سنبھالنے کے لئے میں نے پڑھنا چھوڑا مگر اس بوجھ نے میری کمر توڑ دی میرے جیسا مرنجاں مرنج آدمی اور سابقہ اس کنبے سے جس میں ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہے۔ مردوں کو تو میں کسی طرح ٹھیک کر لیتا ہوں مگر عورتوں کا کیا علاج کروں، آج کا قصہ سنو، میری بیوی سے اور میری والدہ سے مدت سے لڑائی ٹھنی ہوئی ہے۔ بات چیت ترک تھی صبح کو ذرا سی بات پر دونوں آپے سے باہر ہو گئیں وہ ہنگامہ برپا ہوا کہ یا اللہ تیری پناہ۔ مختصر یہ کہ بیوی ڈولی منگا کر میکے چلی گئیں۔ والدہ کوٹھڑی کی کنڈی لگا کر بیٹھ رہیں۔ گھر میں آگ تک نہیں سلگی۔ بچے بھوک سے بلک رہے ہیں، چچا صاحب کو گاؤں سے بلا لیا ہے کہ والدہ کو سمجھائیں۔ یہ قصہ طے ہو جائے تو میں بیوی کے یہاں جاؤں وہاں جو کچھ پیش آئے گا اس کے خیال سے دل لرزتا ہے خیر خدا مالک ہے۔ بر سرِ اولادِ آدم ہر چہ آید بگذرد"۔ سلیم بڑی دلسوزی سے اولادِ آدم کی درد کی داستان سنتا رہا۔ وہ ان معاملات میں بالکل ناتجربہ کار تھا۔ والدہ اس کے بچپن میں انتقال کر چکی تھیں۔ رہی اس کی بیوی سو اس سے ابھی تک لڑائی تو ایک طرف خفیف سی رنجش کی بھی نوبت نہیں آئی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کن الفاظ میں تعزیت کرے۔ مگر کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ تقدیر نے

اس کی مدد کی اور عین اُسی وقت ایک بیل گاڑی بیٹھک کے سامنے آکر رُکی جس میں اولادِ آدم کے چچا کی سفید داڑھی نظر پڑی۔ اسکے حق میں وہ اس وقت رجالِ غیب سے کم نہیں تھے۔ موقع کو غنیمت سمجھ کر وہ جلدی سے اُٹھا اور چچا کو سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

خوشی کی جگہ اُسے غصہ آرہا تھا اور وہ سیدھا گھر جانے کا قصد کر رہا تھا۔ مگر اس کے نئے دوست کا مکان رستے میں پڑتا تھا۔ اس نے سوچا چلو انھیں بھی دیکھتے چلیں۔ شاید انھیں سے دل کی بات کہنے کا موقع مل جائے۔ اس نے ان کی گلی میں قدم رکھا ہی تھا کہ وہ حضرت خود لمبے لمبے ڈگ بھرتے اسی طرف آتے نظر آئے۔ سلیم وہیں ٹھٹک کر رہ گیا۔ قریب آکر صاحب سلامت کے بعد انھوں نے انتہائی سراسیمگی کے انداز میں فرمایا "سلیم صاحب معاف کیجیے گا میں اس وقت بڑی جلدی میں ہوں۔ نوکر مردود نے مجھے لُوٹ لیا کیش بکس توڑ کر ساری رقم اڑا لے گیا۔ بیس گڈیاں تو دس دس کے نوٹوں کی تھیں۔ روپیہ کی تعداد ٹھیک یاد نہیں۔ ابھی گھر میں آیا تو معلوم ہوا تھانہ میں رپٹ لکھوانے جا رہا ہوں۔ آپ چل کر بیٹھیے میں پانچ منٹ میں حاضر ہوتا ہوں۔ آپ کو سارا قصہ تفصیل سے سناؤں گا۔"

اب سلیم کو ضبط کی تاب نہ رہی۔ وہ دل ہی دل میں برس پڑا۔

لعنت ہے اس ملک پر جہاں غم کا شریک تو ایک طرف کوئی خوشی کا ساتھی بھی نہیں ملتا۔ اور پھر کسی میں اتنا حوصلہ نہیں کہ مصیبت کو ہنسی میں ٹال دے یا چپ چاپ سہہ لے۔ جہاں دیکھئے شکوہ وشکایت، آہ وزاری۔ نالہ و فریاد۔ سب زخمی اور سب کو اپنے زخموں کی نمائش کا شوق۔ سب درد میں مبتلا اور سب کو کراہنے کی عادت۔ اس ہر وقت کی ہائے ہائے میں کوئی شخص جس کے دل میں دوسروں کا درد ہو، کس طرح خوش رہ سکتا ہے۔ انسان اپنی تکلیفوں پر صبر کرے مگر دوسروں کی تکلیفوں پر کیسے صبر کرے۔ غم وغصّہ کی اس فضا میں ہمت اولوالعزمی، بلند خیالات۔ اعلیٰ مقاصد کیوں کر پنپ سکتے ہیں۔ کہنے والا کہتا ہے "خوگر بہ خار شو کہ سراپا چمن شوی"۔ فرض کا احساس۔ خدمت کی لگن پیدا کرو تو کلفت میں راحت درد میں لذّت پاؤ گے۔ زندگی کی تلخیاں شربت کے گھونٹ بن جائیں گی۔ مگر۔

اک عمر چاہیئے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں

اس عمر میں جسے جوانی کہتے ہیں۔ تھوڑی سی نشاطِ طبع تھوڑی سی خوش دلی، ذراسی ہمت افزائی۔ ذراسی دل دہی کے بغیر محنت وترقی ناممکن ہے۔ میں نے جن جن مصیبتوں سے بی۔ اے تک پڑھا۔

انھیں میں جانتا ہوں یا خدا جانتا ہے۔ آج اس محنت کا ثمر حاصل ہوا اتنی بڑی خوشی کو تنہا کیوں کر سمیٹتا۔ کیا میں اس کا مستحق نہیں تھا کہ کوئی اس خوش خبری کو سن کر مجھے مبارک باد دیتا۔ مگر جن سے اس کی امید تھی ان سے سخت مایوسی ہوئی۔ کسی نے بھی میری خوشی کا بوجھ نہیں بٹایا۔ سب نے اپنے رنج کا بوجھ مجھ پر لاد دیا۔ ایک مرزا صاحب رہ گئے ہیں۔ ان کے یہاں جاؤں تو خدا جانے کیا منظر دیکھنے میں آئے۔ شاید ان کو کسی نے قتل کر دیا ہو۔ یا زیادہ قرینِ قیاس یہ ہے کہ انھوں نے کسی کی گردن مروڑ دی ہو۔ نہیں اس شہر میں اس ملک میں خوش ہونا جرم ہے۔ اسے ظاہر نہیں کرنا چاہیئے بلکہ چھپانا چاہیئے۔ انگریزی مثل ہے "ہنسنے والے کے ساتھ دنیا ہنستی ہے۔ رونے والا اکیلا روتا ہے"۔ مگر ہماری دنیا اُلٹی ہے۔ رونے والے کے ساتھ دنیا روتی ہے، ہنسنے والے کے پاس نہیں پھٹکتی۔ روئے جا اے بدنصیب ہندوستان تیری قسمت میں رونا ہی لکھا ہے ......!

ان خیالات میں غرق سلیم اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ یکایک اسکول کے بچوں کی ایک ٹولی نظر آئی جن میں اس کا خالہ زاد بھائی محمود بھی تھا۔ محمود نے اُسے دیکھ کر سلام کیا۔ اور اُس کی طرف بڑھا سلیم اس سے کہہ چکا تھا کہ نتیجہ کا تار آنے والا ہے۔ قریب آکر اس نے اشتیاق

کے لہجے میں پوچھا "کہئے بھائی جان تار آگیا؟"

سلیم نے قدرے تامل کے بعد جواب دیا "ہاں دوپہر کو تار آیا ہے میں پاس ہوگیا .... اول درجہ میں" محمود کا چہرہ خوشی سے چمک اُٹھا "مبارک ہو بھائی جان لائیے مٹھائی کھلوائیے۔ اچھا اب آپ کو کس درجہ میں ترقی ملے گی؟" سلیم اس کے بھولے پن پر مسکرایا "ترقی؟ بھئی بی اے کے بعد تعلیم کی ایک منزل ختم ہو جاتی ہے۔ کوئی چاہے تو ایم۔ اے یا قانون کے درجہ میں داخل ہو جائے۔ میں نے ابھی تک فیصلہ نہیں کیا۔ خیر اب تم گھر جاؤ۔ خالہ انتظار میں ہوں گی۔ میں شام کو تمہارے لئے مٹھائی لے کر آؤں گا" محمود خوش خوش اپنے ساتھیوں میں جا کر مل گیا۔ شاید اُس نے ان پر رعب گانٹھنے کے لئے اپنے بھائی کی کامیابی کی خبر سنائی ہوگی۔ سلیم کے کان میں ایک لڑکے کی آواز آئی "اجی یہ فقرے کسی اور کو دو۔ بی۔ اے میں اول آنے والے کی ایسی ہی صورت ہوتی ہے" سب لڑکوں نے سلیم کو غور سے دیکھا اور منہ پھیر کر زور سے قہقہہ لگایا۔ سلیم کو ان کی یہ حرکت ناگوار ہوئی۔ مگر اب اس کی طبیعت کی لَے بدل چکی تھی۔ جذبۂ مسرت جو کچھ دیر کے لئے غصے کے جوشش میں دب گیا تھا، ابھر آیا۔ اس کے دل میں خاموش خطابت کا طوفان پھر اٹھا۔ مگر اب ہوا کا رُخ اور تھا۔

شکر ہے نوجوان ہندوستان ابھی غم اور غم پرستی کے زہر سے محفوظ ہے۔ اس کی رگوں میں شوخی اور زندہ دلی کا خون دوڑتا ہے۔ اس میں ہنسنے کا ذوق اور ہنسنے کی قوت باقی ہے۔ اسے دیکھ کر کچھ امید ہوتی ہے۔ کہ یہ زندگی کی کڑیاں ہنس کھیل کر سہے گا۔ مشکلوں کا مقابلہ مردانہ وار کرے گا۔ ایسے رفیق کے بل پر انسان کارزار حیات میں قدم رکھ سکتا ہے۔

اگر غم لشکر انگیزد کہ خونِ عاشقاں ریزد
من و ساقی بہم سازیم و بنیادش براندازیم

سلسلۂ خیال یہیں تک پہنچا تھا کہ اس کی نظر حلوائی کی دوکان پر جا پڑی۔ اسے محمود کی مٹھائی کا تقاضا یاد آگیا اور بھوک کی شدت بھی محسوس ہوئی۔ کیونکہ اس نے دوپہر کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ اس نے سوچا کہ ایک روپے کی گرما گرم جلیبیاں خریدے۔ کچھ خود کھائے، کچھ میاں بدھو کی نظر کرے اور باقی شام کو محمود کے لئے لے جائے۔ وہ حلوائی کی دکان کی طرف بڑھا اور ہندوستان کے مستقبل کی فکر جلیبیوں کے بیچ میں غائب ہوگئی۔

افیون کی پینک

جن بزرگ کی کتھا میں آج آپ کو سنانا چاہتا ہوں ان کا نام مجھے کیا کسی کو بھی معلوم نہیں تھا۔ گاؤں بھر انھیں "تمہارے صاحب" کہتا تھا۔ اس کا قصّہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کو "تمہارے صاحب" کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے اسے بات کی ٹیکن بنا لیا تھا۔ جہاں زبان رُکی اور انھوں نے اس بات کا سہارا لیا۔ اس لئے انکا یہی نام پڑ گیا تھا۔ ہاں جی چاہے تو ان کا تھوڑا سا حلیہ سن لیجئے۔ تھوڑا سا اس لئے نہیں کہ مجھے اختصار منظور ہے بلکہ ان کا حلیہ تھا ہی ذرا سا۔ ٹھگنا قد۔ اکہرا بدن، دُبلا چہرہ، سانولا رنگ۔ خشخشی ڈاڑھی۔ سر پر پٹھے اللہ اللہ خیر سلّا۔ کپڑے بھی واجبی ہی پہنتے تھے۔ نیچا کرتہ اونچا پاجامہ یا کبھی لنگی۔ سر پر رومال لپٹا ہوا۔ آنکھوں میں سرمہ روز لگاتے تھے۔ سر میں تیل چوتھے دن ڈالا کرتے تھے۔

"تمہارے صاحب" کبھی ایک چھوٹے سے زمیندار تھے۔ قریباً کے کسی گاؤں میں ان کی دو ڈھائی سو بیگھے زمین تھی جو مقدمہ بازی میں

ٹھکانے لگ گئی۔ اس وقت سے وہ ہمارے گھر میں کچھ عزیز اور کچھ نوکر کی طرح رہتے تھے۔ کام وہ صرف دو ہی کرتے تھے۔ ایک تو گھر کے بڑے بوڑھوں کو حقہ بھر کر پلانا۔ دوسرے بازار سے سودا سلف لانا۔ سودا چکانے میں ان کی انوکھی عادت یہ تھی کہ ہمیشہ دوکان دار کی سی کہتے تھے۔ مثلاً خربوزے والا آیا ہے اور زنانی ڈیوڑھی پر اس سے بھاؤ چکایا جا رہا ہے۔ یہ حضرت بھی موجود ہیں۔ بیچنے والا سیر کے چار پیسے مانگ رہا ہے۔ خریدنے والے دو پیسے کہہ رہے ہیں۔ ان حضرت کا فیصلہ یہ ہوتا تھا "نہیں تمہارے صاحب یہ خربوزے تو چار ہی پیسے سیر کے ہیں"! اور جو کسی نے کہا کہ تم بیچ میں کیوں بولتے ہو تو بھولے پن سے فرماتے تھے "تمہارے صاحب وہ تو آپ ہی چار پیسے سیر کہہ رہا ہے ہم نے کہا تو کیا برا کیا" ان کی سادگی کا ایک اور ثبوت لوگ اس بات کو جانتے تھے، کہ آپس کے رشتے ان کی سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ سچ پوچھئے تو ہمارے خاندانوں کے رشتے ناتے ہی اس قدر پیچیدہ ہیں کہ اسّی برس کی بڑھیوں کے سوا کسی کو زبانی یاد نہیں ہوتے۔ بڑے بڑے حسابیوں کو سلیٹ پنسل کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ اور نتیجہ پھر بھی اکثر صفر ہی نکلتا ہے۔ مگر تمہارے صاحب اس معاملے میں اوروں سے بڑھے ہوئے تھے۔

پھپھی کی خلیا ساس کو نانی اور بیوی کے بہنوئی کو نندوئی غرض اسی طرح اٹکل پچو رشتے بنا دیا کرتے تھے۔ ہم سب بچے ان کے پیچھے پڑکر طرح طرح کے سوال پوچھتے تھے اور ان کے جواب سن کر ہنستے ہنستے لوٹ جاتے تھے۔ ایک بار ان سے پوچھا کہ فلاں درزی کے سگے دادا کی سگی پوتی اس کی کون ہوئی۔ پہلے تو انھوں نے اس درزی کے دادا کا نام، ولدیت، سکونت عمر کی تحقیق کی۔ پھر اس کی پوتی کا نام اور عمر پوچھی۔ یہ سب چھان بین کرنے کے بعد فرماتے ہیں: "بھئی کسی کے گھر کا حال ہمیں کیا معلوم۔ اُسی سے پوچھ لو"۔

شادی انھوں نے کم عمری کے زمانے میں کر لی تھی۔ بیوی تعداد میں ایک تھیں۔ مگر مقدار میں ان سے چوگنی اور پھر تیز مزاج اسلئے یہ اُن سے بہت ڈرتے تھے۔ بال بچے تھے نہیں اور بیوی سے محبت کرنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ اس لئے محبت کا جذبہ اور جانوروں کی طرف منتقل ہو گیا تھا۔ بکریاں، مرغیاں، طوطے، مینا تیتر، بٹیر غرض بیسیوں جانور پال رکھے تھے۔ اور ان سے بہت مانوس تھے۔ کسی حکیم کا قول ہے اور نہیں ہے تو ہونا چاہیئے کہ انسان کو جس جانور سے زیادہ سابقہ رہے اس کی روح حیوانی اسی جانور کا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھیئے تو "تمہارے صاحب"

کا کچھ اندازہ ہو جائے گا اور اگر آپ "مختصر أحقة عمر یہ ہے کہ دل رکھتے ہیں" تو آپ کو بڑی عبرت و بصیرت حاصل ہو گی۔

ہوا یہ کہ ایک دن "تمھارے صاحب" میٹھے ٹکڑے زیادہ کھا گئے فصل بھی بلبر یا کی۔ معدہ جو خراب ہوا تو جاڑے بخار نے آدبایا فصلی بخار کی بے چینی تو آپ جانتے ہیں اچھے اچھوں کے چھکے چھڑا دیتی ہے بیماری کے بڑے کچے تھے، سمجھے کہ بس اب چل چلاؤ ہے۔ لوگوں کو پکارنے لگے کہ میرے پاس آکر میری آخری باتیں سن لو، گھر کے بڑوں نے اسے بخار کی بڑ سمجھ کر کچھ توجہ نہیں کی۔ البتہ بچے آن کر جمع ہو گئے نگران کو انھوں نے ڈانٹ کر بھگا دیا۔ کچھ دیر کے بعد ہمارے ایک عزیز دوسرے گاؤں سے آئے۔ بیمار کی یہ حالت دیکھ کر ان کو ترس آیا اور آکر پاس بیٹھ گئے۔ "تمھارے صاحب" تو موقع کے انتظار میں تھے۔ انھوں نے فوراً اس دردناک لہجے میں جو افیونیوں سے مخصوص ہے اپنی بانی شروع کر دی۔

"سنو تمھارے صاحب، آج ہم تم سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ہم نے آج تک کسی سے نہیں کہیں، ہماری عمر کچھ کم ساٹھ برس کی ہوئی اگر بقر عید تک زندہ رہتے تو پورے ساٹھ کے ہو جاتے جوانی میں ہم پر وہ مصیبت پڑی جس نے ساری زندگی برباد

کی روح چڑیا خانے سے کم نہ ہو گی۔

"تمہارے صاحب" کی رقتِ قلب، بھولے پن اور مسکینی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ افیون کا شغل کرتے تھے۔ دن میں دو وقت دوپہر کو اور رات کو گھلا کرتی تھی۔ اور ہمارے ہیرو وہ ایک بے فکروں کے ساتھ افیون کی چسکیاں لیتے تھے۔ اور حقے کے دم لگاتے تھے مگر ان کے ساتھی ہمیشہ نئے نئے ہوا کرتے تھے۔ ان کا قاعدہ تھا کہ آس پاس کے گاؤں میں "جو شخص کہ اس چیز کے قابل نظر آیا" اسے چند روز اپنے پاس سے افیون پلاتے تھے اور جب وہ پکا ہو گیا تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دیتے تھے۔ یہ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ ان کے پاس افیون آتی کہاں سے ہے اس لئے کہ خریدتے انھیں کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ ان سے پوچھئے تو مسکرا کر چپ ہو رہتے تھے کوئی بہت اصرار کرے تو ایک قطعہ پڑھ دیا کرتے تھے جو ٹھیک یاد نہیں۔ کچھ اس طرح کا تھا۔

اے کہ جاپان کے خزانے سے — چینیوں کو افیم دیتا ہے
دوستوں کو کرے گا کب محروم — دشمنوں کی خبر جو لیتا ہے

اس تعارف کے بعد میں آپ کو "تمہارے صاحب" کی ایک دن کی گفتگو سناتا ہوں جو میرا اصل مقصود ہے۔ اس سے آپ کو ان کی سیرت

ہو گئی، ہمارا گھر قریب کے گاؤں میں تھا جس کا نام ہم نہیں بتاتے بزرگوں کے وقت سے گاؤں میں ایک پٹی چلی آتی تھی۔ والد کے انتقال کے بعد اس کے مالک ہم تھے۔ چین سے اور آبرو سے بسر ہو رہی تھی۔ اتفاق کی بات گاؤں کے نمبردار سے ایک معاملے میں دشمنی ہو گئی۔ وہ اپنے زمانے کا پکا جعل ساز تھا۔ اس نے ہمیں دق کرنے کے لئے ایک جعلی دستاویز تیار کی اور اپنے ایک پٹھو سے ہم پر نالش کرا دی۔ یہ امید اُسے بھی نہ تھی کہ ڈگری ہو جائے گی مگر ڈگری ہوئی اور ہائی کورٹ تک بحال رہی، ہماری زمین گھر بار سب کچھ بک گیا۔ اور ہم روٹیوں کو محتاج ہو گئے۔ خدا بھلا کرے اس ڈیوڑھی کا جس نے ہمیں اس طرح رکھا جیسے اپنوں کو رکھتے ہیں مگر کیا تم سمجھتے ہو کہ ہمارے دل سے ان مصیبتوں کا صدمہ خصوصاً زمین کے چھن جانے کا غم مٹ گیا۔ تو بھتیجے تمہارے صاحب، تم بھی زمیندار کے بیٹے ہو اور زمین کی قدر جانتے ہو۔ اس دنیا میں جہاں کسی چیز کو دم بھر قرار نہیں ایک ہی چیز ہے جو سیکڑوں ہزاروں سال باقی رہتی ہے اور وہ زمین ہے۔ اسی پر ہم پیدا ہوتے ہیں اور اسی پر دفن ہوتے ہیں۔ زمین کی جو محبت انسان کے خصوصاً زمیندار کے دل میں ہوتی ہے اس کی تھاہ نہیں، مدت

تک ہمارا یہ حال رہا کہ کھیتوں کی تصویر آنکھوں میں پھرتی تھی اور انھیں یاد کرکے تڑپتے تھے۔ نمبردار سے اور اس کے سپوتوں سے بدلہ لینے کی تدبیریں ہر وقت سوچا کرتے تھے۔ مگر لڑائی بھڑائی سے ہمیں ہمیشہ سے نفرت تھی اور طاقت بھی ان دنوں ذرا کم تھی یہی صورت سمجھ میں آتی تھی کہ ان کمبختوں پر آسمان پھٹ پڑے یا بجلی گر پڑے مگر یہ اپنے اختیار کی بات نہیں تھی۔

دوسرا ہوتا تو اس غم میں تمھارے صاحب، کھانا پینا چھوڑ دیتا مگر ہم نہایت صبر سے کام لیتے تھے۔ اور گاؤں میں رہ کر دل بہلانے اور غم غلط کرنے کی جو تدبیریں ہو سکتی ہیں وہ کرتے تھے۔ مگر دل کی کلی کسی طرح نہ کھلتی تھی۔ پیر خاکسار شاہ صاحب یہاں تشریف لائے تو ہم ان کے مرید ہو گئے۔ اور ان سے اپنا درد دل بیان کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ دنیا کو چھوڑ دو اور مولا سے لو لگاؤ۔ نماز روزے کی تاکید کے ساتھ انھوں نے چلہ کھینچنے اور پیر کے نام کا ورد کرنے کی ہدایت کی، نماز تو خیر ہم پڑھتے ہی تھے مگر روزہ ہمیں کبھی راس نہیں آیا۔ جب کبھی روزہ رکھا دن چڑھے سے پیٹ میں کچھ عجیب کھرچن سی ہونے لگتی تھی۔ اور شام تک بڑھتی جاتی تھی۔ اس بیماری کی دوا کسی حکیم نے نہ بتائی۔ دوسری شکل یہ

تھی کہ پیر صاحب کا نام خاکسار تھا۔ جب اس کی رٹ لگاتے تو مٹی اور اس سے زمین کا خیال آتا اور ہمارا زخم ہرا ہو جاتا۔ پیر جی سے عرض کیا تو وہ بہت خفا ہوئے۔ اور ہمیں مردود شیطان کہہ کر نکال دیا اس کے بعد تمھارے صاحب، تحصیل میں ایک قرق امین جو شاعر تھے، انھوں نے رائے دی کہ تم شعر کہا کرو۔ پھر دیکھنا کہ زمین شعر کے سوا تمھیں زمین آسمان کی سدھ نہ رہے، شاعری کا مادہ تو ہم میں ہمیشہ سے تھا چنانچہ لوگ کہا کرتے تھے کہ تم ہر بات میں شاعری کرتے ہو مگر موزوں شعر اب تک نہ کہا تھا۔ اب جو کہنا شروع کیا تو بڑے جھگڑے پڑ گئے۔ لوگوں نے عجیب عجیب الزام لگائے۔ کہنے لگے تمھارے صاحب فلاں شعر جو ہے وہ سرقہ ہے، ایک شاعر اس مضمون کو انھیں لفظوں میں کہہ گیا ہے۔ کوئی پوچھے کہ تمھارے صاحب ہمارا اس میں کیا قصور ہے؟ شرارت اس شاعر کی ہے جس نے ہمیں پھنسانے کے لئے پہلے ہی سے یہ مضمون کہہ دیا اور پھر انھیں لفظوں میں۔ اب ایک ہی چیز باقی رہ گئی تھی یعنی عشق سو وہ بھی ہم نے کر دیکھا، صبح شام پنگھٹ پر جاتے تھے اور گاؤں کی نازنینوں کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھا کرتے تھے۔ جیسا کہ عاشقوں کا قاعدہ ہے، ہم کبھی آہِ سرد بھرتے تھے، کبھی سسکتے تھے۔ کبھی روتے تھے، کبھی جگر تھام کر بیٹھ جاتے تھے۔

مگر تمھارے صاحب ان نیک بختوں کا برتاؤ بالکل قاعدے کے خلاف تھا، انھیں چاہیئے تھا کہ ہمیں ترچھی نظروں سے دیکھتیں، پلکوں کے تیر بھوؤں کی کٹاریں چلاتیں، مسکراہٹ کی بجلیوں سے جَلا دیتیں، ہونٹوں کے امرت سے جِلا دیتیں مگر یہ تو ہمیں دیکھ دیکھ کر قہقہے لگاتی تھیں اور ہمیں پانی کے چھینٹوں سے بھگو دیتی تھیں۔ خیر اس میں بھی ایک خاص لطف آتا تھا۔ اگرچہ جاڑوں میں ذرا تکلیف ہوتی تھی۔ جب تک یہ سلسلہ جاری رہا ہماری طبیعت تھوڑی بہت بہلی رہی مگر تقدیر کو یہ بھی گوارا نہ تھا۔ "وہ" جو آئیں تو انھوں نے عشق کی قطعی ممانعت کردی چلیئے چھٹی ہوئی۔ اب تمھارے صاحب پھر وہی حال ہو گیا۔ زمین کا غم پھر دل میں نشتر کی طرح چبھنے لگا۔ اور دشمنوں سے بدلہ لینے کا خیال کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا۔ اب پھر اُدھر کے چکر ہونے لگے۔ ہم اپنے کھیتوں کے پاس نہیں جاتے تھے۔ دور سے دیکھ دیکھ کر کُڑھتے تھے۔ اگر یہ وحشت چند سال اور رہتی تو خدا جانے ہمارا کیا انجام ہوتا۔ مگر خدا کو کچھ اچھا کرنا منظور تھا کہ ایک باکمال جوگی ادھر آنکلا، ہم تو ایسے لوگوں کی تلاش ہی میں رہتے تھے۔ فوراً اس کی خدمت میں پہنچے۔ اس نے ہم کو دیکھ کر کہا۔ بابا بنرادُکھ بڑا بھاری ہے، اس کو جیون سنکٹ کہتے ہیں۔ یہ بیماری اس طرح ہوتی ہے کہ یہ جیون یہ سنسار آدمی کے لئے سانپ کے منہ کی چھچھوندر ہو جاتا ہے

کہ نہ اگلے بنے نہ نگلے بنے۔ جب ایک آدمی کی یا پورے سماج کی تن من کی طاقت گھٹ جاتی ہے اور دنیا کا بوجھ نہیں گھٹتا تو زندگی نہ سنبھالے سنبھلتی ہے اور نہ چھوڑے چھوڑی جاتی ہے۔ اس کا علاج یا تو یہ ہے کہ اپنے میں اتنی شکتی پیدا کی جائے کہ جیون چیلا بن کر ہمارے آگے ڈنڈوت کرے۔ یا پھر اسے مایا کہہ کر چھوڑ دیا جائے۔ اور اپنے لئے دھیان گیان کا ایک مندر بنا لیا جائے جس میں ہم بھول کو گیان سمجھتے ہوتے، بپتا کو شانتی جانتے ہوئے ہنسی خوشی دنیا سے چلے جائیں۔ یہ باتیں تیرے سمجھنے کی نہیں تو نہ تو شکتی رکھتا ہے اور نہ گیان کے قابل ہے اس لئے میں تجھے ایک گٹکا دیتا ہوں۔ جس کے کھانے سے تو دم بھر میں اپنی زمین کیا ساری زمین سے چھوٹ جائے گا اور تن کی دنیا کے جھمیلوں سے چھوٹ کر من کی دنیا کی سیر کرے گا۔ اور آپ ہی آپ مزے لے گا۔ یہ کہہ کر اس نے ہمیں ایک کالے رنگ کی چھوٹی سی گولی دی، جانتے ہو تمہارے صاحب، یہ کیا چیز تھی؟ یہ وہی تھی جسے دنیا والے افیم کہتے ہیں۔ مبارک تھی وہ گھڑی جب ہم نے "درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا"۔ وہ دن اور آج کا دن پھر کبھی ہمیں زمین کی یاد نے بدلے کے خیال نے غرض دنیا کی کسی فکر نے نہیں ستایا۔ کبھی کبھار ذرا سی بے چینی ہوتی ہے مگر جہاں افیون حلق سے اتری اور ہمارے اندر آرام کی ہلکی ہلکی لہریں اٹھنے لگیں۔ چین کے ٹھنڈے ٹھنڈے

جھونکے آنے لگے، ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی نرم نرم ہاتھوں سے آہستہ آہستہ جھولا جھلا رہا ہے۔ پھر زمین سے آسمان تک خاموشی، سکون، امن و امان چھا گیا۔ ذرے ذرے میں صلح و آشتی اور محبت بس گئی اور ہماری روح بے خودی کی آغوش میں پہنچ کر بے خبری کا لطف اٹھانے لگی۔ آج معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا وقت آن پہنچا ہے اور روز روز کے سونے جاگنے، ڈوبنے اچھلنے سے نجات پا کر ہم ابدی نیند کے سمندر میں ڈوب رہے ہیں۔ اس لیے ہم نے تمھیں اپنی کہانی سنا دی کہ تم اسے سب ہندوستانی بھائیوں تک پہنچا دو۔ اور انھیں وہ نسخہ بتا دو جس نے ہمارے سارے دکھ درد کو دور کر دیا اور ہماری زندگی کی مشکل کو حل کر دیا جسے عمر بھر میں ایک بار بھی یہ نعمت نصیب ہو گئی وہ قیامت تک اس کی لذت نہیں بھول سکتا۔ کیا خوب کہا ہے کسی نے ؎

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی پینک کے رات دن
اونگھا کریں تصورِ جاناں کیے ہوئے

نمونے کا خطبۂ صدارت

ہندوستان میں آج کل کانفرنس کا بڑا زور ہے۔ بڑے دن کی چھٹیوں میں جب لوگوں کا ہاضمہ درست ہوتا ہے اور ریل کا ٹکٹ سستا ہو جاتا ہے تو یارانِ طریقت کو کانفرنس کی سوجھتی ہے، خدا جھوٹ نہ بلائے تو چھوٹی بڑی دو ڈھائی سو کانفرنسیں ہر سال ہو جاتی ہیں۔ بات یہ ہے کہ میلا دیکھنے کا شوق ہم لوگوں کی گھٹی میں پڑا ہے۔ مگر میلوں میں جانے کو پڑھے لکھے لوگ اب برا سمجھنے لگے ہیں۔ اس لیے کہ وہاں دنیا بھر کے اجڈ، جاہل اکھڑ ہوتے ہیں جن کے پاس جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے کہ کہیں ہماری نازک عقل اور سبک تہذیب کو ٹھیس نہ لگ جائے۔ اور یہ وہ آئینہ نہیں :-

— جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ پڑھ لکھ کر آدمی کو چیزوں سے زیادہ لفظوں کا شوق ہو جاتا ہے اور اسے حرفوں اور ان کی آوازوں میں کائنات کی حقیقت چھپی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ میلوں میں چیزوں کا بازار لگتا ہے۔ لفظوں کی دکانیں نہیں ہوتیں۔ اس لئے پڑھے لکھے لوگوں نے میلے

کی جگہ کانفرنس کا نقشہ جمایا ہے۔ جہاں ان کی ضیافتِ طبع کا پورا سامان موجود ہوتا ہے۔ یعنی گرما گرم تقریریں اور ان میں چٹپٹے مسالے دار فقروں کی چاٹ، لفظوں کی جتنی رسد کانفرنسوں میں ہاتھ آجاتی ہے وہ بہت سے لوگوں کو سال بھر کے لئے خیالات سے بے نیاز کر دیتی ہے۔

مگر کانفرنس میں اور تو سب مزے میں رہتے ہیں، مصیبت بچارے صدر کی ہوتی ہے۔ جسے ایک لمبا چوڑا خطبۂ صدارت لکھ کر یا لکھوا کر پڑھنا پڑتا ہے۔ نہ جانے کس کس جتن سے تو بیچارہ صدر بنتا ہے اور پہلے دن سے یہ فکر سر پر سوار ہو جاتی ہے کہ ایک دھواں دھار خطبۂ صدارت لکھا جائے اور اس کی ہزار دو ہزار، دس پندرہ ہزار کا پیاں اپنی گرہ سے دام خرچ کر کے چھپوائی جائیں۔ پہلی مشکل یہ ہوتی ہے کہ لکھے تو کیا لکھے اور لکھوائے تو کیا لکھوائے۔ دنیا کا قاعدہ ہے کہ صدر کی تقریر میں کام کی باتیں ہوتی ہیں یعنی کانفرنس کے اگلے سال کے کاموں کا خاکہ کھینچا جاتا ہے، مگر ہماری کانفرنس جو میلے کا نعم البدل ہے، کام کا جھگڑا ہی نہیں رکھتی پھر اس کا خاکہ کیا خاک کھینچا جائے اس لئے صدر کو یا اس کے ہمزاد کو جو خطبۂ صدارت لکھتا ہے یہی کرنا پڑتا ہے کہ جلسے کے مذاق کو دیکھ کر لفظوں کے خمیر سے ایسی تیز شراب کھینچے جو قلب کو گرما دے اور روح کو تڑپا دے۔ یعنی تھوڑی دیر کے لئے مردہ دلوں میں وہ جوش اور ولولہ پیدا کر دے جسے عمل سے سروکار نہ ہو

مگر اس شراب کا کھینچنا ہر ایک کا کام نہیں۔ اس کے لئے بڑا پرانا منجھا ہوا بھبکا چاہیئے۔ کیونکہ اگر شراب میں سچ مچ کا نشہ ہوا تو ایک طرف حکومت کی آبکاری کا ڈر ہے دوسری طرف سوسائٹی کے ٹھیکہ دار کا کھٹکا ہے اور تیسری طرف مذہب کے محتسب کا خوف، اس میں بس اتنا ہی سرور ہونا چاہیئے کہ جلسے کے ختم تک سننے والوں کا دل و دماغ جھومتا رہے۔ اگر ہر طرح کی احتیاط کے باوجود کبھی اتفاق سے زیادہ چڑھ جاتی ہے اور جلسہ قابو سے باہر ہونے لگتا ہے تو ایسے وقت میں چندے کا نسخہ بہت کام آتا ہے۔ جہاں چندے کا نام آیا اور جلسے کا نشہ ہرن ہوا۔

غرض خطبۂ صدارت کا ایسا بے ڈھب معاملہ ہے جس کی وجہ سے کانفرسوں کے لئے صدر ڈھونڈنا روز بروز مشکل ہوتا جاتا ہے، ادھر بازار میں مانگ بڑھ رہی ہے اور ادھر مال کی رسد گھٹتی جاتی ہے اس سے کہیں آپ نہ سمجھ لیجئے گا کہ لوگوں کو صدر بننے کا شوق نہیں رہا۔ جذبۂ بے اختیار شوق" اب بھی بہت سے دلوں میں بھڑک رہا ہے مگر خطبۂ صدارت کی فکر اکثر اس آگ کو ٹھنڈا کر دیتی ہے۔ اور یہ اندیشہ پیدا ہو گیا ہے کہ کہیں خدانخواستہ صدروں کی ہڑتال ہو گئی تو کانفرنسوں کا کاروبار ہی بند کرنا پڑے گا۔ اس لئے قوم کے ایک ہمدرد نے جو اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے جناب صدر کے حال پر رحم کھا کر ایک نمونے کا خطبۂ صدارت تیار کیا ہے جو ہر کانفرنس میں خواہ وہ سیاسی ہو یا

علمی یا معاشرتی، اچھوت ادھار کی ہو یا گرام سدھار کی تھوڑی بہت ترمیم کر کے بے تکلف پڑھا جا سکتا ہے۔ ہم اس کا خلاصہ آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں تاکہ سند رہے اور وقت ضرورت کے کام آئے۔ مصنف کی طرف سے یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ اس کے اس خطبہ کے جملہ حقوق غیر محفوظ ہیں۔

"حاضرین اور حاضرات، بھائیوں اور بہنو! آپ نے جو بے پناہ عزت آج مجھے بخشی ہے۔ اس کا شکریہ، آہ اس کا شکریہ، میں کس زبان سے ادا کروں۔ وہ الفاظ کہاں سے لاؤں کس لغت میں ڈھونڈوں جو میرے شدید اور عمیق، طویل اور عریض جذبات قلب کی ترجمانی کریں۔ جب میں اس عظیم الشان جلیل القدر منصب کو دیکھتا ہوں اور اپنی ہیچ مدانی، ہیچ میرزی پر نظر ڈالتا ہوں تو کانپ اٹھتا ہوں کہ اس کی عظمت اور جلالت کا بار کیونکر اٹھاؤں گا۔ اور یہ میری ناکسی اور نااہلی کا بوجھ کیونکر سہے گا۔ یہ مسند صدارت جس پر آپ کی ذرہ نوازی سے میں آج بیٹھا ہوں یعنی ابھی دو منٹ ہوئے بیٹھا تھا اور یہ تقریر ختم کر کے پھر بیٹھوں گا، مجھ سے پہلے ان حضرات کی جلوہ گاہ رہ چکی ہے جن کا نام بقائے دوام کی طلسمی لوح پر زریں حرفوں سے تحریر ہے۔ زمانے کا انقلاب دیکھئے کہ آج یہی مسند مجھ جیسے ننگِ خلائق کی ٹھیک ہے۔ ع

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

بہر حال اب میں خاکساری اور منزلت نفس کے جذبات کو جو میرے دل میں امنڈ رہے ہیں، دبانے کی کوشش کروں گا۔ اگر میں اپنی نالائقی پر زیادہ زور دیتا ہوں تو اس سے آپ کی مردم شناسی پر حرف آتا ہے۔ اور یہ مجھے ہرگز گوارا نہیں۔ آپ نے اس منصب جلیل کے لیے میرا انتخاب آخر کسی مصلحت ہی سے کیا ہوگا۔ میری مجال نہیں کہ ملک و ملت کے فیصلے پر نکتہ چینی کروں۔ چار و ناچار سمعاً وطاعتاً کہہ کر آپ کے فیصلے کے آگے سر جھکاتا ہوں۔ اور اس بارِ گراں کو اپنے کمزور کندھوں پر اٹھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

بھائیو! اور بہنو! ہماری کانفرنس کا یہ اجلاس ایک مہتم بالشان معرکۃ الآرا تاریخی اجلاس ہے۔ اس کی مافوق العادۃ اہمیت کی پہلی وجہ یہ ہے کہ یہ اس شہر (یا قصبے یا گاؤں) میں ہو رہا ہے۔ جو ہندوستان جنت نشان کی جان ہے۔ اس کے دلکش نظر فریب منظر۔ اس جاں فزا روح پرور آب و ہوا کی تعریف نہ میں کر سکتا ہوں نہ آپ سن سکتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں آفتاب عالمتاب جسم خاکی کو حرارت پہنچاتا ہے، ماہتاب دلِ پرسوز کو برودت بخشتا ہے، آبِ ناب جگر کی پیاس بجھاتا ہے، ہوائے صافی پھیپھڑوں کو تازگی بخشتی ہے۔ مجھے یقین ہے اور آپ بھی یقین کیجیے کہ شاعر نے یہ شعر اسی کی شان میں کہا ہے ؎

اگر فردوس بر روئے زمین است — ہمین است و ہمین است و ہمین است

جو ہے جنت زمیں پر تو یہی ہے — یہی ہے بھائیو! بہنو! یہی ہے

اس مقام کی تاریخی عظمت کا حال مطبوعہ تواریخ میں موجود ہے اور اگر اتفاق سے نہ ہو تو غیر مطبوعہ مسودوں میں ضرور ہوگا۔ اس مردم خیز خطے کے مشاہیر کے نام چاہے زمانے کے دل سے محو ہو گئے ہوں مگر سرکاری کاغذات میں اب تک محفوظ ہوں گے اور زبانِ حال سے کہہ رہے ہوں گے ع

ثبت است بر جریدۂ دفتر دوام ما

دوسری وجہ اس اجلاس کی اہمیت کی یہ ہے کہ ایسے زمانے میں ہو رہا ہے جو ہندوستان کی تاریخ میں نازک ترین موقع ہے۔ اس موقع کی نزاکت اُف! اس موقع کی نزاکت کیا عرض کروں آپ خود ہی خوب سمجھتے ہیں۔

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز

ہمیں اس وقت نہایت حزم و احتیاط سے کام لینا چاہیئے، ہر قدم سوچ سمجھ کر، دیکھ بھال کر اٹھانا چاہیئے۔ اور پھونک پھونک کر رکھنا چاہیئے۔ مگر انتہائی حزم و احتیاط کے ساتھ ہی ہمیں ہمت مردانہ، جرأت رندانہ، عزم بالجزم اور سعیٔ بالمرہ کی ضرورت ہے، اے مادر وطن کے منچلے بیٹو! اور بیٹیو! نپولین کی مثال سامنے رکھو، جس کے الفاظ اب تک فضائے عالم میں گونج رہے ہیں۔ "ناممکن کا لفظ ڈکشنری سے خارج کر دو" اور اس بطل جلیل کا قول کبھی نہ بھولو، جس کا

نام مجھے اس وقت یاد نہیں آتا کہ اگر فلاں پہاڑ ہماری راہ میں حائل ہے تو وہ پہاڑ نہیں رہے گا۔ اور دور کیوں جاؤ خود ہمارے بزرگوں کے عدیم المثال کارنامے ہمارے دلوں کو گرمانے، روح کو تڑپانے اور خون کو کھولانے کے لئے کیا کم ہیں؟ کس قوم سے ہمت میں یا حوصلے میں کم تھے! جب جوشِ حمیت تھا دنیا میں ہم ہی ہم تھے

حاضرین و حاضرات، بھائیو! اور بہنو! اس اجلاس میں آپ کے سامنے بڑے معرکۃ الآرا ریزولیشن پیش ہونے والے ہیں جن پر ہماری موت و حیات کا انحصار ہے، یاد رکھئے سارا ہندوستان بلکہ کل ربع مسکوں آپ کے فیصلے کا منتظر ہے۔ دنیا کی آنکھیں اور کان اسی طرف لگے ہوئے ہیں اور اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں اس لئے کہ بیسویں صدی میں دنیا کی آنکھیں اور کان اخبار ہیں اور انھوں نے اپنے نامہ نگار یہاں لگا رکھے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ ان اہم ترین ریزولیشنوں کو جو اس تاریخی اجلاس میں آپ کے سامنے پیش ہوں گے نہایت غور اور توجہ سے سنیں گے۔ 'ٹھنڈے دل سے'۔ 'سر جوڑ کر' ان کے معائب اور محاسن پر غور کریں گے اور اس کے بعد آزادیٔ ضمیر اور حریت فکر کے ساتھ ان کی موافقت یا مخالفت کریں گے۔ نہ بھولئے کہ آپ کے یہ ریزولیشن سالانہ رپورٹ میں چھپ کر اس وقت تک کتب خانوں کی زینت بنے رہیں گے جب تک انحطاط کا تیزاب اوراق کاغذ کو نہ گلا دے یا زمانے کا انقلاب انھیں عطار کی دوکان پر نہ پہنچا دے، موافقت اور مخالفت دونوں

کی ہمیں شدید ضرورت ہے. اس لئے کہ جب تک موافقت نہ ہو گی ریزولیشن کیونکر پاس ہوں گے اور اگر ریزولیشن نہ پاس ہوئے تو کانفرنس سے کیا فائدہ؟ اسی طرح جب تک مخالفت یا نوک جھونک نہ ہو محفل میں حدت اور تقریر دل میں شدت کس طرح پیدا ہو گی۔ اور سننے والوں کو لطف کیا آئے گا؟ حریفوں کا مقابلہ دیکھنے کا شوق انسان کی فطرت میں ہے. اسی شوق کو پورا کرنے کے لئے بٹیروں، اور مرغوں کی پالیاں۔ مینڈھوں اور ہاتھیوں کی لڑائیاں ہوتی ہیں. اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے دنگلوں میں پہلوان، مشاعروں میں شاعر لڑائے جاتے ہیں۔ کانفرنس میں بھی لوگ یہ کش مکش چاہتے ہیں اور ہمارا فرض ہے کہ اس کا اہتمام کریں۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارے ہمفرزوں کو اس معاملے میں زیادہ تاکید کی ضرورت نہیں، خدا کے فضل سے وہ خود ہی جنگِ زرگری اور جنگ آہن گری کے لئے بے تاب نظر آرہے ہیں بلکہ ان کے خشمگیں تیور دیکھ کر میں ان سے درخواست کرتا ہوں کہ بحث میں تہذیب اور اعتدال کو ہاتھ سے نہ دیں۔

ہم نے ان کانفرنسوں کا طریقہ اس پارلیمنٹ سے سیکھا ہے جو سب پارلیمنٹوں کی ماں ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ہم نے اس سے وہ چیز نہیں سیکھی جو پارلیمنٹ کی زبان کہلاتی ہے اس زبان کا اصل اصول یہ ہے کہ سخت سے سخت بات بھی نرم الفاظ اور گوارا لہجے میں کہی جائے۔ تاکہ طرزِ ادا کی شیرینی سے مضمون کی تلخی

کی تلافی ہو سکے۔ مثلاً اس بات کو کہ تم جھوٹ بولتے ہو ایک دل کش تبسم کے ساتھ یوں ادا کرتے ہیں "اور آپ کے الفاظ مرکز اصلیت سے منحرف ہیں" ہمیں بھی حتی الامکان اس سنت کی تقلید کرنی چاہیئے۔ مثلاً اس مکروہ جملے کی جگہ کہ "تم جھک مارتے ہو" ہمیں نہایت اخلاق اور خندہ پیشانی سے کہنا چاہیئے "آپ تو مچھلی کا شکار کر رہے ہیں" اگر کسی سے یہ کہنا ہے کہ "تم ٹوڈی ہو" تو ریشہ خطمی ہو کر سریلی آواز میں کہیئے کہ "آپ مینڈک نوش فرماتے ہیں" میں نے یہ جملے مثال کے طور پر عرض کر دیئے۔ اسی طرح ہر ثقیل اور جزیل مطلب کو لطیف اور رقیق الفاظ کے سانچے میں ڈھال سکتے ہیں۔

حاضرین و حاضرات! بھائیو اور بہنو! اب میں اپنی لاطائل تقریر سے آپ کی زیادہ سمع خراشی نہیں کروں گا۔ اس لئے کہ ابھی بہت اور حضرات کو یہ خدمت انجام دینی ہے۔ میں نے آپ کے سامنے کانفرنس کے مقاصد کو حاصل کرنے کی کوئی عملی صورت پیش نہیں کی۔ اس لئے کہ عملی صورتوں کا قاعدہ ہے کہ ضرورت کے وقت خود ہی پیش آجاتی ہیں۔ عمل ایک ضمنی اور فروعی چیز ہے، اصل چیز ذوقِ عمل اور شوقِ عمل، ہوشِ عمل اور جوشِ عمل ہے جسے آپ کے دلوں میں ابھارنے کی ایک ادنیٰ سی کوشش میں نے کی ہے اور میرے بعد دوسرے اور مفزز کریں گے۔

خدا سے دعا ہے کہ ہماری کوشش کامیاب ہو اور ان تقریروں کا ایک ایک لفظ بجلی بن کر آپ کے رگ و پے میں دوڑ جائے۔ شعلہ بن کر آپ کے دل و دماغ میں بھڑک اٹھے۔ اور آپ میں سے ہر ایک کی زبان سے بے ساختہ نکل جائے ؎

بڑا فلک کو کسی دل جلے سے کام نہیں
جلا کے خاک نہ کردوں تو داغ نام نہیں

حساب اور رومان

(اشخاص)

واجد حسین .... ایک بوڑھا وکیل جو کام چھوڑ چکا ہے

نزہت .... اس کی لڑکی

نگہت .... واجد حسین کی مرحومہ بیوی

شاہد .... اس کا رشتہ کا بھتیجا، افسانہ نگار نزہت کا عاشق

پہلا سین

(واجد حسین کے مکان کا دیوان خانہ۔ شاہد نزہت کو اپنے افسانوں کا مجموعہ دکھا رہا ہے جو ابھی چھپ کر آیا ہے)

نزہت:۔ شاہد اس کتاب میں سب پرانے افسانے ہیں یا کوئی نیا بھی ہے۔

شاہد:۔ ہر افسانہ پرانا بھی ہوتا ہے اور نیا بھی۔ جو ہم پر گذرتی ہے وہ دوسروں پر بھی گذر چکی ہے۔ مگر جب ہماری باری آئی تو پھر نئی کی نئی۔ نیا افسانہ جس سے دل کے تاروں میں نئی لرزش نہ پیدا ہو پرانا ہے۔ پرانا افسانہ جس

سے سازِ قلب پر نئی چوٹ لگنے لگی ہے۔

نزہت :۔ یا اللہ تم نے تو افسانوی زبان بولنی شروع کر دی۔ میں پوچھتی ہوں کہ یہ کہانیاں وہی ہیں جو پہلے رسالوں میں چھپ چکی ہیں۔ یا کوئی ایسی بھی ہیں جو ابھی تک نہیں چھپیں؟۔

شاہد :۔ ہیں تو وہی مگر پہلے دوسروں کے مضمونوں اور افسانوں کے سہارے بے تکلف بے پس و پیش نکل آئی تھیں۔ اب اپنے بل پر تصنیف کے کھلے میدان میں آنا ہے تو ڈرتی، دبکتی، جھجکتی، شرماتی رک رک کر قدم اٹھا رہی ہیں۔ خدا جانے اوس کی یہ چند بوندیں جنھوں نے رات کے نرم سایہ میں پرورش پائی ہے دن کی گرم نگاہوں کی تاب لا سکیں گی یا نہیں۔

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
یہ بھی ہیں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

نزہت :۔ شاہد تم جانتے ہو کہ مجھے تمہارا ادبی اسلوب دل سے پسند ہے۔ مگر جب تم کام کی باتوں میں یہ رام کہانی لے بیٹھتے ہو تو جی الجھنے لگتا ہے۔

شاہد :۔ پیاری نزہت تم سراپا شعر ہو، مجسم موسیقی ہو۔ تمہارے دل میں، چہرے میں، آنکھوں میں رومان ہی رومان ہے۔ کاش اسی کے ساتھ تمہاری باتوں میں بھی ذرا سا رومان ہوتا۔

نزہت :۔ تمھیں خیالی رومان کی پڑی ہے، مجھے اصلی رومان کی فکر ہے۔ ابا جان

تمھاری درخواست کو کسی طرح منظور نہیں کرتے۔ سب تدبیریں ہو چکیں۔ لے دے کر ایک یہی بات تھی کہ تم اپنے افسانوں کا مجموعہ ان کے نام معنون کر دو شاید اسی سے خوش ہو جائیں۔ وہ صفحہ ڈھونڈھ رہی ہوں کہیں نہیں ملتا۔

شاہد:- لاؤ میں نکال کر سنا دوں دیکھو یہ ہے :-

چچا جان کے نام

جن کی مہر پدری نے سورج کی طرح یتیم بھتیجے کی زندگی کے نازک پودے کو حرارت اور قوت بخشی۔ جن کے فیضِ تربیت نے نسیم صبح کے مانند اس کے ذہن کی سربند کلی کو کھلنے اور کھلنے کا موقع دیا۔ جن کی محبت کی ندی سخت گیری کے پردے میں چھپنے کی بیکار کوشش کرتی ہے۔ جن کی زندہ دلی خشک مزاجی کی سطح کے نیچے صاف جھلکتی ہے۔

نزہت:- ہوں ۔ اچھا ۔ آگے!

شاہد:- جن کا ذوقِ ادب زمانے کی ہوا سے کمھلا گیا۔ مگر مرجھایا نہیں جن کی شعریت واقعات کی رو میں بہ گئی مگر ڈوبی نہیں۔ جن کا دماغ مصلحت کے آئینے میں نصب العین کی جھلک دیکھتا ہے۔ جن کا دل تنہائی کی گھڑیوں میں زبانِ حال سے کہتا ہے:-

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار ؛ لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

نزہت :- بہت اچھا ہے۔ کہیں کہیں ایک آدھ لفظ مجھے کھٹکا کہ ایسا نہ ہو ابّا جان بُرا مان جائیں مگر پھر سوچتی ہوں کہ یوں ہی ٹھیک ہے۔ سچّی بات اچھے لفظوں میں کہی جائے تو ضرور اثر کرتی ہے۔

شاہد :- دل و جان سے شکریہ۔ پیاری نزہت تمھاری سیدھی سادی تعریف میرے لئے ایڈیٹروں کے مدحیہ قصیدوں سے۔ اُن کھوٹے سکّوں سے جن سے وہ میرے مضامین کی قیمت ادا کرتے ہیں، کہیں بڑھ کر ہے۔ مگر سنو۔ تم کہتی ہو سچی بات اچھے لفظوں میں ضرور اثر کرتی ہے۔ اس میں تو شبہ نہیں۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ کیا اثر کرتی ہے۔ کہیں سچائی کی دیوی وہ شان نہ دکھلائے جس پر حالی فرماتے ہیں:۔

اے راست گوئی کیا قہر ہے تو
اے حق کی تلخی کیا زہر ہے تو
یاروں کو کرتی اغیار تو ہے
چلواتی گھر گھر تلوار تو ہے

نزہت :- نہ یہ اس قسم کی راست گوئی ہے اور نہ ابّا جان اس قسم کے آدمی ہیں۔ وہ خود سچے اور سچائی کی قدر کرتے ہیں۔

شاہد :- یہ تو میں جانتا ہوں مگر بات کی سچائی کی قدر تو جب ہو کہ کوئی اس کو سُنے اور سمجھے۔ چچا جان تو محض اس لئے میری صورت سے بیزار ہیں کہ بقول ان کے میں کالج کے بدشوق لڑکوں کی طرح اپنی عمر افسانہ نگاری میں برباد کر رہا ہوں

اس سے غرض نہیں کہ میرے افسانے ہیں کیسے ۔ مجھے تو یہ بھی امید نہیں کہ وہ کتاب کیا اس کے عنوان تک کو پڑھنے کی زحمت گوارا کریں گے۔

نزہت :۔ پڑھیں گے کیسے نہیں ۔جب تم کہو گے کہ میں نے اسے آپ کے نام معنون کیا ہے تو ضرور پڑھیں گے ۔ اچھا ایک بات اور سن لو۔ شاہد تمہارا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ ابا جان کو افسانہ نگاری سے بَیر ہے۔

شاہد۔ تو پھر مجھ سے بَیر ہے کہ جو کام میں کرتا ہوں وہ پسند نہیں آتا ۔

نزہت ۔تم سے بَیر ہے۔ خدا کے لئے ایسی بات تو نہ کہو۔ تم خوب جانتے ہو کہ انھیں تم سے کس قدر محبت ہے۔

شاہد :۔ اور وہ خوب جانتے ہیں کہ مجھے تم سے کس قدر، کس قدر، کس قدر محبت ہے ۔ پھر بھی میرے اور تمہارے بیچ میں حائل ہیں۔

نزہت ۔ شاہد! ذرا انصاف سے کام لو۔ ابّا جان نہ شاعر ہیں نہ افسانہ نگار وہ ایک عملی آدمی ہیں اور ہر چیز کو عملی پہلو سے دیکھتے ہیں۔ انھیں یہ خیال ہے کہ تمہارا افسانہ نگاری کے سوا اور کوئی شغل نہیں ۔ اور اس سے تم ہرگز اتنا نہیں کما سکتے کہ اپنا اور میرا پیٹ بھر سکو ۔اسی لئے ۔

شاہد ۔غضب ہو گیا نزہت تم بھی ایسی باتیں کرنے لگیں ۔ پیٹ ! پیٹ! ایک پیکرِ شعر، روح لطافت، جانِ لطافت کی زبان پر ایسا غیر شاعرانہ، ایسا کثیف لفظ۔ پیٹ!

نزہت ۔ کیا بیہودہ لفظ کہہ رہے ہو شاہد ۔ تمھیں شرم نہیں آتی ۔

شاہد ۔ میں کہہ رہا ہوں یا تم کہہ رہی ہو ۔ پیٹ ۔ عمل ۔ کمانا ۔ یہ سب الفاظ ضروری سہی ۔ مگر نزہت کی زبان سے ۔ میری افسانہ نگاری کے متعلق اے عشق و رومان کے خدا کیا تیری یہی مرضی ہے ۔

نزہت ۔ ذرا سنبھلو شاہد ، ہوش میں آؤ ۔ میں اپنی نہیں ابا جان کی رائے بیان کر رہی تھی ۔

شاہد :۔ ابا جان کی رائے ؟ تو یہ رائے تمھاری نہیں ۔ لاحول ولاقوۃ ! میرا یہ سارا جوش بالکل بے محل تھا ۔

چوں چراغان شب مہتاب بیجا سوختیم

ابا جان کی رائے کی کسے پروا ہے ۔

نزہت ۔ پروا کیوں نہیں شاہد ۔ ہماری قسمت کا فیصلہ انھیں کے ہاتھ میں ہے ۔

شاہد ۔ انھیں کے ہاتھ میں ہے ۔ سچ کہتی ہو نزہت ۔ بیشک اُنہی کے ہاتھ میں ہے ۔ تو پھر اب کیا کریں ۔

نزہت :۔ وہی تو کہہ رہی تھی کہ تم ایک دم سے شب مہتاب کی پھُل جھڑی بن گئے ۔ دیکھو شاہد ، ذرا جاگ کر ۔ آنکھیں مل کر ، کان لگا کر سنو ۔ یہ ہم دونوں کے لئے بہت ہی نازک موقع ہے ۔ سب کچھ اس پر موقوف ہے

کہ ابا جان پر اس آخری تدبیر کا کیا اثر ہوتا ہے۔

شاہد:۔ بے شک ہم دونوں کی زندگی کا بننا بگڑنا۔ ہمارے دلوں کی بستی کا بسنا اُجڑنا، ہمارے ستاروں کا ملنا نہ ملنا، تمنا کی کلیوں کا کھلنا نہ کھلنا سب کچھ اسی پر موقوف ہے۔

نزہت۔ اگر ابا جان اس بات سے کہ تم نے اپنی پہلی کتاب ان کے نام معنون کی ہے خوش ہو گئے تو تمھیں ایک بار پھر شادی کی درخواست کرنے کا موقع مل جائیگا خدا نے چاہا یہ نوبت آئی تو وہ تم سے تمھاری آئندہ زندگی کے متعلق سوال کریں گے اس وقت تم کیا کہو گے۔

شاہد:۔
آج ہم اپنی پریشانیٔ خاطر ان سے
کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھیے کیا کہتے ہیں

نزہت:۔ پیارے شاہد اگر تمھیں مجھ سے سچ مچ محبت ہے اور تم چاہتے ہو کہ ابا جان تمھارا پیام قبول کر لیں تو خدا کے لئے جو میں کہتی ہوں وہی کرنا، تم ان سے یہ کہنا کہ میں زندگی کی ذمہ داریوں کو اچھی طرح جانتا ہوں اور ان کا بوجھ اٹھانے کو تیار ہوں۔ انھیں سمجھانا کہ ایک محنتی، فرض شناس اور معاملہ فہم آدمی افسانہ نگاری کر کے بھی اپنا پیٹ ــــ توبہ ــــ اپنی روزی کما سکتا ہے۔ اگر اشارے اشارے میں یہ بھی کہہ دو تو اچھا ہے کہ اگر افسانہ نگاری سے کسی طرح کام نہ چلا تو تم اور کوئی کام کرنے پر تیار ہو جاؤ گے۔ اگر انہیں صرف اتنی بات پر بھی یقین آ گیا کہ کم سے کم تم اپنے

ذرائض کو محسوس کرتے ہو تو کوئی تعجب نہیں کہ ان کی رائے بدل جائے۔ اور وہ تمہاری درخواست کو منظور کر لیں۔

شاہد:- اچھا پیاری نزہت میں دل وجان سے یہ وعدہ کرتا ہوں کہ اپنی سی کوشش کروں گا۔ مگر مجھ سے یہ رومان سوز باتیں کہی کیونکر جائیں گی۔ اور وہ انھیں مجھ جیسے شخص کی زبان سے سن کر مان کیسے لیں گے۔ اے عشق ورومان کے خدا۔

دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

نزہت:- ہاں اور باتوں کے بیچ میں شعر نہ پڑھنا، اس سے انھیں چڑ ہے اور گفتگو افسانوی زبان میں نہیں بلکہ بھلے آدمیوں کی روزمرہ زبان میں کرنا۔ اچھا اب جاؤ ورنہ آبا جان سو جائیں گے۔ ان کے آرام کا وقت آرہا ہے۔

شاہد:- دل پھر طوافِ — نہیں اب ہرگز شعر نہیں پڑھوں گا۔ خدا حافظ پیاری نزہت۔ یا قسمت یا نصیب۔

دوسرا سین

(واجد حسین کا سونے کا کمرہ، بڑے میاں بستر پر لیٹے ہیں، حقّہ منہ سے لگا ہے۔ کتاب ہاتھ میں ہے۔ شاہد داخل ہوتا ہے)

شاہد:- آداب عرض ہے چچا جان!

واجد حسین:- کون؟ شاہد؟ جیتے رہو۔ کیسے آئے؟۔

شاہد:۔ جی کچھ نہیں۔ یوں ہی حاضر ہو گیا۔

واجد حسین:۔ یوں ہی حاضر ہو گئے تو فوراً غائب ہو جایئے۔ یہ میرے آرام کا وقت ہے۔ یونہی حاضر ہونے والوں کے لئے مجھے فرصت نہیں۔

شاہد:۔ کچھ عرض بھی کرنا تھا۔ اور یہ کتاب۔

واجد حسین:۔ عرض آپ کو کتنی دیر کرنا ہے۔ اور یہ کتاب کیا ہے؟

شاہد:۔ جی ذرا دیر لگے گی۔ اور یہ کتاب۔

واجد حسین:۔ دیر لگے گی تو دو گھنٹے بعد تشریف لایئے گا۔ ابھی میں ذرا دیر سوؤں گا۔ اور پھر نماز پڑھوں گا۔ ہاں، یہ کتاب کیا ہے؟

شاہد:۔ میرے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ابھی چھپ کر آیا ہے۔

واجد حسین:۔ افسانوں کا مجموعہ۔ آپ کے افسانوں کا مجموعہ۔ اور یہ آپ میرے لئے لے کر آئے ہیں۔ میں اس عنایت کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ مجھے افسانوں اور داستانوں سے شوق نہیں۔ اسے میز پر رکھ دیجئے۔ اور آپ تشریف لے جایئے۔ دو گھنٹے بعد تشریف لایئے گا۔

شاہد:۔ (دبے ہوئے غصے کے لہجے میں) یہ کتاب میں نے آپ کے نام معنون کی ہے۔ مگر آپ کو شوق ہی نہیں تو رکھ کر کیا کروں۔ واپس لئے جاتا ہوں۔

واجد حسین:۔ میرے نام معنون کی ہے؟ کس کی اجازت سے؟

شاہد:۔میں نے بے اجازت یہ جسارت کی، معافی چاہتا ہوں۔

واجد حسین۔ جب آپ نے جسارت کی نواب مجھے کتاب دکھینی ہی پڑی۔ معافی کا معاملہ اس کے پڑھنے کے بعد طے ہوگا۔ لاؤ کتاب مجھے دے جاؤ۔ اور اب دو گھنٹے نہیں بلکہ تین گھنٹے کے بعد آنا۔ ٹھیک چار بجے۔

(جو کتاب ہاتھ میں ہے اسے رکھ دیتا ہے اور شاہد کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے)۔

شاہد:۔(کتاب اسے دے کر) بہت اچھا چار بجے حاضر ہوں گا۔

(شاہد چلا جاتا ہے۔ واجد حسین کتاب کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتا ہے)

واجد حسین۔(آپ ہی آپ) کتاب کی تیاری تو خاصی ہے۔ بقول نقادوں کے لکھائی چھپائی نفیس، سرورق سادہ اور خوشنما۔ غنیمت ہے کہ اس پر کوئی جناتی تصویر نہیں۔ قیمت دو روپے بہت ہے۔ کون خریدے گا؟ آخر میرے نام معنون کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ کچھ نہیں۔ محض خوشامد۔

"چچا جان کے نام" جن کے مہر پدری ...... یتیم بھتیجے
...... نازک پودے ...... حرارت اور قوت ..."
جذبات پرستی اور لفاظی کی محبت ...... سخت گیری
زندہ دلی .. خشک مزاجی ... ذوق ادب کھلا گیا مگر

مرجھایا نہیں۔ شعر بہت بہ گئی مگر ڈوبی نہیں۔" خوشامد کے ساتھ ساتھ چوٹیں۔ ہجو ملیح یہ لیجئے شعر بھی آگیا۔ بغیر شعر کے کھانا کیونکر ہضم ہوتا۔

گو میں رہا رہینِ ستمہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

(آواز پر نیند کا اثر ہے)

شعر تو برا نہیں۔ مومن کا معلوم ہوتا ہے۔ نہیں توبہ۔ غالب کا شعر ہے "رہینِ ستمہائے روزگار" اسی کے حصہ کی ترکیب ہے۔ دو دو اضافتیں اور پھر ثقیل نہیں۔ الفاظ میں ترنم ہے۔ اجی الفاظ گئے چولھے میں اور ترنم گیا جہنم میں۔ مضمون پر غور کیجئے۔ دل سے نکلی ہوئی بات ہے۔ سنتے ہی دل میں اتر جاتی ہے۔

گو میں رہا رہینِ ستمہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

سبحان اللہ لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا۔ ترے خیال سے غافل نہیں رہا۔ مگر کس کے خیال سے؟ آخر اس لڑکے کا مطلب کیا ہے؟ اسے کیا معلوم کہ میں کسی کے خیال میں رہا کرتا ہوں۔ اسے کیا حق ہے کہ میری زبان سے، میرے دل کی زبان سے کہے۔ "ترے خیال سے غافل نہیں رہا"۔ (آواز پر نیند کا اثر بڑھ جاتا ہے)۔ ہائے لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا۔ نگہت، پیاری نگہت واحد ترے خیال سے غافل نہیں رہا۔ ترے۔ خیال۔ سے۔ غا۔ فل۔

(خرّاٹوں کی آواز)

(نگہت کی مجسّم شبیہ پلنگ کے پاس کھڑی نظر آتی ہے)

نگہت :- واجد!

واجد :- ہائیں! نگہت! یا اللہ کیا اسرار ہے؟

نگہت :- اسرار کچھ بھی نہیں. تم نے بلایا میں آگئی۔

واجد :- (اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے) سچ کہو؟ یہ تم ہو یا تمھاری خیالی تصویر؟

نگہت :- خبردار اٹھنا نہیں! نہ میں ہوں نہ میری خیالی تصویر. جو کچھ بھی ہے وہ غائب ہو جائے گا. کہو کیا حال ہے؟ یہ بیس برس کیسے گذرے

واجد :- گو میں رہا رہینِ ستمہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

نگہت. میرے خیال سے غافل نہیں رہے. لیکن میری بچی سے غافل ہو گئے۔ جسے میں دنیا سے جاتے وقت دو برس کا چھوڑ گئی تھی۔ اللہ کے بعد تمھارے بھروسے پر۔

واجد :- ایسا تو نہ کہو پیاری نگہت، میں نے نزہت کو ہمیشہ اپنی جان سے بڑھ کر سمجھا. اس کی خوشی پر اپنی خوشی، اس کے آرام پر اپنا آرام قربان کر دیا۔ یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ میری شفقت پدری نے مہر مادری کی کمی کو پورا کر دیا

لیکن تم اسے دیکھو تو ماشاء اللہ کیسی حسین، لائق، خوش خلق خوش سلیقہ، خوش دل لڑکی ہے۔ حسن تو خیر خدا کی دین اور تمہاری یادگار ہے۔ لیکن اور باتوں میں میری جاں فشانی کو بھی دخل ہے۔

نگہت:۔ مجھے انکار نہیں کہ تم نے اس کو بڑی محبت اور محنت سے پالا۔ اور اس کے لئے میرا رواں رواں تمہیں دعا دیتا ہے۔ لیکن جب وہ چشم بد دور پروان چڑھی اور بیاہ کے قابل ہوئی تو تم نے اپنی ضد کے آگے اس کی خوشی کی خاک بھی پروا نہ کی۔ تم کہتے ہو وہ خوش دل ہے۔ اس وقت جا کر دیکھو کہ اس کے دل کا کیا حال ہے۔

واجد۔ تم چاہتی ہو کہ میں اس نکمے شاہد کو دے کر نزہت کی زندگی برباد کردوں وہ لڑکا جسے افیونیوں کی طرح داستان گوئی کے سوا کوئی شغل ہی نہیں، مر پڑ کر ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی تو ہو گیا مگر اب نہ نوکری کرنے پر راضی ہوتا ہے نہ وکالت کرنے پر۔ رہی افسانہ نگاری سو اردو کے افسانوں کو کوئی ٹکے کو بھی نہیں پوچھتا۔ افسانے لکھ کر کیا خود کھائے گا کیا بیوی کو کھلائے گا۔ میں جانتا ہوں کہ ساتھ ساتھ رہتے رہتے نزہت کو اس سے ایک قسم کا انس ہو گیا ہے مگر جب تک یہ امید نہ ہو کہ وہ اپنا اور اس کا بوجھ اٹھا سکتا ہے میں کس طرح آنکھیں بند کرکے لڑکی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دوں۔ ابھی تھوڑی دیر میں آنے والا ہے۔ اگر اس نے یہ ذکر چھیڑا تو میں صاف کہہ دوں گا کہ یا تو کوئی ایسا

پیشہ اختیار کرے جس میں معقول آمدنی ہو۔ ورنہ نزہت کا خیال چھوڑ دے۔

نگہت :۔ اچھا اب ان باتوں کو چھوڑو واجد۔ آؤ کچھ بیتی ہوئی گھڑیوں کا ذکر کریں۔ تمھیں وہ رات یاد ہے جب ہم دونوں اپنی شادی کی پہلی سالگرہ منانے کشتی میں بیٹھ کر گنگا کی سیر کو گئے تھے۔ چودھویں کا چاند بیچ آسمان میں چمک رہا تھا اور دور دور تک ہر چیز کو چمکا رہا تھا۔ اس کے حسن کی چھوٹ آسمان سے زمین تک پھیلی ہوئی تھی۔ چاندنی درختوں پر برس رہی تھی۔ زمین پر بچھی تھی اور گنگا کے شفاف پانی کے ساتھ گھل مل کر بہہ رہی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی۔ دھیمی دھیمی ہوا سے سطح آب پر ہلکی ہلکی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ہم دونوں ساری دنیا سے بے خبر ایک دوسرے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ بتاؤ تمھیں یاد ہے؟۔

واجد :۔ یاد ہے پیاری نگہت۔

شب ماہ تھی چاندنی کا سماں تھا
وہ پہلو میں تھے اور خدا مہرباں تھا

نگہت۔ وہ شب روشنی جس میں دن سے زیادہ
زمیں پر سے اک نور تا آسماں تھا

واجد :۔ مبارک شب قدر سے بھی وہ شب تھی
سحر تک مہ و مشتری کا قراں تھا

نگہت :۔ حقیقت دکھاتا تھا عشق مجازی

نہاں جس کو سمجھے ہوئے ہیں عیاں تھا

واجد۔ بیاں خواب کی طرح جو کر رہا ہے

یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا

نگہت :- اور اس وقت تم ہم مل کر خسرو کی غزل گا رہے تھے۔

واجد۔ ہائے، خوب یاد ہے۔

بہ خوبی ہمچو مہ تابندہ باشی

بملکِ دلبری پائندہ باشی

نگہت :- ز قیدِ دو جہاں آزاد باشم

اگر تو ہمنشینِ بندہ باشی

واجد :- منِ درویش را کشتی بغمزہ

کرم کردی الٰہی زندہ باشی

نگہت :- ستم کم کن کہ فردا روزِ محشر

بہ روئے عاشقاں شرمندہ باشی

واجد۔ بخوبی و بشوخی ہمچو خسرو

ہزاراں خانماں برکندہ باشی

نگہت :- اچھا وہ سماں تو تمھیں یاد ہے۔ مگر اس کے بعد کا واقعہ بھول گئے جب ہم تین بجے رات کو گھر واپس آئے اور ابا جان نے تمھاری خوب خبر لی۔

واجد: ۔ نہیں بھولا نگہت ۔ اور مرتے دم تک نہیں بھول سکتا۔ اسی واقعہ نے تو میری زندگی میں کایا پلٹ کر دی ۔

نگہت! ۔ ان سے تم سے شروع ہی سے اختلاف تھا، وہ کہتے تھے وکالت چھوڑ کر نوکری کر لو۔ تم کہتے تھے کہ نوکری سے مجھے دلی نفرت ہے۔ میں دنیا میں آزادی کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔ وہ کہتے تھے وکالت کے پیشے میں تمھارے لئے کامیابی کا کوئی موقع نہیں ۔ اور نوکری میں تمھیں ریاست میں اچھی سے اچھی دلوا سکتا ہوں، تم کہتے تھے کہ میں بری سے بری وکالت کو اچھی سے اچھی نوکری پر ترجیح دیتا ہوں۔ غرض تم کسی طرح نہیں مانتے تھے ۔

واجد ۔ ظاہر ہے کہ کوئی اور بات ہوتی تو مان بھی لیتا ۔ اپنی آزادی کے قربان کرنے کا معاملہ تھا۔

نگہت ۔ پھر اس رات سیر سے لوٹنے کے بعد کیا ہوا؟

واجد : ۔ ہم بڑی خاموشی سے گھر میں داخل ہوئے کہ اوروں کو خبر نہ ہو مگر بڑے میاں جاگ رہے تھے معلوم ہوتا ہے افیون کھاتے تھے ۔

نگہت : ۔ خدا نہ کرے ان کے دشمن افیم کھاتے ۔ بات یہ تھی کہ انھیں ہم دونوں کے باہر جانے کا حال معلوم ہو گیا تھا۔ وہی آدمی اور پھر بیٹی داماد کی محبت، پریشانی اور انتظار میں نیند نہیں آئی ۔

واجد۔ خیر کچھ بھی ہو ہم نے دروازہ میں قدم رکھا تھا کہ کھٹ سے نکل آئے

اور مجھے اپنے کمرہ میں لے جا کر برس ہی تو پڑے۔ کہنے لگے کہ اسی لئے نوکری نہیں کرتے کہ دن بھر گپ شپ اور رات کو آوارہ گردی کی آزادی کیسے ملے گی اگر یہی لیل و نہار رہے تو وکالت چل چکی۔ تم تو خیر بھیک مانگ کر گذر کر لو گے مگر میری نگہت کا کیا انجام ہو گا۔ اگر یہ وعدہ کرتے ہو کہ کل ہی وکالت پر لعنت بھیجکر دو پہر کی گاڑی سے میرے ساتھ دیوان بہادر کے پاس چلو گے تو خیر ورنہ عمر بھر تمھاری صورت یہاں نہ دیکھوں گا۔

نگہت :- پھر تم نے کیا کہا؟

واجد۔ ان کی دل خراش تقریر کا ہر لفظ میرے دل میں تیر کی طرح لگ رہا تھا۔ خصوصاً بھیک مانگنے کے فقرے کو سن کر میں تڑپ اٹھا۔ پھر بھی کسی نہ کسی طرح ضبط سے کام لے کر میں نے نہایت نرمی سے کہا کہ ماموں جان میں نے وکالت کا پیشہ محض ضد یا خود رائی سے اختیار نہیں کیا ہے بلکہ بہت سوچ سمجھ کر۔ مجھے یقین ہے کہ میری طبیعت اس پیشے سے خاص مناسبت رکھتی ہے۔ اسی میں مجھے اپنے جوہر ذاتی کے اظہار کا اور ملک و قوم کی خدمت کا موقع مل سکتا ہے۔ اسی سے ایک دن میں اپنے استحقاق کے مطابق عزت و شہرت اور اپنی ضرورت کے لائق روپیہ بھی حاصل کر لوں گا۔ آپ میرے بزرگ ہیں اور آپ کی اطاعت کو میں اپنی سعادت سمجھتا ہوں لیکن زندگی کے نصب العین کے معاملے میں اپنے ارادے کو آپ کے ارادے کے تابع کر دینا ایسا ہے۔ جیسے

میں انسانیت کے درجہ سے گر کر جانوروں کی سطح پر آجاؤں اور وہ بھی آزاد شیر کی نہیں بلکہ پالتو کتے کی سطح پر۔

نگہت :- اس پر ابّا جان بہت برہم ہوئے ہوں گے۔

واجد: میں اس وقت اپنے جوش کی رَو میں بہ رہا تھا۔ مجھے خبر نہ تھی کہ ان پر کیا اثر ہو رہا تھا۔ ساری تقریر تو یاد نہیں رہی مگر اتنا یاد ہے کہ آخر میں میں نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ آپ کا یہ فرمانا بالکل درست ہے کہ اب تک میں نے وکالت کا کام پوری توجہ سے نہیں کیا۔ اب انشاء اللہ کوئی مجھ پر گپ شپ اور آوارہ گردی میں وقت ضائع کرنے کا الزام نہیں لگا سکے گا۔ چونکہ آپ آئندہ سے میری صورت دیکھنا نہیں چاہتے اس لئے کل صبح میں یہاں سے ہوٹل میں اُٹھ جاؤں گا اور دو چار دن میں دوسرے مکان کا بندوبست کر لوں گا۔ اس وقت آپ کی اجازت سے آپ کی صاحبزادی بھی میرے پاس آجائیں گی۔

نگہت :- اس کے تیسرے ہی دن میں تمھارے پاس اُٹھ گئی اور ہم خوشی خوشی آزادی، تکلیف اور تنہائی کی زندگی بسر کرنے لگے۔ مگر یہ تو بتاؤ واجد تمھیں اپنے اس دن کے فیصلے پر کبھی افسوس تو نہیں ہوا۔

واجد :- افسوس ہرگز نہیں۔ اس فیصلے سے تو میری زندگی بن گئی اگرچہ اس کے بعد دو تین برس بیحد سختیاں اٹھانی پڑیں انھیں تم مجھ سے بہتر جانتی ہو مگر پھر خدا نے فراغت عطا کی اور تمھارے حسنِ انتظام نے گھر کو گلزار بنا دیا۔ باہر کامیابی

اور ہر دل عزیزی اور اندر ہماری باہمی محبت ان دونوں چیزوں کی بدولت دُنیا میں جنّت کا لطف آنے لگا۔ نزہت کا پیدا ہونا ہماری راحت و مسرت کی معراج تھی۔ ہائے افسوس اسی دن سے تقدیر نے آنکھیں پھیر لیں، تمھاری بیماری کا سلسلہ شروع ہو گیا اور دو برس کے اندر تم مجھے تنہا چھوڑ کر دنیا سے چل بسیں

روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

نگہت:- خیر واجد، صبر کرو، مرضی الٰہی میں کیا چارہ ہے۔ مگر اب ذرا ایک بات سوچو، جو صورت ہمیں تمھیں اس یادگار رات کو پیش آئی تھی قریب قریب وہی آج شاہد اور نزہت کو بھی درپیش ہے۔

واجد:- ہاں یہ تو تم نے سچ کہا۔ البتہ ہماری شادی ہو چکی تھی اور ان دونوں کی ابھی نہیں ہوئی ہے۔

نگہت:- گویا ان کی مصیبت اور بھی زیادہ سخت ہے۔ ہم دونوں کو تو ابا جان کے مزاج کی وجہ سے صرف گھر ہی چھوڑنا پڑا تھا مگر ان دونوں کی طرف سے یہ اندیشہ ہے کہ کہیں تمھاری خود پرستی، ضد اور ناانصافی کی بدولت ایک دوسرے کو نہ چھوڑنا پڑے۔

واجد۔ میری خود پرستی۔ اور کیا۔ کیا۔ مگر پیاری نگہت اگر شاہد عقل سے کام لے تو مجھے کیتے نے کاٹا ہے کہ ان دونوں کی شادی میں رکاوٹ ڈالوں۔

نگہت :- عقل سے کام لینے کے معنی یہی ہیں ناکہ زندگی کے نصب العین کے بارے میں اپنے ارادے کو تمھارے ارادے کے تابع کر دے، انسانیت کے درجے سے گر کر جانوروں کی سطح پر آجائے۔ اور وہ بھی آزاد شیر کی نہیں بلکہ پالتو کتے کی سطح پر۔

واجد :- یہ تو تم نے میرے اس روز کے الفاظ مجھ ہی پر الٹ دیئے مگر یہ تو دیکھو کہ میری اور شاہد کی حالت میں کتنا فرق ہے، کہاں وکالت، کہاں افسانہ نگاری۔

نگہت :- بے شک دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے، وکالت تمھارا نصب العین تھا اور افسانہ نگاری شاہد کا نصب العین ہے، اس میں تمھیں اپنے جوہر ذاتی کا اظہار اور ملک و قوم کی خدمت کا موقع ملتا تھا، اس میں شاہد کو ملتا ہے۔

واجد :- نگہت! یہ کیا کہہ رہی ہو خدا مجھے اس دن کو زندہ نہ رکھے کہ میں کسی کو اپنے جوہر ذاتی کے اظہار یا ملک و قوم کی خدمت سے روکوں۔ لیکن یہ تو تم مانو گی کہ اپنی اور اپنے متعلقین کی روزی کی فکر کرنا انسان کا سب سے پہلا فرض ہے، افسانہ نگاری سے شاہد نے آج تک ایک پیسہ بھی نہیں کمایا اور نہ آئندہ کوئی امید ہے۔

نگہت :- ابا جان بھی تمھاری وکالت کے پہلے سال میں یہی کہا کرتے تھے

کہ نہ تم نے اس سے پیسہ کمایا اور نہ آئندہ امید ہے۔

واجد :- پیاری نگہت میں ہارا تم جیتیں، تمھارے آگے میری وکالت کبھی چلی تھی جو آج چلے گی۔ بتاؤ تم کیا چاہتی ہو؟۔

نگہت :- واجد تم پہلے بھی مجھ سے اسی لئے ہارتے تھے کہ خود ہارنا چاہتے تھے اور اس وقت بھی تم نے اسی لئے ہار مانی کہ میں تمھارے ہی دل کی بات کہہ رہی ہوں۔ آواز میری ہے اور خیالات تمھارے ہیں سنو میں وہی چاہتی ہوں جو تم چاہتے ہو۔ دل کی گہرائی میں، خود پرستی، ناانصافی اور ضد کے پردوں کے اندر۔ جب شاہد آئے تو اس سے شفقت سے پیش آؤ اور زہرت کی نسبت اس سے منظور کر لو۔ اسے موقع دو کہ سچی محبت کے سایہ میں اپنی اپج سے بڑھے، پھیلے اور پھلے پھولے۔ اپنی بیل آپ منڈھے چڑھ جائے! اپنی زندگی آپ بنائے۔ جسے تم اس کی خودرائی کہتے ہو وہ اس کی خودداری اور خود اعتمادی ہے، اسے برباد نہ کرو، ورنہ وہ برباد ہو جائیگا جس شخص کو اپنے ارادے پر، اپنی قوت پر، اپنے آپ پر بھروسہ نہ رہے وہ جانوروں سے بھی بدتر ہے۔ اینٹ پتھر کے برابر ہے۔

واجد :- مانتا ہوں پیاری نگہت، دل و جان سے، جان و ایمان سے مجھے اجازت دو کہ دم بھر کے لئے اٹھ کر ــــ ارے یہ کیا ہوا؟ تم کہاں چلی گئیں؟ نگہت، پیاری نگہت!

تیسرا سین

دیوان خانہ

(واجد حسین اور شاہد میں گفتگو ہو رہی ہے)

واجد حسین :- بھئی شاہد! میں نے تمھارے دو افسانے پڑھے، ماشاء اللہ اس عمر میں تم انسانی فطرت کے مطالعہ میں وہ نظر رکھتے ہو جو ہم بوڑھوں کو نصیب نہیں خصوصاً یہ تمھاری حصہ کی چیز ہے کہ عقل و تدبیر اور مصلحت و دور اندیشی کے بھیس میں ان ازلی اور ابدی جذبات کو صاف پہچان لیتے ہو جو ہمیشہ سے انسان کے عمل کے محرک رہے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔

شاہد :- (آہستہ سے) خدا خیر کرے، آج حضرت نے طنز کا طرز اختیار کیا ہے۔ (زور سے) چچا جان یہ ابتدائی چیزیں ہیں اس وقت تک میری طبیعت پر رومانی رنگ غالب تھا اب جو لکھ رہا ہوں اس میں آپ یہ بات نہ پائیں گے۔

واجد حسین :- رومانی اومانی تو میں جانتا نہیں مگر اتنا جانتا ہوں کہ اگر تمھارے افسانوں میں یہ بات نہ رہی تو پھر کوئی نئی بات نہ رہے گی۔ میں شکر گزار ہوں کہ تم نے انھیں میرے نام سے نسبت دی۔ گو میں اس کا اہل نہ تھا۔

شاہد :- یہ آپ کیا فرماتے ہیں چچا جان، آپ کے نام معنون ہونے سے اس مجموعہ کی قدر و قیمت بڑھ جائے گی۔ آپ کا نام میرے نام کو دنیا سے روشناس کر دے گا۔

واجد حسین:۔ قدر و قیمت، روشناس؟ یہ کیا فضول بک رہے ہو، تم نے اس کتاب کا انتساب مجھ سے اس وجہ سے کیا ہے کہ میرے بھتیجے ہو یا کسی تجارتی غرض سے؟

شاہد:۔ آپ کا بھتیجا ہونا خود ہی ایک تجارتی غرض ہو تو کیا کیا جائے۔

واجد حسین:۔ تو افسوس کیا جائے اور صبر کیا جائے۔ اچھا اب قصے کو چھوڑو تمھیں مجھ سے کیا باتیں کرنی ہیں؟۔

شاہد:۔ چچا جان مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ میں ..... میں .... آپ ....

واجد حسین:۔ یہ ضمیر کی گردان کیوں شروع کر دی؟ صاف کیوں نہیں کہتے۔ تم میرے چھوٹے ہو مگر بچے نہیں۔ آخر ڈر کاہے کا ہے۔ میں تمھیں کھا جاؤں گا؟

شاہد:۔ چچا جان پچھلی بار کچھ ایسی ہی صورت پیش آئی تھی۔

واجد حسین:۔ اچھا یہ بات ہے، آج پھر نزہت سے شادی کی درخواست لے کر آئے ہو۔

شاہد:۔ جی ہاں۔

واجد حسین:۔ تو پھر پیش کرو تاکہ مناسب احکام صادر کئے جائیں۔ ٹھیرو یہ میں کیا کہہ رہا ہوں، بیٹا شاہد، تم بھائی صاحب مرحوم کی نشانی ہو۔ میں نے تمھیں اور نزہت کو ساتھ ساتھ پالا ہے اور تم دونوں کو اپنی زندگی کا

سہارا سمجھتا ہوں۔ میرے لئے اس سے بڑھ کر کیا خوشی کی بات ہو سکتی۔
تم دونوں کی زندگی ہم ساز و ہم آہنگ ہو جائے۔ مگر مجھے پہلے دو باتوں کا
اطمینان ہونا چاہیئے۔ ایک، یہ کہ تم دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہے۔
دوسرے یہ کہ تم نزہت کو خوش رکھ سکتے ہو۔

شاہد: ۔ چچا جان! آپ کے ان الفاظ نے میرے دل میں امید کی سوکھی ہوئی کھیتی کو ہرا کر دیا۔

جن دو باتوں کا اطمینان آپ چاہتے ہیں، ان میں سے پہلی کے بارے میں کچھ کہنے سے مجھ کو اور نزہت کو شرم روکتی ہے ورنہ آپ کے کانوں میں ہماری محبت کے ترانے گونجتے ہوتے۔ پھر بھی اگر آپ اسے یہاں بلا لیں تو ہماری آنکھیں وہ داستان کہہ سنائیں گی جو ہماری زبانیں کہہ سکیں۔

واجد حسین: ۔ شاباش۔ اب دوسری بات۔

شاہد: ۔ دوسری بات، چچا جان..... دیکھئے ابھی عرض کرتا ہوں ..... (ذرا سوچ کر) دوسری بات کے متعلق صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ اگرچہ بدقسمتی سے میری ساری پونجی لے دے کر یہی افسانہ نگاری ہے جس کی آج بازار میں قیمت نہیں اٹھتی لیکن میں پرانے فیشن کے ادیبوں میں سے نہیں ہوں جو اپنے پیشے کے کاروباری پہلو سے غافل رہتے ہیں۔ مجھے اپنی ذمہ داری کا پورا احساس ہے۔ میں دل و جان سے کوشش کروں گا کہ اپنے کاروبار کو فروغ دوں۔ ایک تو زیادہ

سے زیادہ مال پیدا کروں گا۔ دوسرے آئندہ سے اپنی کتابیں ناشروں کو دینے کے بجائے اپنے خرچ سے چھپوا کر خود رکھوں گا اور کتب فروشوں کو کمیشن پر دے دیا کروں گا، تیسرے آپ ہی اپنا ایجنٹ بن کر ملک کا دورہ کروں گا تاکہ مال کی کھپت کا انتظام کروں۔ اور زیادہ سے زیادہ آرڈر فراہم کروں۔

واجد حسین۔ معقول، اور کچھ؟

شاہد۔ یہ تو ظاہر ہے کہ آج ہندوستان میں اردو کتابوں کی مانگ بہت کم ہے اس لئے لوگوں میں کتب بینی کا مذاق پیدا نہیں ہوا۔ لیکن اب کتب فروشوں اور مصنفوں نے جدید اصول کے مطابق اشتہار دینا اور پرچار کرنا شروع کر دیا ہے۔ اُدھر سیاسی تغیرات کی وجہ سے عام تعلیم پھیل رہی ہے اور وہ طبقہ بڑھتا جا رہا ہے جس میں کوشش کرنے سے کتابوں کے گاہک بن سکتے ہیں اس لئے کتابوں کے کاروبار کا مستقبل روشن ہے۔ انشاء اللہ ایک دن میرا کام چمکے گا بازار گرم ہوگا۔ میری آمدنی بڑھ جائے گی۔ میں بے شمار دولت جمع کروں گا اور وہ سب اپنی ۔۔۔ آپ کی نزہت کے قدموں میں ڈال دوں گا۔

واجد حسین۔ کہہ چکے، یا کچھ باقی ہے؟

شاہد:۔ بس ایک بات رہ گئی۔ بفرضِ محال اگر میں نے دیکھا کہ ساری کوششوں کے باوجود افسانہ نگاری کا کاروبار کامیاب نہیں ہوتا تو شاید میں اسے چھوڑ کر کوئی ایسا کام کرنے پر تیار ہو جاؤں جس میں زیادہ آمدنی ہو۔ پیارے چچا جان

اب تو آپ کو یقین ہو گیا کہ میں نزہت کو خوش رکھ سکوں گا۔

واجد حسین :۔ پیارے بھتیجے اب مجھے یقین ہو گیا کہ تم نزہت کو ہرگز خوش نہیں رکھ سکتے۔ تمھارے آنے سے پہلے میں دل میں طے کر چکا تھا کہ نزہت کی نسبت تم سے کر دوں گا۔ اس لئے کہ میں تمھیں ایک اعلیٰ درجہ کا بلند حوصلہ عالی ظرف ادیب سمجھتا تھا جسے اپنے پیشے سے محبت ہے۔ مگر اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ قیامت تک نزہت کی تقدیر تم سے نہ پھوٹنے دوں گا۔ اس لئے کہ تم ایک ادنیٰ، تنگ دل پست خیال دو کا نار نکلے جسے صرف پیسے کا لالچ ہے۔

شاہد (آہستہ سے) واہ ری تقدیر۔ میں ہوا گا فر تو وہ ——

واجد حسین :۔ خدا حافظ اس مصنف کا جو زیادہ سے زیادہ مال پیدا کرنے پر کمر باندھ لے اور تصنیف کے شغل کے ساتھ ناشر، کتب فروش اور ایجنٹ کا بھی کام کرے۔ کیا ٹھکانا ہو گا اس کی تحریر، اس کے دماغ، اس کے اخلاق کی پستی کا۔ کہاں سے لائے گا وہ یکسوئی، وہ محویت، وہ جذب جو افسانہ نگار کی جان ہے؟ کہاں سے لائے گا وہ حق جوئی، وہ حق پرستی، حق گوئی جو ادیب کا ایمان ہے؟ شاہد اگر تم اس طرح کے کامیاب بازاری مصنف بن گئے اور تم نے اپنے خداداد جوہر کو ان داموں بیچ کر دنیا بھر کی دولت کمالی تو نزہت بلکہ ہر شریف لڑکی تم کو یوں ٹھکرا دے گی

(زمین پر ٹھوکر مارتا ہے)

شاہد :۔ چچا جان!

واجد حسین :۔ اور غضب تو یہ ہے کہ تم اپنی انسانیت کو سستے داموں بیچنے ہی پر نہیں بلکہ اسے مسخ کرنے پر بھی تیار ہو۔ اگر تم نے دیکھا کہ افسانہ نگاری میں ٹکے سیدھے نہیں ہوتے تو اسے چھوڑ کر کوئی اور دھندا کرنے لگو گے۔ بھلا تمھیں بتاؤ کہ نزہت جیسی غیور لڑکی کی نظر میں تمھاری کیا عزت رہ جائے گی۔ اور تم اسے کیا خوش رکھو گے؟

شاہد :۔ چچا جان خدا کے لیے بتایئے کہ جو کچھ آپ نے کہا وہ آپ ہی کے خیالات ہیں؟

واجد حسین :۔ یہ گستاخانہ سوال ہے۔ کیا میں طوطا ہوں۔ جو رٹا ہوا سبق سنا رہا ہوں؟

شاہد :۔ تو میں صدق دل سے اقرار کرتا ہوں کہ میں طوطا تھا جو رٹا ہوا سبق سنا رہا تھا۔ جن شعریت اور رومان کش خیالات کا اظہار میں نے کیا۔ ان میں سے ایک بھی میرا نہیں۔ یہ سب اول سے آخر تک خالص۔ کھرا، بے داغ جھوٹ تھا۔ مجھے ایک شخص نے جسے خدا خوش رکھے یہ مشورہ دیا کہ آپ کے سامنے کاروبار کی زبان میں گفتگو کروں اور یہ ظاہر کردوں کہ جیسے میں بڑا پکا دنیا دار ہوں۔ خدا گواہ ہے کہ جو فقرے میں نے آپ کے سامنے کہے یہ گھنٹوں سوچ کر گھڑے تھے۔ کاروبار کی جتنی اصطلاحیں یاد تھیں بڑی کوشش سے کھپائی تھیں۔ اُف بڑا دھوکا ہوا۔

واجد حسین :۔ جس شخص نے تمھیں یہ مشورہ دیا۔ اس نے ٹھیک کہا۔ اب سے

تھوڑی دیر پہلے تک مجھے خود اپنے صحیح خیالات کا اندازہ نہ تھا۔ میں اپنے آپ کو ایک مصلحت بیں، عاقبت اندیش، گرگ باراں دیدہ سمجھتا تھا۔ لیکن اتفاق سے ایک دوسرے عالم کی آواز میرے کان میں آئی جس نے مجھے جھنجوڑ کر اس خوابِ غفلت سے جگا دیا۔ میری آنکھوں سے پردے ہٹ گئے۔ اور مجھے اپنی روح کی اصلی صورت نظر آ گئی۔ معلوم ہوا کہ میں وہی جذبات پرور، خیال پرست، آزاد واجد ہوں جو اب سے تیس برس پہلے تھا۔ بہرحال خدا کا شکر ہے کہ اب دونوں طرف کی غلط فہمیاں دور ہو گئیں۔ اور حقیقت سامنے آ گئی اب کوئی وجہ نہیں کہ وہ چیز جو میری اور تمھاری دلی آرزو ہے فوراً طے نہ ہو جائے۔

(گھنٹی بجاتا ہے)

دیکھو ذرا نزہت کو بھیجو۔

(نزہت داخل ہوتی ہے)

نزہت :۔ ابا جان آپ نے یاد فرمایا۔

واجد حسین :۔ ہاں بیٹا مجھے تم سے ضروری باتیں کرنی ہیں۔ جن پر تمھاری آئندہ زندگی کا دار و مدار ہے۔ آج شاہد پھر تمھارے لئے پیام لے کر آئے ہیں جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے بہت غور کے بعد یہ رائے قائم کی ہے کہ یہ نسبت ہر طرح سے مناسب ہے۔ مگر ماشاء اللہ تم ۔

نزہت :۔ ابا جان جو آپ کی مرضی!

واجد حسین:- میری مرضی؟ اور جو میں اس نسبت کو مناسب نہ سمجھوں!

نزہت:- خدا نہ کرے!

واجد حسین:- شکر ہے۔ کم سے کم تمھارے خیالات کے بارے میں کسی غلط فہمی کی گنجائش نہیں۔

معدے کا مریض

پہلا منظر

(حکیم صاحب کا مطب، فرش بچھا ہے، مسند رکھا ہے، صدر خالی ہے حکیم صاحب کا شاگرد مسند کا کونا دبائے بیٹھا قلم بنا رہا ہے ایک مریض داخل ہوتا ہے)

مریض:- آداب عرض ہے حکیم صاحب۔

شاگرد۔ آیئے آیئے حکیم صاحب محلسرا میں ہیں، ابھی تشریف لاتے ہیں۔

مریض:- آپ بھی مریض ہیں، میں سمجھا حکیم صاحب ہیں۔

شاگرد۔ آپ کی پہلی تشخیص بھی غلط اور دوسری بھی۔ میں طب کا طالب علم ہوں ابھی تکمیل نہیں کی ہے۔ حکیم صاحب کے مطب میں بیٹھتا ہوں۔

مریض:- تو یہ کہیئے آپ نیم حکیم ہیں۔

شاگرد۔ آپ کا کام تمام کرنے کے لئے کافی ہوں۔ کہیئے کیا شکایت ہے؟

مریض:- ایک شکایت ہو تو کہوں میں تو سراپا شکایت ہوں ؎

پر ہوں شکوے سے میں یوں راگ سے جیسے باجا

اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھیئے کیا ہوتا ہے

شاگرد۔ تو حضرت معاف کیجیئے، حکیم صاحب خود ہی چھیڑیں گے، آپ کا مضراب انھیں کے پاس ہے۔

مریض۔ (گھبرا کر) مضراب کیسی؟ یہ تو ضَرَبَ یَضْرِبُ کا صیغہ معلوم ہوتا ہے۔ مارا اس نے۔ مارتا ہے اور مارے گا۔

شاگرد۔ جی بس ان کی انگلیاں مضراب ہیں۔ جہاں انھوں نے نبض کے تاروں کو چھیڑا آپ کا باجا خود بخود بجنے لگے گا۔ لیجیے حکیم صاحب آ گئے۔

حکیم صاحب:۔ اجی تشریف لائیے۔ میں آپ کی نبض دیکھتا ہوں۔ آپ کا حال؟

مریض۔ کیا عرض کروں حکیم صاحب۔ عجب درد لیست در معدہ۔

حکیم صاحب:۔ نثر میں ارشاد ہو۔

مریض:۔ ارشاد کیا خاک ہو۔ آپ نے تو ہنستے پر روک دیا۔

حکیم صاحب:۔ تفصیلِ طول کو ترک کیجیے، مختصر فرمایئے۔

مریض۔ قبلہ ابھی میں نے کون سی مطوّل بیان کیا ہے جو آپ مختصر کی فرمائش کرتے ہیں۔ غضب خدا کا برسوں کی بیماری اور آپ چاہتے ہیں کہ چند لمحوں میں اس کا حال بیان کر دوں۔ اچھا اب آپ ہی پر چھوڑتا ہوں۔ جو کہیئے وہ کہہ دوں۔

حکیم صاحب:۔ معدہ کا حال۔ آنتوں کا فعل۔ اشتہا، اجابت۔

مریض:۔ اللہ رے اختصار! بہت خوب! سنئے معدہ کا حال ناگفتہ بہ،

آنتوں کا قول وفعل دونوں ناقابل اعتبار۔ اشتہا کا بھوکا ہوں۔
اجابت کی دعا کرتا ہوں۔

حکیم صاحب:۔ فم معدہ میں کچھ درد کی خلش بھی ہے؟

مریض:۔ فم معدہ میں درد کی خلش، حضور فم معدہ میں قلب معدہ میں روح معدہ میں درد کی خلش نہیں بلکہ درد کا سیلاب ہے۔ درد کا طوفان ہے ؎

درد ہے یہ یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس معدے کے ہاتھوں مر چلے

حکیم صاحب:۔ (شاگرد سے مخاطب ہوکر) لکھو (نسخہ لکھواتے ہیں جس کے الفاظ سننے والوں کی سمجھ میں نہیں آتے۔ شاگرد لکھتا ہے)۔

مریض:۔ لیجئے اب وظیفہ ہونے لگا۔ خدا جانے نسخہ کی نوبت کب آئے گی۔

شاگرد۔ (مریض سے) یہ نسخہ لیجئے۔ رات کو بھگو دیا کیجئے اور صبح کو توڑ کے پی لیا کیجئے۔

مریض:۔ (نسخہ دیکھ کر) اخوہ کوئی تیس چالیس دوائیں ہوں گی۔ دوسرے سے اختصار کی تائید اور اپنی طرف سے یہ طول! کیوں جناب اس نسخہ کی کیا قیمت ہوگی؟۔

شاگرد۔ جو دواخانہ نکڑ پر ہے وہاں چار آنہ میں بندھ جائے گا۔ اور جگہ زیادہ

دام لیں گے۔

مریض۔ تو لگے ہاتھوں یہ بھی بتا دیجئے کہ فائدہ کتنے دنوں میں ہوگا؟

شاگرد۔ یہی کوئی تین چار برس میں۔

مریض۔ بجا ہے۔ ذرا مجھے قلم دوات کاغذ عنایت ہو۔

حکیم صاحب:۔ کیوں خیریت ہے؟

شاگرد۔ شاید کوئی ناگفتہ بہ حال لکھنا ہوگا۔

مریض:۔ (حساب لگاتا ہے) چار آنہ روز۔ سال تین سو ساٹھ دن کا۔ مان لیجئے چار دن کا ایک روپیہ ہوگا۔ تین سو ساٹھ کو چار سے تقسیم کیا نہیں یہ کیوں کروں۔ پھر چار سے ضرب دینا ہوگا تین سو ساٹھ روپے ہوگئے (حکیم صاحب سے) حضرت! بقراطِ زماں! میری جاں بخشی کیجئے میں ایسے علاج سے باز آیا۔ تین سو ساٹھ کس کے گھر سے لاؤں گا۔

حکیم صاحب:۔ لاحول ولاقوۃ انہوں نے مزاحاً چار برس کہہ دیئے۔ آپ نے باور کرلیا۔ آپ چندے اس نسخے کو استعمال کیجئے۔

مریض:۔ جی ایسے چندے میں نے بہت دیکھے ہیں۔ میری ساری عمر آپ ہی حضرات کے علاج میں گذری ہے (اٹھ کر) بس اب اجازت ہو۔

(چلا جاتا ہے)

شاگرد۔ خس کم جہاں پاک (پردہ گرتا ہے)۔

دوسرا منظر

(بنگالی ڈاکٹر کا مطب۔ میز کرسی لگی ہے۔ صدر میں ڈاکٹر صاحب بیٹھے ہیں

اور ان کے قریب ہمارے مریض)۔

ڈاکٹر:۔ ویل۔ مائی ڈیر سر، واٹ کین آئی ڈو فار یو۔؟

مریض:۔ آپ تو نسخہ بتانے لگے، پہلے حال تو سن لیجیے۔

ڈاکٹر:۔ اوہو! آپ انگلش نہیں جانتا۔ آپ کو کیا ہو گیا؟

مریض:۔ مجھے کچھ نہیں ہوا۔ آپ اپنے دماغ کا علاج کیجیے۔

ڈاکٹر:۔ آپ کو کیا مرض؟

مریض۔ پہلے یہ بتائیے کہ آپ بھی حکیم صاحب کی طرح اختصار پسند طول نویس

ہیں؟

ڈاکٹر:۔ کیا کہا۔ ہم نہیں سمجھا؟

مریض:۔ پورا حال کہوں یا تار کی زبان میں گفتگو کروں۔

ڈاکٹر۔ بہوت بات نہیں کام کا بات۔

مریض:۔ بہت اچھا کام کی بات سنئے۔ معدہ خراب، سینے میں جلن، پیٹ

میں ریاح، قبض۔

ڈاکٹر:۔ درد ہوتی ہے؟

مریض:- ہوتی نہیں۔ ہوتا ہے (پیٹ پر ہاتھ رکھ کر)

اک ہوک یہاں پر اٹھتی ہے اک درد یہاں پر ہوتا ہے
؎ ہم رات کو اٹھ کر روتے ہیں جب سارا عالم سوتا ہے

ڈاکٹر:- آپ روئے نہیں اچھا ہو جائے گا۔ آپ اسٹول اگزامن کرالیا۔

مریض:- کیا کہا؟ اسٹول کیا؟

ڈاکٹر:- فجلہ! فجلہ!

مریض- ہاں فضلہ پھر؟

ڈاکٹر:- سو ایئنہ کرایا؟

مریض:- فضلہ کا بھی معائنہ ہوتا ہے؟ یہ آج ہی سنا اس چودھویں صدی میں جو کچھ نہ ہو کم ہے۔ جی نہیں میں نے معائنہ نہیں کرایا اور کراؤں کیسے مجھے تو ہمیشہ قبض رہتا ہے۔

ڈاکٹر:- ہم آپ کا پیٹ دیکھے گا۔ آپ چل کر میج پر لیٹ جائے گا۔

مریض:- پہلے یہ بتا دیجیے کہ نسخے کی کیا قیمت ہوگی؟

ڈاکٹر:- پہلے ہم دیکھ لیں پھر بتا سکتا۔

مریض:- جی نہیں، پہلے آپ بتا دیجیے، پھر ہم دکھا سکتا۔

ڈاکٹر:- آپ کیا آدمی ہے، پھر آپ کا کھوشی۔ دوائی کا ایمٹ دو روپیہ روج

مریض- فائدہ کتنے دنوں میں ہوگا۔

ڈاکٹر:- او! معدے کے مرج کو فائدہ بہوت دنوں میں ہوتا ہے۔

مریض:- آخر؟

ڈاکٹر:- کم سے کم چھ مہینا۔

مریض:- چھ کا صفر ہی صفر چھ تیئے اٹھارہ۔ ایک سو اسی! اٹھارہ دونی چھتیس صفر، تین سو ساٹھ لیجیے۔ وہی تین سو ساٹھ ہو گئے۔

ڈاکٹر:- او! آپ کو دورہ ہوا، ہم دوائی دینا۔

مریض:- جی مجھے دورہ وورہ کچھ نہیں ہوا، ہاں قلب پر ضرور صدمہ پہنچا ہے۔ کیوں حضرت اس سے مہنگا علاج کوئی اور نہیں ہے۔ یہ تو آپ نے بہت سستا نسخہ بتا دیا۔

ڈاکٹر:- اور آپ مہنگا علاج چاہتا۔ آپ جرمنی چلا جائے واٹرنگ پلیس۔

مریض:- کیسی پلیس؟

ڈاکٹر:- چشمے کا جگہ۔ گندھک کے چشمے کا۔

مریض:- تو اپنے گھر کے کنوئیں کا پانی کیوں نہ پئیں۔ رنگ بالکل گندھک کا ہے۔ بو اور مزہ اس سے بھی بڑھ کر، کیوں صاحب اس گندھک کے علاج میں کتنا خرچ ہو گا؟

ڈاکٹر:- ہم کو ٹھیک مالُم نہیں، دس ہجار، بیس ہجار۔

مریض:- دس ہزار، بیس ہزار، تیس ہزار، چالیس ہزار، آپ کا کیا جاتا ہے۔

پہاڑا پڑھتے چلے جائیے۔ حضرت میں نے توبہ کی، اب علاج کا نام نہیں
لوں گا۔ فیس تو آپ کی نظر کر ہی چکا۔ اب تک ہضم بھی ہو گئی ہوگی،
اب رخصت چاہتا ہوں۔

ڈاکٹر:۔ آپ کھپا ہو گیا ہمارا کون کسور!۔

مریض:۔ جی نہیں آپ کا کوئی قصور نہیں، میری تقدیر کا قصور ہے، نہ یہ
کمبخت مرض ہوتا، نہ یہ پہاڑے سننے پڑتے۔ بہت اچھا۔ آداب عرض ہے

ڈاکٹر:۔ آداب عرض (I did not Know he was stark mad)

تیسرا منظر

(مریض اپنے دوست بابوجی کے گھر جاتا ہے)

مریض:۔ آداب عرض ہے بابوجی۔

بابوصاحب:۔ آیئے آیئے! مدت کے بعد زیارت نصیب ہوئی، آپ تو عید کا چاند ہو گئے۔

مریض:۔ جی عید کا چاند نہیں، چاندماری کا نشانہ بن گیا ہوں۔ جو حکیم ہے جو ڈاکٹر ہے مجھی پہ فیر کرتا ہے اور کوئی فیر تین سو ساٹھ سے کم کا نہیں ہوتا۔

بابوصاحب۔ اچھا تو وہ آپ کے ہاضمہ کی شکایت اب تک چلی جارہی ہے۔

مریض:۔ اب تک چلی جارہی ہے۔ یہ نہیں کہتے دن دونی رات چوگنی ہوتی جاتی ہے ؎

مریضِ معدہ پر لعنت خدا کی
مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

بابوصاحب:۔ حضرت جب تک آپ حکیموں، ڈاکٹروں کے پھیر میں پڑے رہیں گے یہ سلسلہ بڑھتا ہی چلا جائے گا۔ میں بھی مدتوں یہ پاپڑ بیل چکا ہوں، آپ میرے کہنے پر چلیں تو مہینہ بھر میں

اچھے ہو جائیں۔

مریض:۔ کیا کوئی عطائی نسخہ ہاتھ لگ گیا ہے؟ بتائیے خدا کے لئے جلدی بتایئے

مگر یہ بھی وہی تین سو ساٹھ کا نسخہ!

بابو صاحب:۔ عطائی نسخہ! توبہ کیجئے! کیا آپ نے مجھے ایسا جاہل سمجھا ہے اور

یہ تین سو ساٹھ کی آپ نے کیا رٹ لگائی ہے۔

مریض:۔ اجی جو بتاتا ہے ایسا ہی علاج بتاتا ہے جس میں تین سو ساٹھ روپے

خرچ ہوں اور وہ بنگالی ڈاکٹر تو دس ہزار کا پہاڑہ پڑھ رہا تھا۔

بابو صاحب:۔ جی نہیں جو تدبیر میں آپ کو بتاؤں گا اس میں سینکڑوں

ہزاروں کا کیا ذکر ہے، دھیلے کا بھی خرچ نہیں بلکہ آپ کو کچھ بچت

ہو جائے گی۔

مریض:۔ ارے بھائی تو کوئی تعویذ ہے، گنڈا ہے، کیا ہے؟ تم تو پہیلیاں

بجھواتے ہو۔

بابو صاحب۔ تعویذ، گنڈے کو میرا دور سے سلام ہے۔ میں آپ کو خالص

سائنٹیفک علاج بتاتا ہوں۔

مریض:۔ یہ سائن ٹفی کون بزرگ ہیں، کہاں رہتے ہیں؟

بابو صاحب:۔ سائنٹیفک یعنی سائنس کے مطابق عملی۔۔

مریض۔ اور حکیم ڈاکٹر علم سے نہیں تو کیا جہل سے علاج کرتے ہیں! آخر وہ آپ

کا علمی، اخلاقی، معاشرتی نسخہ ہے کیا؟ کچھ کہیئے تو سہی۔

بابو صاحب:۔ آپ کوئی ورزش کرتے ہیں؟

مریض:۔ ورزش! بہت خوب! اب معلوم ہوا آپ کا علمی علاج۔ یہاں اٹھنا بیٹھنا دو بھر ہے اور آپ ورزش لئے پھرتے ہیں۔

بابو صاحب:۔ اٹھنا بیٹھنا اسی لئے دو بھر ہے کہ آپ نے اپنے جسم کو کاہل بنا رکھا ہے۔ زہریلا مادہ آپ کی رگوں میں پھیل گیا ہے اور اسی نے بدن کو بوجھل کر دیا ہے۔

مریض:۔ آپ خود زہر اگل رہے ہیں، غضب خدا کا میں کاہل ہوں دن بھر دفتر میں چکی پیستا ہوں، صبح، شام بچوں کو پڑھاتا ہوں، رات کو گھر کا حساب لکھتا ہوں اسی کو کاہلی کہتے ہیں۔

بابو صاحب:۔ بھائی صاحب آپ بہت کام کرتے ہیں مگر یہ سب دماغی کام ہے۔ جسم آپ کا معطل رہتا ہے۔ پھر ہاضمہ ٹھیک ہو تو کیسے ہو؟ اور کچھ نہیں تو صبح و شام دو چار میل ٹہلا کیجیے۔

مریض۔ اور لیجیے، اب آپ ٹہلانے لگے۔ یہاں مرنے کی بھی فرصت نہیں ٹہلنے کا وقت کہاں سے آئے۔

بابو صاحب۔ دوڑا کیجیے اس میں کم وقت لگے گا۔

مریض۔ اے سبحان اللہ، میں چالیس برس کا بوڑھا، چھ بچوں کا باپ، ہرن

کی طرح چوکڑیاں بھرتا پھروں، کوئی دیکھے تو سمجھے پاگل ہو گیا ہے۔

بابو صاحب۔ بندۂ خدا تم گھر پر ہی ورزش کر لیا کرو۔ مُلر کی اکسر سائز صرف پندرہ منٹ کا کام ہے۔

مریض:۔ کس کی کیا؟ یہ تم کیا بک رہے ہو۔

بابو صاحب:۔ مُلر ایک شخص کا نام ہے۔ اس نے ورزش کا سائنٹیفک طریقہ ایجاد کیا ہے۔ میں آپ کو ابھی سکھا دوں گا۔

مریض:۔ پھر وہی سائن ٹفی، آخر اس مولر کی ورزشس میں کون سا سرخاب کا پر لگا ہے، جوانی میں ہم دس دس ڈنڑ اور بیس بیس بیٹھکیں روز لگاتے تھے اس پر بھی معدہ چوپٹ ہو گیا۔

بابو صاحب:۔ جوانی کی بیٹھکوں سے بڑھاپے کا کھانا کیسے ہضم ہو سکتا ہے اور ڈنڑ اور بیٹھک کوئی سائنٹیفک ورزش بھی نہیں۔ اچھا خیر ورزش کو اس وقت جانے دیجئے۔

مریض۔ اس وقت جانے دیجئے نہیں بلکہ ہمیشہ کے لئے جہنم میں ڈالئے۔ یہ آپ کے سائن ٹفی اور مولر ہی کو مبارک رہے۔

بابو صاحب:۔ اب یہ بتایئے آپ کھاتے کیا ہیں۔

مریض:۔ کھاتا کیا ہوں خاک پتھر

بابو صاحب۔ آخر کچھ آپ کی غذا بھی ہے؟۔

مریض ۔ وہی جو بھلے آدمیوں کی ہوتی ہے، دال، روٹی، گوشت۔

بابو صاحب :۔ یہی تو خرابی کی جڑ ہے ۔

مریض :۔ پھر کیا مولر کا سر کھاؤں؟

بابو صاحب :۔ آپ کی غذا میں پروٹین کے سوا کچھ نہیں، کاربوہائیڈریٹ اور وٹامن کی کمی ہے۔

مریض ۔ یا الٰہی یہ کس انگریز کی ارواح سے سابقہ پڑا ہے۔ کھانے کا ذکر ہے اور خدا جانے کیا کیا نام لے رہا ہے، جنھیں سن کر جی متلاتا ہے۔ یہ کاربوٹ کیا بلا ہے۔ اور وائٹیم کس چڑیا کا نام ہے؟

بابو صاحب :۔ مطلب یہ ہے کہ غذا میں صرف غلّہ اور گوشت کے اجزا ہوں تو جسم کی پوری طرح پرورش نہیں ہوتی۔ اور پھر بدہضمی اور قبض کی مصیبت الگ۔ آپ کو دال گوشت کے علاوہ ساگ، ترکاری دودھ دہی کھانا چاہیئے۔

مریض :۔ مجھے کوئی بیل بکری سمجھا ہے یا دودھ پیتا بچہ مقرر کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ گھاس کھایا کرو اور دودھ پیا کرو، دودھ کے نو میں نام سے کانپتا ہوں، چھٹی کا دودھ یاد آجاتا ہے اور دہی کی ایک کہی، نزلے کا گھر کھانسی کا اڈا۔

بابو صاحب :۔ تو جناب آپ کا علاج لقمان کے پاس بھی نہیں ہے۔ آپ

کے آگے سائنٹیفک غذا کا ذکر کرنا بھینس کے آگے بین بجانا ہے۔

مریض :- اور کچھ نہیں چلی تو گالیوں پر اتر آئے بھینس ہیں ہوں یا تم اور تمھاری سائنٹفی جو گھاس کھاتا ہے اور دودھ پیتا ہے میں علاج کے پیچھے انسانیت نہیں کھونے کا۔ اس بک بک جھک جھک سے سر میں درد ہونے لگا اور پیٹ میں الگ ہائے رے ہائے رے۔ کسی کو کیا معلوم کہ مجھ پر کیا گذرتی ہے۔ حکیم ڈاکٹر تین سو ساٹھ کا نسخہ بتاتا ہے دوست احباب منطق چھانٹتے ہیں اور ہنسی اڑاتے ہیں ؎

افسوس کوئی اپنا محرم نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

St 617 / [illegible] / 13/8/64	13/9/66		
523 / 9/5/65			